بنیادی حقوق

محمد صلاح الدین
ایڈیٹر روزنامہ 'جسارت'

اِدارہ ترجُمان القُرآن ○ اچھرہ۔ لاہور

بنیادی حقوق

محمد صلاح الدین
ایڈیٹر روزنامہ 'جسارت'

اِدارہ ترجمان القرآن ○ اچھرہ۔ لاہور

طابع .... سید حسین فاروق مودودی

ناشر .... ادارہ "ترجمان القرآن" لاہور

باہتمام .... شعبہ تحقیق، مائیکاس ایسوسی ایٹس لمیٹڈ کراچی

مطبع .... وفاق پرنٹنگ پریس لاہور

کتابت .... غضنفر علی

طبع اوّل .... دسمبر ۱۹۷۷ء ..... تین ہزار

طبع دوم .... جنوری ۱۹۷۸ء ..... پانچ ہزار

قیمت .... | ڈیلکس تنتالیس روپے
| پیپر بیک بیس روپے

عرضِ ناشر

آج تک ہمیں عصرِ حاضر کے نامور مصنّف علمی و ادبی دُنیا کی ممتاز شخصیت اور عالمِ اسلام کے عظیم مفکّر جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی شہرۂ آفاق تصانیف چھاپنے کا شرف و اعزاز حاصل رہا ہے۔ ہم نے ہمیشہ مولانا محترم کے مایۂ ناز علمی و ادبی جواہر پاروں کو دلکش اور جاذبِ نظر بنانے کے لیے موجودہ فنِ طباعت کے عمدہ ترین تکنیکی معیار کو استعمال کرنے کی بھرپُور کوشش کی ہے۔ اور اپنے قارئین کے پاکیزہ ذوق کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

قارئین کرام کی طرف سے ہمیشہ ہماری پُرخلوص کوشش پر اطمینان کا اظہار ہُوا ہے جس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

قارئین کرام کے تعاون، حوصلہ افزائی اور دُعائے خیر ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ کارِ عظیم رَواں دَواں ہے۔ اپنے قارئین کی علمی پیاس کو محسوس کرتے ہُوئے ہم نے ملّتِ اسلامیہ کے کچھ دیگر بلند پایہ مصنّفین کی مفید تحریروں کو روشناس کرانے کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے جناب الطاف گوہر صاحب کی کتاب (Translations from the Quran) کے تین ایڈیشن چھاپے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اب ہم وقت کے ایک اور ممتاز اہلِ قلم روزنامہ "جسارت" کے نڈر اور بے باک مدیر جناب محمّد صلاح الدّین صاحب کی کتاب "بنیادی حقوق" شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ماضی میں اس موضوع پر کئی حضرات نے طبع آزمائی کی ہے مگر مصنّف موصوف نے جس عرق ریزی، جگر سوزی اور محنت شاقہ سے اس موضوع کو نبایا ہے یہ انہی کا حِصّہ ہے۔ علمی دُنیا میں یہ ایک قیمتی اضافہ ہے۔ یہ مصنّف موصوف کے دَورِ اسیری میں مرتعش جذبات کا تحقیقی تحفہ ہے اور ہمیں یقینِ واثق ہے کہ ہمارے قارئین انشاءاللہ اسے بہت مفید پائیں گے۔

زیرِ نظر کتاب قدرے تاخیر سے شائع ہوئی ہے جس کیلئے ہم انتہائی معذرت خواہ ہیں۔

حسین فاروق مودودی ادارہ ترجمان القرآن

کچھ مصنّف کے بارے میں

سن پیدائش : ۱۹۳۵ء۔
جائے پیدائش : میرٹھ (ہندوستان)۔
ابتدائی تعلیم : میرٹھ، پیلی بھیت اور احمد آباد۔
نقل وطن : ۱۹۴۸ء میں احمد آباد سے ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی۔
پاکستان میں ابتدائی دس سال : محنت مزدوری اور تعلیم کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہا۔ موٹر مکینک، ڈینٹر، ویلڈر، ٹرنر اور سینیٹری فٹر کا کام کیا۔ سائیکل کی دوکان اور گھڑی سازی کی۔ اور اس کے ساتھ ہی ۱۹۵۵ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔
اعلیٰ تعلیم : ۱۹۵۸ء میں بیک وقت تین امتحانات دیتے۔ سی ٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ انٹر اور ادیب عالم کے امتحانات سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیے۔
۱۹۶۰ء میں بی اے اور ۱۹۶۲ء میں بی ایڈ کیا اور ۱۹۶۷ء میں جامعہ کراچی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا۔
تدریس : ۱۹۵۷ء میں گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کیماڑی (کراچی) سے تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت معلم کام کیا۔
صحافت کے میدانِ عمل میں : ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء کے اوائل تک "حریت" سے وابستگی جہاں سب ایڈیٹر سے نائٹ شفٹ انچارج تک کی ذمہ داریاں پوری کیں۔ اسی عرصے میں پانچ ماہ کے ایک مختصر سے وقفے کے لیے "جنگ" میں بھی بحیثیت سب ایڈیٹر کام کیا۔
۱۹۷۰ء میں بحیثیت نیوز ایڈیٹر "جسارت" ملتان میں تقرر ہوا اور وہاں سے اسی منصب پر "جسارت" کراچی میں تبادلہ ہوا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سے تاحال ایڈیٹر "جسارت"۔
جیل کی زندگی : مارچ ۱۹۷۳ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک سات مرتبہ جیل بھجوایا گیا۔ مجموعی طور پر سوا دو سال جیل میں گزارے۔ جرم اظہار کی جسارت تھا۔
تصنیف و تالیف : ۱۹۷۴ء میں "جسارت" کی جبری بندش کے دوران فریضہ حج کیا اور واپسی پر اسلام میں "بنیادی حقوق" کے موضوع پر تحقیق کا کام کیا۔

(ادارہ)

فہرستِ مضامین

پیش لفظ	۱۳
حرف آغاز	۱۵
بنیادی انسانی حقوق کا مفہوم	۲۱
بنیادی حقوق کی تاریخ	۳۷
مغرب کا تصورِ حقوق	[illegible]
اشتراکی تصورِ حقوق	۵۷
بنیادی حقوق کے تحفظات	۶۵
منشورِ انسانی حقوق	۸۷
ناکامی کے اسباب	۹۷
بنیادی حقوق کا اسلامی تصور	۱۲۳
(ا) تاریخی پہلو	۱۲۳
(ب) قانونی پہلو	۱۳۰
(ج) اخلاقی پہلو	۱۵۳
(د) تمام حقوق اللہ کے ہیں	۱۷۳
اسلام میں بنیادی حقوق کے تحفظات	۱۸۷
(ا) تطہیرِ تصورِ حاکمیت	۱۸۹
(۱) نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ	۱۸۹
(۲) تصورِ امانت	۱۹۲

(۳) فرض کی اولیت ۱۹۶
(۴) نصب العین کی ہم آہنگی ۱۹۸
(۵) فرد کا احترام ۲۰۰
(ب) تطہیر قیادت ۲۰۳
(۱) تقویٰ ۲۰۵
(۲) اہلیت ۲۰۶
(۳) عدل ۲۰۶
(۴) حکمت و تدبر ۲۰۷
(ج) تحدید اختیارات ۲۰۹
(۱) نیابتی اقتدار ۲۰۹
(۲) دائمی دستور ۲۱۰
(۳) دائمی نمونہ حاکیت ۲۱۰
(۴) عدلیہ کی بالادستی ۲۱۲
(۵) حدود اطاعت ۲۱۳
(۶) پابندیٔ مشاورت ۲۱۶
(۷) پابندیٔ مقاصد و ترجیحات ۲۱۹
(د) احتساب امارات ۲۲۱
(۱) احتساب آخرت ۲۲۲
(۲) احتساب بذریعہ عدالت ۲۲۳
(۳) احتساب بذریعہ شوریٰ ۲۲۵
(۴) احتساب بذریعہ عوام ۲۲۶

کیا اسلامی نظام صرف ۳۰ سال قائم رہا	۲۲۸
اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق	۲۴۱
(۱) تحفظ جان	۲۴۱
(۲) تحفظِ ملکیت	۲۴۷
(۳) تحفظ آبرو	۲۴۹
(۴) نجی زندگی کا تحفظ	۲۵۴
(۵) شخصی آزادی کا تحفظ	۲۵۸
(۶) عمل غیر سے برأت	۲۶۵
(۷) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق	۲۶۶
(۸) آزادیٔ اظہار رائے	۲۶۸
(۹) آزادیٔ ضمیر و اعتقاد	۲۷۷
(۱۰) حق مساوات	۲۸۱
(۱۱) حصولِ انصاف کا حق	۲۸۷
(۱۲) معاشی تحفظ کا حق	۲۹۴
(۱۳) معصیت سے اجتناب کا حق	۳۰۸
(۱۴) آزادیٔ تنظیم و اجتماع	۳۰۹
(۱۵) سیاسی زندگی میں شرکت کا حق	۳۱۰
(۱۶) آزادی نقل و حرکت و سکونت	۳۱۱
(۱۷) حق اجرت و معاوضہ	۳۱۳
مسلمانوں کے خصوصی حقوق	۳۱۶
ذمیوں کے خصوصی حقوق	۳۱۹
ضمیمہ خطبہ حجۃ الوداع	۳۲۹

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (النساء۔۱۷۴۔۱۷۵)

لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔

11

اللہ کے نام

جس نے مجھے یہ کتاب لکھنے کی توفیق بخشی،

اور

اللہ کے اُن کروڑوں مظلوم و مقہور اور محروم حقوق بندوں کے لیے
جو آمرانہ نظام کے جبر و استبداد سے نجات پانے اور آبرو مندانہ
زندگی بسر کرنے کی راہ تلاش کر رہے ہیں۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (الانعام ۷۹)

میں نے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جنابؒ صلاحُ الدّین صاحبؒ ، روزنامہ "جسارت" کراچی کے ایڈیٹر نے اپنی اِس کتاب میں بنیادی حقوق کے مسئلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے اِس قدر جامع، مفصّل اور محققانہ بحث کی ہے کہ غالباً اِس سے پہلے کسی نے بھی ایسی بحث نہیں کی۔ اِس کا مطالعہ اِس مسئلے کو سمجھنے کے لیے اِنشاءاللہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اِس کا ترجمہ انگریزی اور عربی زبان میں بھی شائع کیا جائے۔

فاضل مُصنّف اِس سے پہلے بھی اپنے بنیادی حقوق سے محروم کیے جاتے رہے ہیں اور اِن سطور کی تحریر کے وقت بھی وہ جُرم بے گُناہی میں "عوامی قیادت" کے اسیر بنے ہُوتے ہیں۔ اِس موقع پر اِن کی اِس کتاب کی اشاعت علمی لحاظ سے مفید ہونے کے علاوہ ایک سامانِ عبرت بھی ہے۔ جو شخص بھی ایک طرف اِس کتاب کو دیکھے گا اور دوسری طرف یہ دیکھے گا کہ اِس کا مُصنّف اِس وقت جیل میں اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہے، تو وہ خود محسوس کرلے گا کہ اسلام کے اصُول عدل اور دُنیا بھر کے مسلّمہ اصُول انصاف کیا ہیں اور ہمارے ملک میں ان کے برعکس کیا ظُلم کیا جارہا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی

لاہور،
۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

"یہ پیش لفظ اس وقت لکھا گیا جب کتاب کے مصنّف جیل میں تھے۔"

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۙ (الانعام۔۱۶۲)

کہو، میری نماز میرے تمام مراسم عبودیت میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

حرفِ آغاز

روسو نے ۱۷۶۵ء میں کہا تھا:

"انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔"

تقریباً دو سو سال بعد ۱۹۴۷ء میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر میکلوین نے اپنے عہد کے انسان کی زبوں حالی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"میرا خیال ہے کہ مدوّن تاریخ کے کسی بھی عہد میں فرد کو ریاست سے کبھی اتنا سنگین خطرہ لاحق نہیں ہوا، عدلیہ کو انتظامیہ کے مقابلے میں کبھی اتنی بے بسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس خطرے کو محسوس کرنے اور اس کے تدارک کی تدابیر سوچنے کی اتنی شدید ضرورت پہلے کبھی نہیں پڑی جتنی آج ہے۔" [۱]

اور پھر چوتھائی صدی بعد ۱۹۷۰ء میں انسان کے بنیادی حقوق کو لاحق خطرات کا جائزہ لیتے ہوئے رابرٹ ڈیوی (Robert Dewey) اپنی تشویش کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تقریباً دو سو سال قبل انقلابی ہنگامہ آرائیوں کے موقع پر جو آج کی ہنگامہ آرائیوں سے مختلف نہ تھیں، تھامس پین (Thomas Paine) نے اپنے ہم عصر لوگوں کے دیدہ کو دکو ایک تلخ حقیقت سے آشنا کیا۔ اس نے کہا تھا:

"آزادی دنیا کے گرد بھاگتی پھر رہی ہے اس مفرور کو پکڑو اور انسانیت کے لیے بروقت ایک پناہ گاہ تیار کرو آج ہزاروں چکنی چپڑی باتوں، ہزاروں اعلانات اور منشوروں کے بعد بھی آزادی ہنوز عنقا ہے۔ امریکہ ہو یا روس پرتگال ہو یا انگولا، انگلستان ہو یا روڈیشیا، بوسٹن ہو یا مسی سپی اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔" [۲]

انسان کی محرومیوں اور اس کی درماندگی کے اس طویل تاریخی پس منظر میں جب ہم بنیادی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی سالانہ رپورٹوں، اخبارات و رسائل کی فراہم کردہ معلومات، دُنیا کے مختلف ممالک میں رونما ہونے والے واقعات اور اس موضوع پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ تلخ اور ناقابلِ تردید حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ انقلابِ فرانس، برطانیہ میں مطلق العنان بادشاہت کے خاتمے اور پارلیمنٹ کی بالادستی، امریکہ کے اعلانِ آزادی، امریکی دستور میں بنیادی حقوق کی شمولیت، یورپ اور امریکہ میں بنیادی حقوق کی منظّم تحریکات، روس کے سُرخ انقلاب اور اقوام متحدہ کے منشورِ انسانی حقوق کے باوجود آج کا انسان بھی، روسو کے عہد کے انسان کی طرح، ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ۲۰ سال قبل پروفیسر میکلوین نے فرد کے لیے ریاست سے جو خطرہ محسوس کیا تھا وہ نہ صرف مزید سنگین صورت اختیار کر گیا ہے بلکہ ہر گزرتا ہوا دن اس کی شدت میں مسلسل اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ آج دنیا کی دو تہائی سے زائد آبادی اشتراکیت کے کلیت پسندانہ (Totalitarian) نظام کی گرفت میں ہے جہاں فرد کی حیثیت بیجان ہتھوڑے اور درانتی کی طرح ایک پیداواری عامل سے زیادہ نہیں۔ اس سے آزادانہ غور و فکر، تقریر و تحریر، اجتماع و تنظیم اور مسلک و عقیدے کی تمام آزادیاں چھین لی گئی ہیں۔ اب وہ ریاست کا ایک تنخواہ دار نوکر ہے اور اس کے حقوق کی حفاظت کے لیے مقننہ اور عدلیہ کے نام سے جو ادارے وجود میں لائے گئے تھے وہ اس کی آقا ریاست کے حکمرانوں کے مکمل کنٹرول میں جا چکے ہیں۔ پریس، سیاسی پلیٹ فارم، ابلاغ عامہ کے ذرائع۔ ادیب شاعر اور دانشور سب اس کی مٹھی میں ہیں۔ فرد "پارٹی لائن" کی مضبوط زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس سے انحراف کا خیال بھی اس کے وجود کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ غرض فرد کے لیے اس معاشرے میں کوئی جائے پناہ نہیں۔

ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی وسیع آبادی پر مشتمل ممالک کی حالت اور بھی روح فرسا ہے۔ ان کا المیہ اس لحاظ سے اور بھی جگر گداز ہے کہ ان کے عوام نے نوآبادیاتی دور کی محکومی سے نجات

پانے اور غیر ملکی آقاؤں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اُتار پھینکنے کے لیے جان و مال کی عظیم قربانیاں دے کر آزادی کی نعمت حاصل کی تھی لیکن آزادی کا سورج ابھی پوری آب و تاب سے چمکنے نہ پایا تھا کہ ان کے سروں پر آمریت کا عفریت منڈلانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ایک کر کے ان کی تمام شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کو نگلتا چلا گیا۔ سرخ و سفید سامراج اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ ان پر پھر مسلط ہو گیا اور اس نے اپنے مفادات کی حفاظت و تکمیل کے لیے مردان آہن کے ہاتھ اتنے مضبوط کر ڈالے کہ ان کی آہنی ضرب سے نوخیز جمہوری ادارے فنا کے گھاٹ اُتر گئے۔ آئین بازیچۂ اطفال بن گیا، قانون کی حکمرانی کا جنازہ نکل گیا، مقننہ، عدلیہ، پریس سیاسی سرگرمیاں، ذرائع ابلاغ سب انتظامیہ کی منشاء کے تابع ہو گئے۔ سوشلزم کا فلسفہ چونکہ حکمرانوں کو لامحدود اختیارات عطا کر کے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیتا ہے اس لیے وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام نوآزاد ممالک کے برسر اقتدار اور حریص اقتدار گروہ کا محبوب نعرہ بن گیا۔

وہ روٹی، کپڑے اور مکان کی فراہمی کے نعروں اور بیرونی جارحیت سے نمٹنے، ملک دشمن عناصر کا سر کچلنے، بیرونی ایجنٹوں کی سازشوں کو ناکام بنانے اور سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور عوام دشمن عناصر کا صفایا کرنے کے نام پر ایک طرف اپنے اختیارات کا حجم بڑھاتے رہے اور دوسری طرف مسلح پولیس، مختلف فورسز، جاسوسی کے اداروں، ایذا رسانی کے آلات و انتظامات اور اپنی پروپیگنڈہ مشینری کو وسعت دیتے گئے۔ وہ بنیادی حقوق کی محافظ مقننہ، عدلیہ، سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کا زور و اثر توڑتے اور آئین و قانون کے ڈھانچے کو زیر کرتے چلے گئے۔ اور ان ملکوں کے بدقسمت عوام مارشل لاء، ہنگامی حالت کے نفاذ، امتناعی قوانین اور آئے دن منسوخ، معطل یا نت نئی ترمیمات کی زد میں آنے والے دستور کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ لیے گئے کہ بنیادی حقوق کی اصطلاح ان کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی۔ ان ملکوں میں یہ ڈرامہ کردار، پلاٹ مناظر اور مکالمات کی گہری مماثلت کے ساتھ دھرایا جاتا رہا ہے اور ابھی تک اس کا ڈراپ سین نہیں ہو سکا۔

برطانیہ، امریکہ اور فرانس جیسے چند مغربی ممالک کی محدود انسانی آبادی بظاہر امن و عافیت

سے ہمکنار نظر آتی ہے لیکن بنیادی حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں اس کی حالت بھی قابل رشک نہیں ہے۔ ان ممالک کا دانشور طبقہ انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور مقننہ و عدلیہ کے اثرات میں مسلسل کمی پر گہری تشویش اور اضطراب کا اظہار کر رہا ہے۔ رابرٹ ڈیوی ان ملکوں کی صورت حال کے بارے میں کہتے ہیں :۔

"وہ آزادیاں اور حقوق جنہیں صنعتی معاشرے کے آغاز اور اس کے ابتدائی مراحل میں اہم عامل کی حیثیت حاصل تھی اور جنہوں نے اس معاشرے کو اعلیٰ مدارج تک پہنچانے میں مدد دی تھی اب اپنی روایتی معقولیت اور مفہوم سے محروم ہونے جا رہے ہیں۔ آزادی فکر و اظہار رائے اور ضمیر کی آزادی نے نظریات و تصورات پر نقد و جرح کے ذریعہ ان کے فروغ اور تحفظ میں بڑی مدد دی۔ مقصد یہ تھا کہ ایک فرسودہ مادی و فکری ثقافت کو ایک زیادہ تعمیری اور معقول تہذیب و ثقافت سے بدل دیا جائے۔ لیکن آزادانہ انفرادی تبادلہ خیال کے بجائے ان حقوق اور آزادیوں کے لیے جب ادارے وجود میں آ گئے تو ان حقوق اور آزادیوں کا وہی حشر ہوا جو اس پورے معاشرے کا ہوا جس کا یہ ایک جزو لاینفک بن گئے تھے۔ گویا نتائج نے مقصود پر پانی پھیر دیا۔" ۳

سی ڈی کرنگ اسی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"مغربی اور مشرقی ملکوں کا آخری تجزیہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اختلافات کچھ زیادہ بڑے نہیں آزاد اور غیر آزاد ملکوں کے گروپوں کی برائے نام تقسیم کی سائنسی بنیادوں پر تائید نہیں کی جا سکتی۔ دونوں نظاموں میں مختلف سطح پر لوکر شاہی کے پیدا کردہ الجھاؤ اور انتشار کو دیکھا جا سکتا ہے اور تمام تنظیموں اور اداروں پر کنٹرول کے لیے عام رائے دہندگان و صارفین اور فنی ماہرین کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ موجودہ صنعتی معاشرے اور جدید فلاحی ریاست میں زندگی کے

حالات نے یہ پرانا تصور پھر عام کر دیا ہے کہ آزادی ناممکن ہے۔ کسی بھی سیاسی نظام میں آزادی چیلنج ہوتے بغیر نہیں رہتی۔ اس کا وجود سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ ممالک میں یکساں خطرے سے دوچار ہے اور انفرادی سوشل گروپوں اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو اس کے دفاع کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے۔" ع ۴

یہی مصنف جدید ریاستوں کے شہریوں کی بے بسی کا نقشہ کھینچتے ہوتے کہتے ہیں:۔

"ایک شہری کو جو اعتدال پر مبنی جمہوری آزادیاں حاصل ہوتی ہیں وہ اکثر انہیں بھی پوری طرح استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ تعلیمی مواقع سب کے لیے یکساں نہیں ہوتے، سیاسی راتے غور و فکر کے بجائے جذباتی اور نظریاتی بگاڑ کے زیر اثر بنتی ہے۔ مفادات کو اکثر چھپاتے رکھا جاتا ہے۔ متبادل حل کی صاف صاف نشاندہی نہیں کی جاتی۔ اہم فیصلے اکثر بند کمروں میں کیے جاتے ہیں۔ معاشی تحفظ کے لیے ہر جگہ ہر شخص کو روزگار فراہم کرنے کی پالیسی اختیار کی جاتی ہے لیکن یہ مسئلہ رہتا وہاں کا وہیں ہے۔ ریاست، سیاسی پارٹیوں، معیشت اور تمام قابلِ ذکر تنظیموں پر نوکر شاہی کے روز افزوں تسلط کی وجہ سے عوام سرکاری معاملات میں عمل دخل سے محروم اور بے زبان و بے بس ہوتے جا رہے ہیں۔" ع ۵

بنیادی حقوق کے تحفظات کا ذکر کرتے ہوئے سی ڈی کرنگ ہمیں بتاتے ہیں کہ:۔

"آج کے دور میں بنیادی حقوق کی کوئی قطعی قانونی حیثیت نہیں رہی۔ جہاں تک خود نفس حقوق کا تعلق ہے ان میں سے اکثر کا فیصلہ متعلقہ ریاست ہی کرتی ہے۔ مثلاً کسی ملک میں شہریوں کی حیثیت کا مسئلہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کی دفعات مختلف ہیں۔ فیصلہ کن اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ بنیادی حقوق آئین میں کس طرح شامل کیے گئے ہیں۔ آیا وہ قومی اداروں کے اختیارات سے ماورا اور قطعاً ناقابلِ مداخلت ہیں یا ریاست (اور اس کے قانون ساز اداروں) کی مداخلت

کے لیے کھلے ہیں "؏

ڈاکٹر کینتھ۔ اے میگل (Kennith A. Magill) افراد پر مؤثر کنٹرول کے لحاظ سے اعتدال پسند جمہوریت اور کمیونسٹ نظام میں کوئی فرق نہیں پاتے۔ وہ کہتے ہیں :۔

"اعتدال پسند جمہوریت اور کمیونسٹ نظام دونوں میں کارکنوں کی محنت کی تنظیم و تشکیل پر کنٹرول ان کے اپنے ہاتھوں سے نکال کر سیاسی نوکر شاہی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے۔ ان دونوں نظاموں میں نام نہاد جمہوریت کا عمل صرف اسی طرح مکمل ہو سکتا ہے کہ پالیسی بنانے والوں کو مزید اختیارات دے دیئے جائیں تاکہ وہ جواباً پالیسی پر عمل درآمد کرنے والوں پر مزید کنٹرول حاصل کر سکیں۔" ؏

یہ معاملہ صرف ملازمین پر کنٹرول تک محدود نہیں ہے پورا معاشرہ اس کنٹرول کی زد میں ہے۔ مغرب نے انتظامیہ کو آئین و قانون کی حدود کا پابند رکھنے کے لیے احتساب و مشاورت اور قانون سازی کے بنیادی فرائض کی ادائیگی کے لیے مقننہ اور قانون کی حکمرانی کے لیے عدلیہ کے جو ادارے پروان چڑھائے تھے وہ انتظامیہ سے مغلوب ہو کر اپنا اثر و وزن کھوتے جا رہے ہیں۔ مثلاً اقتدارِ اعلیٰ مقننہ سے انتظامیہ کو منتقل ہو چکا ہے کیونکہ اسے اپنی مرضی کے فیصلوں پر مقننہ سے مہر توثیق ثبت کرا لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور اگر عدلیہ اس کا راستہ روکتی ہے تو وہ اس کے اختیارات میں کمی کر کے اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کی راہ ہموار کر لیتی ہے۔ سی ڈی کرنگ اس صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ہمارے متعدد روایتی ادارے سرکاری مشینری اور دوسرے انتظامی شعبوں پر جن کی اہمیت بتدریج بڑھ رہی ہے، جمہوری نوعیت کا مؤثر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ناکافی اور نا اہل ثابت ہوتے ہیں۔ اقتصادی اور ثقافتی شعبوں کے غیر سرکاری اداروں میں بھی رفتہ رفتہ نوکر شاہی کا عمل دخل بڑھ گیا ہے اور ان کا کنٹرول حصہ داروں اور اس کے ممبروں کے ہاتھوں سے نکال لیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ علم نفسیات کی ترقی کے نتیجے میں ذہنوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے نت نئے طریقوں اور ابلاغ عامہ کے ذرائع اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن کی فنّی قوتوں کو حکومتیں اور نجی ادارے اپنے اپنے مقاصد کے لیے یکساں استعمال کر رہے ہیں۔" ع۸

ڈاکٹر کینتھ میگل فرد کے بنیادی حقوق اور عوام کی حاکمیت کے نقطہ نظر سے دُنیا کے موجودہ سیاسی نظام پر چند لفظوں میں نہایت جامع تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اسٹالین کے پیروکاروں اور اعتدال پسند جمہوریت نوازوں نے عوام کی حاکمیت کی بنیادی روایت ختم کر کے جمہوریت کو سیاسی پارٹیوں کی حاکمیت بنا ڈالا۔ خواہ یہ حاکمیت کثیر الجماعتی نظام کی صورت میں ہو یا یک جماعتی نظام کی صورت میں۔ عوام کی جگہ پارٹی نے لے لی ہے اور پارٹی کا مطلب ہے وہ لوگ جنہیں پارٹی پر مؤثر کنٹرول حاصل ہے۔" ع۹

مغربی مفکرین کے یہ تبصرے اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتے ہیں کہ فرد کی عزت و توقیر اور اس کے مقام و احترام سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام سے سخت بیزار اور شدید کرب و اضطراب سے دوچار ہیں۔ مغرب میں آج یہ سوال سنجیدگی سے زیر بحث ہے کہ مطلق العنان بادشاہت کو تو منتخب پارلیمنٹ اور انتقال اختیارات کے ذریعہ قابو میں کر لیا گیا تھا مگر منتخب پارلیمنٹ کے بطن سے جو مطلق العنان انتظامیہ وجود میں آئی ہے اس پر کیسے قابو پایا جائے؟ ان اداروں کو، جو انتظامیہ پر مؤثر کنٹرول رکھنے کے لیے قائم کیے گئے تھے، خود انتظامیہ کے کنٹرول میں جانے اور اپنے وجود کا جواز کھو دینے سے کیسے روکا جائے۔ یہ ادارے یوں ہی سرنگوں ہوتے گئے تو فرد کو تحفظ کہاں سے فراہم ہو گا؟ ان اداروں کی بالادستی برقرار نہ رہ سکی تو جمہوریت کا پورا ڈھانچہ بیٹھ جائے گا اور تقسیم اختیارات کے ذریعہ تحدید و توازن (Check & Balance) کا جو نظام قائم کیا گیا تھا وہ سب درہم برہم ہو جائے گا آخر آمریت اور ارتکاز اختیارات

کے سوا اور کس چیز کا نام ہے؟ فرانسیسی مفکر برٹرینڈ ڈی جوڈینل (Bertrand D. Jovenel) ارتکازِ اختیارات کے سنگین خطرات کی نشاندہی کرتے ہوئے متنبہ کرتے ہیں کہ:

"کسی بھی قسم کا اختیار کسی ایک فرد کے ہاتھ میں مرتکز کر دینا انتہائی خطرناک ہے۔ اس بات کا قطعی امکان ہے کہ وہ اس اختیار کو عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے بجائے اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرے گا۔" ع۱۰

سوال یہ ہے کہ ارتکازِ اختیارات جس حد تک ہو چکا ہے اور جس تیزی سے مزید ہو رہا ہے اس کی روک تھام کا ذریعہ کیا ہے؟ جو ذرائع مقننہ، آزاد عدلیہ، پریس اور سیاسی جماعتوں کی صورت میں مہیا کیے گئے تھے وہ تو سب انتظامیہ کے زیرِ تسلط آ چکے ہیں ان اداروں کو اب حیاتِ نو بخشنے اور انتظامیہ کی گرفت سے نکالنے والی قوت کہاں سے فراہم ہو گی؟ اور وہ انتظامیہ جو اپنا دائرۂ عمل بڑھاتے بڑھاتے شہریوں کی خواب گاہ تک آ پہنچی ہے اور ضبطِ ولادت، جبری نس بندی، اور بچوں کی تعداد کے تعین جیسے مسائل میں بھی قانون سازی کا اختیار استعمال کرتے ہوئے ان کی خانگی زندگی کے انتہائی نجی گوشوں کو بھی اپنی گرفت میں لے چکی ہے، اسے اختیارات کے سابقہ محدود دائرے میں واپس کیسے دھکیلا جا سکے گا؟ یہی وہ پیچیدہ گتھی ہے جو دانشورانِ مغرب سے سلجھ رہی ہے نہ مدبرانِ مشرق سے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے سیاسی فکر کا ارتقاء اسی نکتہ پر آ کر رک گیا ہے کیونکہ اس کا زرخیز ذہن ہر شعبہ زندگی میں اپنی جولانیاں دکھا رہا ہے مگر کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال سے مغرب کے سیاسی مفکرین اس میدان میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ ان کی طرف سے سیاسی زندگی کی تنظیمِ نو سے متعلق کوئی نیا نظریہ سامنے نہیں آ سکا۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے جو سیاسی لٹریچر ہمیں مہیا کیا ہے وہ یا تو موجودہ نظام کی تائید کرنے والی کتابوں پر مشتمل ہے یا اس پر تنقید کرنے والی کتابوں پر۔ سیاسی زندگی میں تغیر کا کوئی نیا منصوبہ کوئی نیا خاکہ، کوئی نیا فلسفہ یا نظریہ وہ پیش نہیں کر سکے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ حاضر و موجود سے بیزار بھی ہیں۔

اس پریشان کن صورتِ حال کا تجزیہ جب ہم اسلام کی روشنی میں کرتے ہیں تو اس کا اصل اور بنیادی سبب صرف ایک ہی نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہر سیاسی تجربہ میں ایک غلطی کا مسلسل اعادہ کرتا رہا ہے۔ اس نے مقتدرِ اعلیٰ کی ہستی کو نہیں پہچانا۔ اور ربُّ السّمٰوٰت والارض کو اپنا حقیقی مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرنے کے بجائے اپنے ہی جیسے کسی ایک فرد یا چند افراد کو اقتدارِ اعلیٰ کے بلند ترین منصب پر فائز کر کے انسانوں کے درمیان حاکم و محکوم کے دو طبقے پیدا کر دیئے۔ اس نے بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مزہ چکھا تو یہ اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ کو منتقل کر دیا۔ پارلیمنٹ نے اپنے جوہر دکھائے تو اس نے دستور کی حدود و قیود میں جکڑ کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی مگر پارلیمنٹ اور انتظامیہ نے باہم گٹھ جوڑ کر کے اس دستور کے پرخچے اڑا دیئے اور جب راہ کا یہ پتھر ہٹ گیا یا سرک گیا تو انتظامیہ نے موقع پا کر مقننہ اور عدلیہ کو زیر کر کے اقتدارِ اعلیٰ پر خود قبضہ کر لیا۔ غرض یہ اقتدارِ اعلیٰ اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتا رہا مگر حاکم اور محکوم کا بنیادی رشتہ نہ ٹوٹ سکا۔

اسلام کے نزدیک واحد راہ نجات یہی ہے کہ انسان ہیر پھیر کے سارے راستے چھوڑ کر سیدھی طرح خالقِ کائنات کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرے اور انسان پر انسان کی حاکمیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ خدا کے مقرر کردہ حقوق کا احترام کرے اور بشمول سیاست زندگی کے تمام معاملات میں اسی کے احکام کی پابندی کرے۔ قرآن اس راہ نجات کو "صراطِ مستقیم" اور "سواء السبیل" کے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ اس سواء السبیل کی تشریح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے سنیئے:-

"اس لفظ کی معنویت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالمِ اصغر ہے جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات اور رجحانات ہیں۔ نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں۔ روح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے وہ بھی بیحد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدن و تہذیب کے نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی

ہیں۔ پھر دنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔

انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصۂ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو۔ اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔ اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رہے۔ اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں۔ اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے اور مادی اشیاء کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل، انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے جب انسان خود اپنا رہنما اور شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلا ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے اور اس کی اس راستے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوتی تھی بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو، مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا کیونکہ پھر وہی عمل رونما

ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضاء کے مطابق ایک خاص رُخ پر بہا لے جاتا ہے جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو خود انسان نے اپنی زندگی کے لیے بناتے ہیں خط منحنی کی شکل میں واقع ہیں۔ غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

ان بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس کی کامیابی و بامرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس کی طرف صرف خدا راہ نمائی کر سکتا ہے اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اس راہِ راست کی طرف انسان کی راہنمائی کریں۔

قرآن اسی راہ کو سواء السبیل اور صراطِ مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے جو اس پر چلا وہ یہاں راست رو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا وہ یہاں غلط بیں، غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے دوزخ میں جانا ہے کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ ہی کی طرف جاتے ہیں۔

موجودہ زمانے کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جا رہی ہے یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ "جدلی عمل" (Dialectical Process) انسانی زندگی کے ارتقا کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقا کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (Thesis) سے ایک رُخ پر بہالے جاتے پھر اس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (Antithesis) اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے اور پھر دونوں کے امتزاج (Synthesis) سے ارتقائے حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ دراصل یہ ارتقا کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقا میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سواء السبیل سے بہت دُور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں۔ اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کرتی ہے۔ جوں جوں سواء السبیل قریب آتی ہے ان متصادم دعووں

کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود

میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں۔ لیکن جب وہاں نہ سواء السبیل کے

نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے

والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتا بلکہ اپنے

زور میں اسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر

زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجے میں ایک

دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی

روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انھوں نے سواء السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا

کہ انسان کے لیے ارتقا کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خطِ منحنی پر ایک

انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔"

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۴۵۲)

انسان صدیوں سے ظن و گمان اور قیاسات و نظریات کی جن بھول بھلیوں میں

دھکے کھاتا پھر رہا ہے اگر وہ آج ان سے نکل کر سواء السبیل کی طرف پلٹ آئے اور اعلان

کر دے کہ

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

"فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں۔"

تو وہ ساری زنجیریں آنِ واحد میں کٹ سکتی ہیں جن میں خود اس کے ہم جنس انسانوں

نے اسے جکڑ رکھا ہے ــــ یہی اس کتاب کا پیغام ہے اور یہی بنیادی انسانی حقوق کی یقینی

اور قابلِ اعتماد ضمانت۔

میری انتہائی خوش قسمتی ہے اور میں اس پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے کہ

اس کتاب کی تیاری میں مجھے ملک کے ممتاز اہلِ علم کی معاونت و سرپرستی حاصل رہی۔ جناب

الطاف گوہر نہ صرف اس کے محرک بنے بلکہ انھوں نے مجھے اپنے ادارے مائیکاس ایسوسی ایٹس کے شعبہ تحقیق سے وابستہ کر کے مالی وسائل کی فراہمی کا بندوبست کیا۔ موضوع کی وسعت و اہمیت اور اپنی علمی کم مائیگی و بے بضاعتی کے پیش نظر میں بار بار گریز کی راہیں ڈھونڈتا رہا اور انھوں نے مسلسل تعاقب کر کے مجھے اس کام پر لگائے رکھا۔ قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ممتاز ماہر قانون جناب خالد اسحاق جو اپنی سادگی طبع، خوش خلقی، کریم النفسی علمی تبحر اور بنیادی حقوق کے حصول و تحفظ کی جدوجہد کے سلسلے میں اپنی اعلیٰ خدمات کی بنا پر خود ایک کتاب کا موضوع ہیں، نہ صرف میرے معاون و رہنما بنے بلکہ انھوں نے اپنی عظیم الشان لائبریری سے استفادہ کی اجازت دے کر مجھے تلاش کتب کی زحمت سے بچا لیا۔ یہ پوری کتاب اسی لائبریری میں مرتب ہوئی اور جناب خالد اسحٰق نے اس کی تکمیل میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ اپنے قیمتی اوقات کا بڑا حصہ کتب مطالعہ کے انتخاب اور ان کی تلاش، تبادلہ خیال اور مختلف ابواب پر بحث و تمحیص کی نذر کیا۔

عصرِ حاضر کے عظیم مفکر اور شارح اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی انتہائی مصروفیات اور خرابی صحت کے باوجود مسودہ کا مطالعہ فرما کر اور پیش لفظ لکھ کر میرے کام کی قدر افزائی کی اور مجھے اپنی شفقت و محبت سے نوازا۔ مولانا محترم کا ایک بالواسطہ احسان یہ بھی ہے کہ ان کی معرکہ آرا تفسیر "تفہیم القرآن" نے مجھے اسلام کی روح کا شعور و ادراک بخشا۔ اس کتاب میں بیشتر آیات کا ترجمہ بھی تفہیم القرآن ہی سے لیا گیا ہے۔

تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما اور آئینی امور پر گہری نظر رکھنے والے بزرگ و محترم سیاستدان مولانا ظفر احمد انصاری رکن قومی اسمبلی نے بھی اپنی علالت اور شدید مصروفیات کے باوجود کتاب کا پورا مسودہ دیکھا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ مولانا کی شفقت اور کتاب سے دلچسپی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بعض ابواب کا مطالعہ رات رات بھر جاگ کر کیا۔ معروف شاعر و ادیب جناب ماہر القادری مدیر فاران نے صحت زبان و

بیان کے پہلو سے مسودہ کا مطالعہ کیا اور اس پر اظہارِ اطمینان فرما کر میری حوصلہ افزائی کی سابق اٹارنی جنرل جناب شریف الدین پیرزادہ نے بھی جزوی طور پر مسودہ دیکھا اور اطمینان ظاہر کیا۔

میں اسلامک ریسرچ اکیڈمی کے ڈائریکٹر سید منور حسن صاحب، خالد اسحٰق صاحب کی لائبریری کے انچارج شعبہ عربی و اسلامیات جناب طاہر المکی اور روزنامہ "جسارت" کراچی کے نیوز ایڈیٹر (News Editor) جناب کشش صدیقی صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے بالترتیب فراہمی کتب، عربی کتابوں سے استفادے اور ترجمے اقتباسات کی نقل اور پروف ریڈنگ میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اجرِ عظیم عطا کرے اور اس کام میں ان کی مخلصانہ شرکت کی برکت سے میری سعی مشکور فرماتے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ "بنیادی حقوق" کے موضوع پر کچھ لکھنے کا خیال پہلی بار مارچ ۱۹۷۳ء میں اس وقت آیا تھا جب خود مجھے تمام بنیادی حقوق سے محروم کر کے حوالۂ زندان کیا گیا تھا اور آج اس کی آخری سطور بھی زندان کی آہنی سلاخوں کے پیچھے اس عالم میں لکھ رہا ہوں کہ میرے بنیادی حقوق معطل ہیں اور وطن کے "پاسبانوں" نے مجھے ڈی پی آر کی بیڑیاں پہنائی ہوئی ہیں

قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی سہو یا سقم نظر آئے تو وہ اسے صرف میری کوتاہی یا کم علمی پر محمول فرمائیں اور مجھے اس سے مطلع کریں۔ ان سے یہ بھی درخواست ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ یہ کتاب میرے لیے دُنیا میں ذریعۂ عزت اور آخرت میں سامانِ نجات ثابت ہو۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ

۲۲ ستمبر ۱۹۷۶ء

محمد صلاح الدین

(سینٹرل جیل کراچی)

کتب حوالہ

1. Mcllwain Chareles, Howard. "Constitutionalism" Great Seal Books. New York. B. (1947) P. 140.

2. Dewey, Robert E. "Freedom". The Macmillon Company. (1970) P. 347.

3. Ibid P. 322.

4. Kernig C. D. "Marxism, Communism And Western Society" Herder And Herder, New York (1972) Vol IV. P 32.

5. Ibid P. 32.

6. Ibid P. 57.

7. Megill, Kennith, A. "The New Democratic Society" The Free Press, New York. (1970) F. 104.

8. Kernig, C. D. "Marxism, Communism and Western Society" P. 27.

9. Megill, Kennith, A. "The New Democratic Society" P. 44.

10. Bertrand De Jouvenel. "SOVERIEGNTY" Cambridge University Press, London. (1957). P. 94.

بنیادی انسانی حقوق کا مفہوم

انسان طبعاً معاشرت پسند ہے۔ اس کی گردہی جبلت اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اپنی پیدائش سے لے کر تادمِ زیست بے شمار افراد کی خدمات، توجہ، امداد اور سہاروں کا محتاج ہے۔ اپنی پرورش، خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم و تربیت کی ضروریات ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی فطری صلاحیتوں کے نشوو ارتقاء اور ان کے عملی اظہار کے لئے بھی وہ اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ یہ اجتماعی زندگی اس کے گرد تعلقات کا ایک وسیع "تانا بانا" تیار کرتی ہے۔ خاندان، برادری، محلے، شہر، ملک اور بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی تک پھیلے ہوئے تعلقات کے یہ چھوٹے بڑے دائرے اس کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔ ماں، باپ، بیٹے، شاگرد، استاد، مالک، ملازم، تاجر، خریدار، شہری اور حکمران کی بے شمار مختلف حیثیتوں میں اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور ان فرائض کے مقابلہ میں وہ کچھ متعین حقوق کا مستحق قرار پاتا ہے۔

ان حقوق میں بعض کی حیثیت محض اخلاقی ہوتی ہے۔ مثلاً بڑوں کا حقِ ادب، چھوٹوں کا حقِ شفقت، ضرورت مند کا حقِ امداد، مہمان کا حقِ تواضع وغیرہ۔ اور بعض کو قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً حقِ ملکیت، حقِ اجرت، حقِ مہر اور حقِ معاوضہ وغیرہ۔ یہ ایسے حقوق ہیں جن کا تعلق کسی مفاد سے ہوتا ہے اور ملک کا قانون اس مفاد کو تسلیم کر کے اسے عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول بنا دیتا ہے۔ یہ حقوق قانونی حقوق (Legal Rights) یا مثبت حقوق (Positive Rights)

کہلاتے ہیں۔

فرد کے حقوق کا ایک اور دائرہ ریاست سے تعلقات کا ہے۔ اس دائرہ میں ایک وسیع الاختیار اور کثیر الوسائل ریاست کے مقابلہ میں فرد کو جو حقوق دیئے جاتے ہیں انھیں ہم بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کہتے ہیں۔ ان حقوق کے لئے بنیادی انسانی حقوق (Basic Human Rights) اور انسان کے پیدائشی حقوق (Birth Rights of Man) کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ان حقوق کی ضمانت ملک کے عام قوانین کی بجائے سب سے بالاتر قانون "دستور" میں دی جاتی ہے۔ انھیں "بنیادی حقوق" اس لئے کہا جاتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی بازو خواہ وہ انتظامی ہو یا قانون ساز' ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ یہ حقوق فرد کو کسی ریاست کا شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ عالمگیر انسانی برادری کا رکن ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ رنگ' نسل' علاقے' زبان اور دوسرے تمام امتیازات سے ماوراء ہیں اور انسان کو محض انسان ہونے کی بناء پر حاصل ہیں۔ یہ کسی ریاست کے منظور کردہ یا کسی معاہدہ سے پیدا شدہ نہیں ہیں بلکہ انسان کو فطرتاً حاصل ہیں اور اس کے وجود کا لازمی حصہ ہیں۔ کوئی ریاست انھیں تسلیم یا نافذ کرنے سے گریز کرتی ہے تو اسے فطرت کے عطا کردہ حقوق کو غصب کرنے کا مجرم سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ حقوق غیر منفک (Inalienable) اور ناقابل تنسیخ (Irrevocable) ہیں۔ ریاست کو ان کی تنسیخ تو کجا' ان میں ترمیم' تحدید یا کسی عذر کی بنا پر ان کے عارضی تعطل کا بھی اختیار نہیں الّا یہ کہ خود مقتدرِ اعلیٰ یعنی عوام نے اسے دستور میں متعین حدود و شرائط کے ساتھ یہ اختیار بخشا ہو۔ یہ گنجائش بھی صرف مغرب کے دساتیر میں رکھی گئی ہے۔ اسلامی دستور کسی بھی فرد' ادارے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری امت تک کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ بنیادی حقوق کو کسی بھی صورت میں منسوخ' محدود یا معطل کر سکے۔

یورپ میں بنیادی حقوق کی اصطلاح کو رائج ہوئے تین ساڑھے تین سو سال سے

زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہ درحقیقت فطری حقوق (Natural Rights) کے اس قدیم نظریہ ہی کا دوسرا نام ہے جسے سب سے پہلے یونانی مفکر زینو نے پیش کیا تھا۔ اور پھر روم کے مشہور مقنن سسرو (Cicero) نے قانونی اور دستوری زبان میں مزید واضح کیا۔ڈیوڈ فریڈمین کا کہنا ہے کہ:۔

"ایک شہری کے متعین حقوق پر مبنی معاشرہ کا تصور نسبتاً جدید تصور ہے جو اولاً قرون وسطیٰ کے معاشرتی نظام کے خلاف اور ثانیاً سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی جدید ریاست کی آمرانہ حکومت کے خلاف ردعمل سے ابھرا ہے۔ اس کا نمایاں اظہار لاک (Locke) کے فلسفہ قانون فرانس کے اعلانِ انسانی حقوق اور امریکی دستور میں ہوا۔" ع۱

گائس ایز بجیو فار بنیادی حقوق کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"انسانی یا بنیادی حقوق جدید نام ہے ان حقوق کا جنھیں روایتی طور پر فطری حقوق کہا جاتا ہے اور ان کی تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ وہ اخلاقی حقوق جو ہر انسان کو ہر جگہ اور ہمہ وقت اس بنیاد پر حاصل رہتے ہیں کہ وہ دوسری تمام مخلوقات کے مقابلہ میں اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ ذی شعور و ذی اخلاق ہے۔ انصاف کو بُری طرح پامال کئے بغیر کوئی بھی شخص ان حقوق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔" ع۲

بنیادی حقوق کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے جسٹس جیکسن (Jackson) کہتے ہیں:۔

"کسی شخص کی زندگی، آزادی، ملکیت، آزادیٔ تقریر و تحریر، آزادیٔ عبادت و اجتماع اور اسی طرح کے دوسرے بنیادی حقوق کسی رائے شماری کے لئے پیش نہیں کئے جاسکتے۔ ان کا انحصار انتخابات کے نتائج پر ہرگز نہیں ہے" ع۳

بنیادی حقوق کا تصور دراصل دو پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک پہلو اخلاقی ہے جس کے

مطابق انسان کو معاشرے میں ایک معزز و باوقار مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ وہ بحیثیت انسان لائق احترام ہے اور دوسرے افرادِ معاشرہ کی طرح اس کا احترام حکمرانوں پر بھی لازم ہے۔ جو لوگ بھی کسی اختیار کے ساتھ اس سے معاملہ کریں انھیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ انسان ہیں اور انسانی عزت و احترام کے لحاظ سے انھیں محض کسی اختیار یا عہدہ کی بنا پر دوسروں کے مقابلہ میں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ بنیادی حقوق کا دوسرا پہلو قانونی ہے جس کے مطابق ان حقوق کو قانونی طور پر تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اور ملک کے اعلیٰ ترین قانون میں تحفّظ دیا جانا چاہیئے۔ اپنے عملی نفاذ کے لحاظ سے یہ پہلو تین عوامل پر مشتمل ہے:

(۱) بنیادی حقوق انسان کے وقار کو منواتے اور قانونی و انتظامی کارروائیوں کے لئے رہنما اصول مہیا کرتے ہیں۔

(۲) یہ حقوق انسان کو ظلم و جبر سے تحفّظ فراہم کرتے ہیں۔ ان کی قائم کردہ حدود جنھیں توڑا نہیں جا سکتا، اسے قانونی، انتظامی اور عدالتی حکام کے امتیازی سلوک سے بچاتی ہیں۔ کیونکہ ان حقوق کے سلسلہ میں قانون کے لئے واضح دفعات متعین کر دی جاتی ہیں۔

(۳) بنیادی حقوق ایک ایسے ادارے کو وجود میں لاتے ہیں جو دوسرے تمام افراد اور حکمرانوں کے مقابلہ میں ان حقوق کے نفاذ کی ضمانت مہیا کرتا ہے یعنی عدلیہ۔

ملک کے آئین میں بنیادی حقوق کی شمولیت کا مقصد ریاست کے اختیاراتِ قانون سازی کا دائرہ متعین کرنا اور اسے عدلیہ کے ذریعہ آئینی حدود و تحفّظات کا پابند بنانا ہوتا ہے تاکہ حکمران شہریوں کے بنیادی حقوق غصب کرکے آمریّت کی راہ اختیار نہ کرسکیں۔ ان حقوق کے مطالبہ کا اصل محرک انسان کی عزت و عظمت اور اس کے وقار و احترام کو آمریّت یا بے رحم اجتماعیت کی چیرہ دستی سے تحفّظ دینا، اس کے لئے آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کی ضمانت مہیا کرنا، اسے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو نشوونما دینے اور ان صلاحیتوں کے ثمرات سے متمتع ہونے کے مواقع بہم پہنچانا۔ اور فکر و عمل کی آزادی کا ایک ایسا دائرہ فراہم کرنا ہے جو ریاست اور دوسرے افرادِ معاشرہ کی مداخلت سے

محفوظ ہو۔ بنیادی حقوق کی اصطلاح یورپ کے مخصوص تاریخی پس منظر میں ابھری ہے۔ ہزار سالہ خانہ جنگی، بادشاہوں کی مطلق العنانی، جاگیردارانہ جبر و استحصال، انفرادی زندگی پر کلیسا کے ناقابلِ برداشت تسلّط، اختلافِ عقیدہ کی بنا پر ہونے والی خونریزی، نیشنلزم اور اس کی پیدا کردہ ہوسِ ملک گیری نے یورپ میں جس طرح انسان کی عزتِ نفس کو مجروح کیا۔ اس کے جان و مال اور آبرو کو پامال کیا اور جابر و قاہر ریاست کے مقابلے میں فرد کو بالکل بے بس و بے اختیار بنا کر رکھ دیا اس نے انسانیت کا درد رکھنے والے لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسان کو تذلیل و تحقیر سے بچانے اور اس کی تعظیم و توقیر بحال کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور مطلق العنان بادشاہوں اور آمروں کو احترامِ آدمیت کی راہ کس طرح دکھائی جائے۔ یہ حالات تھے جن میں فطری حقوق (Natural Rights) کے نظریہ نے اپنے عملی اطلاق کی منزل آتے آتے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کا رُوپ دھارا اور پورے یورپ میں فرد کے لئے متعین حقوق اور ان کے آئینی تحفظ کی تحریک زور پکڑتی چلی گئی۔ نو آبادیاتی دور کے مظالم اور پھر دو عالمی جنگوں میں آتشیں اسلحہ اور ایٹم بم کے استعمال سے جب پورا کرۂ ارض جہنم بنا دیا گیا اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے پورے عالمِ انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو یورپ میں گونجنے والی "بنیادی حقوق" کی آواز ایک عالمگیر مطالبہ بن گئی جس کے نتیجہ میں منشورِ اقوامِ متحدہ اور منشور انسانی حقوق وجود میں آئے۔ یوں وہ اصطلاح جو جبر و استبداد کے مخصوص ماحول میں ابھری تھی۔ اس جبر و استبداد کے عالمگیر پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ دنیا کے گوشے گوشے میں جا پہنچی۔

اسلام کا تصوّرِ حقوق چونکہ وہ پس منظر نہیں رکھتا جو یورپ کے تصوّرِ بنیادی حقوق کا خالق ہے۔ اس لئے وہ قطعی مختلف ہے۔ اس کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے۔

کتبِ حوالہ

1. Friedmann W. — "Legal Theory" Sterers Saw, London (1967) p. 392

2. Gaiues Ezejiofor. — "Protection of Human Rights under the Law" Butterworths London (1964) p. 3

3. Brohi A.K. — Quotation in "United Nations and Human Rights" Karachi (1968) p. 313.

بنیادی حقوق کی تاریخ

اسلام میں انسان کے بنیادی حقوق کے تصور اور ان حقوق کے تعیّن و تحفظ پر گفتگو سے قبل مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اہلِ مغرب کی مرتب کردہ تاریخ حقوق انسانی، ان حقوق کے ماخذ سے متعلق مغربی مفکرین کے نظریات اور پھر ان کے فراہم کردہ تحفظات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آج خود مغرب میں اور اس کا اتباع کرنے والی دنیا میں انسان کس حد تک تحفظِ جان و مال، قیامِ عدل و انصاف، حفاظتِ عزت و آبرو، آزادیٔ عمل اور حریتِ فکر کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے۔ اس کے بنیادی حقوق کہاں تک غیر منفک (Inalienable) ہیں اور گزشتہ تین چار صدیوں میں ان حقوق کے استقرار و حصول کے لئے جو مسلسل جدوجہد کی گئی ہے اس نے انسان کو عافیت و سلامتی اور وقار و احترام کی زندگی بسر کرنے کے کتنے مواقع مہیا کئے ہیں۔

اہلِ مغرب بنیادی انسانی حقوق کے تصوّر کی ارتقائی تاریخ کا آغاز پانچویں صدی قبل مسیح کے یونان سے کرتے ہیں اور پھر پانچویں صدی عیسوی کے زوال پذیر روم سے اپنی سیاسی فکر کا ناتہ جوڑتے ہوئے وہ ایک ہی زقند میں گیارہویں صدی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چھٹی سے دسویں صدی عیسوی تک کا پانچسو سالہ طویل عہد ان کی مرتب کردہ تاریخ کے صفحات سے غائب ہے۔ آخر کیوں؟ شاید اس لئے کہ یہ اسلام کا عہد ہے۔

یونان کے فلسفیوں نے بلا شبہ قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف پر بہت زور دیا ہے۔ اور اس کی ضرورت و اہمیت پر بڑی فاضلانہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ لیکن ان کے ہاں انسانی مساوات کا کوئی تصوّر ہمیں نہیں ملتا۔ وہ ہندوستان کے برہمن (حکمران اور مذہبی پیشوا) چھتری (فوجی خدمات انجام دینے والے) ویش (تجارت اور زراعت پیشہ لوگ) اور شودر (بقیہ تین ذاتوں کے خدمت گار اور غلام) طبقوں کی طرح انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور منوشاستر کی طرح ان کے ہاں بھی یہی چار طبقات ملتے ہیں۔ افلاطون اپنی کتاب "جمہوریت" (Republic) میں حکمرانی کا حق صرف فلسفیوں کو دیتا ہے اور پھر بقیہ افرادِ معاشرہ کو فوجیوں، کاشتکاروں اور غلاموں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"شہریو! تم آپس میں بھائی ضرور ہو مگر خدا نے تمہیں مختلف حالتوں میں پیدا کیا ہے۔ تم میں سے کچھ میں حکمرانی کی صلاحیت ہے اور انھیں خدا نے سونے سے بنایا ہے۔ کچھ چاندی سے بنائے گئے ہیں جو ان کے معاونین ہیں۔ پھر کاشت کار اور دستکار ہیں جنھیں اس نے پیتل اور لوہے سے بنایا ہے۔" [۱]

اب افلاطون کا تصوّرِ انصاف ملاحظہ فرمایئے:۔

"میں اعلان کرتا ہوں کہ انصاف طاقتور کے مفاد کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ انصاف کا بس ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے طاقتور کا مفاد۔" [۲]

انصاف کی تعریف مزید وضاحت کے ساتھ سنئے:۔

"انصاف ایک ایسا فن ہے جو دوستوں کو نوازتا اور دشمنوں کو رگیدتا ہے۔" [۳]

افلاطون کے نزدیک جمہوریت کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں تمام شہریوں کو مساوی حیثیت دے دی جاتی ہے۔

"جمہوریت ایک تغیر پذیر طرزِ حکومت ہے جو انتشار اور افراتفری سے پُر ہوتی ہے اور مساوی و غیر مساوی لوگوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔" [۴]

قانون کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے افلاطون صاحب فرماتے ہیں:۔

"قانون کا مقصد ان لوگوں کو خوش رکھنا ہے جو اسے استعمال کرتے ہیں" ۵

افلاطون عدل کے معاملہ میں مساوات کا قائل نہیں۔ وہ ہر طبقہ کیلئے علیحدہ قانون کا حامی ہے

غلاموں کے بارے میں وہ اپنی کتاب "قوانین" (Laws) میں لکھتا ہے:۔

"غلاموں کو وہی سزا ملنی چاہیئے جس کے وہ مستحق ہیں۔ انھیں آزاد شہریوں کی طرح صرف سرزنش نہیں کرنی چاہیئے۔ ورنہ ان کا دماغ خراب ہو جائے گا" ۶

وہ عورت اور مرد کے درمیان بھی مساوات کا روادار نہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

"نیکی کے معاملہ میں عورت کی فطرت مرد سے پست تر ہے" ۷

افلاطون کی طرح اس کا شاگرد ارسطو بھی طبقاتی معاشرہ کا علمبردار ہے۔ اسے بھی مساوات کے تصور سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اپنی کتاب "سیاست" میں وہ جمہوریت کو بدترین طرزِ حکومت قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے جس میں اقتدار پنچ، مفلس اور بیہودہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہ وہ آخری مکروہ ترین طرزِ حکومت ہے جو ہر شہری کو حکومت میں حصہ دار بنا دیتا ہے" ۸

ارسطو کا تصورِ انصاف بھی افلاطون سے ملتا جلتا ہے وہ کہتا ہے کہ:۔

"انصاف وہ وصف ہے جس کے ذریعہ ہر فرد کو حسبِ حیثیت اور قانون کے مطابق حق ملتا ہے" ۹

یہاں حیثیت کی شرط لگا کر وہ عدل میں مساوات کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ غلامی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر بہت واضح ہے:۔

"کچھ لوگ فطرتاً آزاد پیدا ہوئے ہیں اور کچھ غلام اور موخر الذکر کے معاملہ میں کثرتِ تعداد مفید بھی ہے اور منصفانہ بھی" ۱۰

وہ آزاد اور "شریف" لوگوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ان کثیر التعداد غلاموں کو آپس میں تقسیم کر کے انھیں کام پر لگا دیں اور ان کے روٹی کپڑے کا بندوبست کر دیں۔ "سیاست" ہی میں وہ لکھتا ہے:-

"فہمیدہ اور کشادہ دل اشرافیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غلاموں کو آپس میں بانٹ لیں۔ انھیں کام پر لگائیں اور جو ان کی ضرورت ہو اسے پورا کر دیں۔" ملہ۱۱

اشرافیہ کو یہ حق صرف غلام مردوں ہی پر حاصل نہیں۔ بلکہ ان کے بیوی بچے بھی ان کی ملکیت ہیں۔ ارسطو کہتا ہے:-

"غریب لوگ امیروں کے پیدائشی غلام ہیں۔ وہ بھی ان کی بیویاں بھی اور ان کے بچے بھی:" ملہ۱۲

ارسطو غلاموں کو شہری حقوق نہیں دیتا۔ اس کی تعریفِ شہریت کے مطابق صرف رہائش کی بنیاد پر کوئی شخص شہری نہیں بن جاتا۔ یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو غلام اور آزاد مساوی الحیثیت ہو جائیں گے۔ شہری صرف وہ ہے جو انتظامی اور عدالتی امور میں شرکت کرے۔ اور یہ حق صرف آزاد لوگوں کا ہے۔ آزاد بھی وہ جو نجیب الطرفین ہو۔

"شہری وہ ہے جو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شہری پیدا ہوا ہو نہ کہ صرف ماں کی طرف سے یا باپ کی طرف سے۔" ملہ۱۳

انسان اور انصاف کے بارے میں افلاطون اور ارسطو کے ان تصوّرات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپ کے سرچشمۂ ہدایت یونان میں بنیادی انسانی حقوق کی کیا کیفیت ہو گی۔ رابرٹ ای ڈیوی نے یونانیوں کے ان افکار و نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"تین لاکھ غلاموں اور ۹۰ ہزار نام نہاد آزاد شہریوں کے شہر میں بیٹھ کر افلاطون نے کیسے کیسے شاندار اور پرشکوہ الفاظ میں "آزادی" کے گن گائے ہیں۔" ملہ۱۴

یونان میں غلاموں کی حیثیت حیوانِ ناطق سے زیادہ نہ تھی ——— ان کا شمار

انسانوں میں نہیں تھا۔ وہ تمام حقوق سے یکسر محروم تھے۔ ان کا کام بس اپنے آقاؤں کی چاکری تھا۔ اس صورت حال کے خلاف سب سے پہلے رواقیوں (Stoics) نے آواز اٹھائی۔ اس مدرسۂ فکر کے بانی زینو (Zeno) نے انسانی مساوات پر زور دیا۔ اور فطری قانون (Natural Law) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کے مطابق فطری قانون آفاقی ہے۔ اس کا اطلاق کسی خاص ریاست کے شہریوں ہی پر نہیں بلکہ ہر انسان پر ہوتا ہے۔ یہ قانونِ موضوعہ (Positive Law) سے برتر قانون ہے۔ اور انصاف کے ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہے جنھیں "شعور کی آنکھ سے واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس قانون کے تحت حاصل ہونے والے فطری حقوق کسی خاص ریاست کے مخصوص شہریوں تک محدود نہیں بلکہ کسی بھی جگہ رہنے والا ہر انسان محض انسان اور ذی عقل انسان ہونے کی حیثیت سے انکا مستحق ہے۔" [۱۵]

رواقیوں کے نظریہ فطری حقوق نے روم کے مفکرین اور قانون سازوں کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے اپنے فلسفۂ قانون و سیاست میں "آزادی" اور مساوات پر غیر معمولی زور دیا۔ اہل مغرب اسے رواقیوں ہی کے اثر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ مذہب کے عطا کردہ شعور اور اس کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔

روم کا مشہور مقنن سسرو (Cicero) جو مذہباً عیسائی تھا۔ فطری قانون کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ قانون ہمہ گیر اطلاق کا حامل ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ اس کو بدلنا گناہ ہے۔ اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے کسی جزو کو منسوخ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسے مکمل طور پر ختم کرنا ناممکن ہے۔ سینیٹ یا عوام کے ذریعہ ہم اس کی پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

روم اور ایتھنز میں مختلف قوانین ہوں گے یا آج اور کل مختلف قوانین ہو سکتے ہیں مگر ایک دائمی اور ناقابلِ تبدیل قانون ہی تمام اقوام اور تمام زمانوں کے لیئے جائز و مستحکم ہو گا۔" ص۱۶

اپنی فکر کے اصل سرچشمہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"تمام اقوام اور تمام زمانے ایک ابدی اور ناقابلِ تنسیخ قانون کے پابند ہوں گے۔ خدا ہو گا جو سب انسانوں کے لئے مشترک ہے۔ وہی ان کا آقا اور حکمران ہے۔ وہی ہے جو اس قانون کو تجویز کرتا ہے۔ زیرِ بحث لاتا ہے۔ اور نافذ کرتا ہے۔ یہ وہ قانون ہے کہ جس کی انسان پیروی نہ کرے تو اپنے رب سے روگردانی ہو جائے گی اور جسے انسان کی فطرت قبول نہ کرے تو اسی ناقبولیت کے سبب کڑی سزا ملے۔ اور اگر اس سے بچ بھی جائے تو بہر حال انسانوں کا عقیدہ ہے کہ اسے کوئی دوسری سزا ضرور مل کر رہے گی۔" ص۱۷

سسرو اور اس کے ہم عصر قانون سازوں نے اپنے وضع کردہ قوانین میں انفرادی ملکیت کے حق کو بطورِ خاص تحفظ دیا۔ اس سے ایک طرف فرد کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ اور دوسری طرف بنیادی حقوق کی تعریف کے لئے ایک بنیاد فراہم ہو گئی۔ بنیادی حقوق کی جدوجہد کا اصل آغاز گیارہویں صدی میں برطانیہ میں ہوا۔ جہاں ۱۰۳۷ء میں شاہ کانریڈ ثانی (Conrad II) نے ایک منشور جاری کر کے پارلیمنٹ کے اختیارات متعین کئے۔ اس منشور کے بعد پارلیمنٹ نے اپنے اختیارات میں توسیع کی کوششیں شروع کیں۔ ۱۱۸۸ء میں شاہ الفانسو نہم (Alfonso IX) سے جنس بیجا کا اصول تسلیم کرا لیا گیا۔ ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو "میگنا کارٹا" جاری ہوا جسے والٹیئر نے "منشورِ آزادی" قرار دیا۔ اس میں شک نہیں کہ میگنا کارٹا برطانیہ میں بنیادی حقوق کی اہم ترین اور تاریخ ساز دستاویز ہے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم بہت بعد میں اخذ کیا گیا ہے۔ اس وقت اس کی حیثیت امراء (Barons) اور شاہ جان (King John) کے درمیان ایک

معاہدہ کی سی تھی جس میں امراء کے مفادات کا تحفظ کیا گیا تھا. عوام کے حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا. ہنری مارش کہتا ہے کہ:۔

"بڑے بڑے جاگیرداروں کے ایک منشور کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔"[۱۸]

۱۳۵۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے میگنا کارٹا کی ترمیم کرتے ہوئے قانونی چارہ جوئی (Due Process of Law) کا قانون منظور کیا جس کے تحت کسی شخص کو عدالتی کارروائی کے بغیر زمین سے بیدخل یا قید نہیں کیا جا سکتا تھا. اور نہ اسے سزائے موت دی جا سکتی تھی۔

چودھویں سے سولھویں صدی تک یورپ پر میکیاولی کے نظریات کا غلبہ رہا جس نے آمریت کو استحکام بخشا، بادشاہوں کے ہاتھ مضبوط کئے اور حصول اقتدار کو حاصل زندگی بنا دیا۔ سترہویں صدی میں انسان کے فطری حقوق کا نظریہ بھرپور قوت سے ابھرا۔ ۱۶۷۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے حبس بیجا کا قانون منظور کیا. جس نے عام شہریوں کو بلا جواز گرفتاری سے تحفظ فراہم کر دیا. ۱۶۸۸ء میں انقلابی فوج نے برطانوی پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کی حدود متعین کر دیں. ۱۶۸۹ء میں پارلیمنٹ نے برطانیہ کی دستوری تاریخ کی اہم ترین دستاویز، قانونِ حقوق (Bill of Rights) منظور کی. بقول لارڈ ایکٹن (Lord Acton) "یہ انگریز قوم کا عظیم ترین کارنامہ ہے." اس بل کو برطانیہ میں تحریک آزادی کی تکمیل قرار دیا جاتا ہے. کیونکہ اس کے ذریعہ بنیادی حقوق کا واضح تعین کر دیا گیا. ۱۶۹۰ء میں جان لاک (John Locke) نے انقلاب ۸۹-۱۶۸۸ء کے جواز میں اپنی کتاب (Treaties on Civil Government) تصنیف کی. جس میں معاہدہ عمرانی کا نظریہ پیش کیا. اور فرد کے حقوق پر بڑی مدلل بحث کی. ۱۷۶۲ء میں مشہور فرانسیسی مفکر روسو (Rousseaue) نے "معاہدہ عمرانی" کے زیر عنوان ایک کتاب لکھی جس میں ہابس اور لاک کے پیش کردہ معاہدہ عمرانی کا ایک نئے زاویہ سے جائزہ لیا گیا۔ اس نے ہابس کے

مقتدرِ اعلیٰ اور لاک کی جمہوریت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نظریات نے نہ صرف انقلابِ فرانس کی راہ ہموار کی بلکہ پورے یورپ کی سیاسی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ریاست کے مقابلہ میں فرد کے حقوق کو تسلیم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۲ جون ۱۷۷۶ء کو امریکی ریاست ورجینیا (Virginia) سے جارج میسن (George Mason) کا تحریر کردہ منشورِ حقوق جاری ہوا جس میں پریس کی آزادی، مذہب کی آزادی اور عدالتی چارہ جوئی کے حق کی ضمانت دی گئی۔ ۱۲ جولائی ۱۷۷۶ء کو امریکہ کا اعلانِ آزادی جاری ہوا۔ اس کا مسودہ تھامس جیفرسن (Thomas Jefferson) کا لکھا ہوا تھا۔ اور اس کے بیشتر اصول انگریز مفکرین بالخصوص جان لاک کے نظریات پر مبنی تھے۔ اس اعلان کے ابتدائیہ میں فطری قانون (Law of Nature) کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ "تمام انسان یکساں پیدا کیے گئے ہیں۔ انھیں ان کے خالق نے غیر منفک حقوق عطا کیے ہیں؛ جن میں تحفظِ زندگی، آزادی اور تلاشِ مسرت کے حقوق شامل ہیں"۔ ۱۷۸۹ء میں امریکی کانگریس نے آئین کے نفاذ سے تین سال بعد اس میں وہ دس ترمیمات منظور کیں جو قانونِ حقوق کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی سال فرانس کی قومی اسمبلی نے منشورِ انسانی حقوق (Declaration of the Rights of Man) منظور کیا۔ ۱۷۹۲ء میں تھامس پین (Thomas Paine) نے اپنا مشہور کتابچہ حقوقِ انسانی (The Rights of Man) شائع کیا جس نے اہلِ مغرب کے خیالات پر گہرے اثرات مرتب کیے اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کی جدوجہد کو مزید آگے بڑھایا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ریاستوں کے دساتیر میں بنیادی حقوق کی شمولیت ایک عام روایت بن گئی۔ ۱۸۶۸ء میں امریکی دستور کی چودہویں ترمیم منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ امریکہ کی کوئی بھی ریاست قانونی ضابطہ کی تعمیل کیے بغیر کسی شخص کو اس کی جان، آزادی اور املاک سے محروم نہیں کرے گی اور نہ اسے قانون کا مساوی تحفظ فراہم کرنے سے انکار کرے گی۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جرمنی اور متعدد نئے یورپی ممالک کے دساتیر میں بنیادی حقوق

شامل کیے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں مشہور ادیب ایچ جی ویلز (H. G. Wells) نے اپنی کتاب دنیا کا نیا نظام (New World Order) میں ایک منشورِ انسانی حقوق کے اجراء کی تجویز پیش کی۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں صدر روزویلٹ (Roosevelt) نے کانگریس سے "چار آزادیوں" کی حمایت کرنے کی اپیل کی۔ اگست ۱۹۴۱ء میں منشورِ اوقیانوس (Atlantic Charter) پر دستخط ہوئے جس کا مقصد بقول چرچل "انسانی حقوق کی علمبرداری کے ساتھ جنگ کا خاتمہ" تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد تحریری دساتیر میں بنیادی حقوق کی شمولیت مزید نمایاں ہو گئی۔ فرانس نے اپنے ۱۹۴۶ء کے دستور میں ۱۷۸۹ء کے منشور انسانی حقوق کو شامل کیا۔ اسی سال جاپان نے بنیادی حقوق کو دستور کا حصہ بنایا۔ ۱۹۴۷ء میں اٹلی نے اپنے دستور میں انسانی حقوق کی ضمانت دی۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے لئے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں بالآخر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کا "منشور انسانی حقوق" جاری ہوا جس میں وہ تمام حقوق سمو دیئے گئے جو مختلف یورپی ممالک کے دساتیر میں شامل تھے یا انسانی ذہن میں آ سکتے تھے۔

جنرل اسمبلی میں رائے شماری کے وقت اس منشور کے حق میں ۴۸ ووٹ آئے۔ ۸ ممالک نے رائے شماری میں حصّہ نہیں لیا جن میں روس بھی شامل تھا۔ اس منشور پر عمل درآمد کی صورت حال کا جائزہ لینے اور ان کے تحفّظ یا نئے حقوق کے تعین کے لئے اپنی تجاویز پیش کرنے کے لئے ایک مستقل کمیشن برائے انسانی حقوق بھی قائم کر دیا گیا۔

بنیادی حقوق کی اس مختصر تاریخ کے بعد اب ہم اس مسئلہ کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کا جائزہ لے کر یہ دیکھیں گے کہ مغربی مفکرین کا تصورِ حقوق اور ان حقوق کا ماخذ کیا ہے۔ اور ان حقوق کو ملک کے دستور میں شامل کر دینے یا ایک عالمگیر منشور انسانی مرتب و منظور کر لینے سے کیا فی الحقیقت ان حقوق کے تحفّظ کی قابلِ اطمینان ضمانت مہیا ہو گئی ہے؟ کیا ملکی دستور اور عالمی منشور ایک فرد کو آمریت و فسطائیت کے چنگل سے نجات دلانے اور جبر و استبداد کی چکی میں پسنے سے بچانے کے لئے کوئی مؤثر ذریعۂ حفاظت ثابت ہوئے ہیں؟ اور کیا بیسویں صدی کا انسان

فی الواقع بارہویں یا سولہویں صدی کے غلام اور مقہور انسان کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ، پُرامن اور خوف و خطر سے آزاد زندگی بسر کر رہا ہے؟

کتبِ حوالہ

1. Morris Stockhammer, "Plato Dictionary". Philosophical Library, New York P. 32 (1903)
2. Ibid. P. 141
3. Ibid. P. 134
4. Ibid. P. 56
5. Ibid. P. 149
6. Ibid. P. 238
7. Ibid. P. 280
8. Thomas P. Kierman, "Aristotle Dictionary". Philosophical Library, New York P. 288 (1962)
9. Ibid. P. 312
10. Ibid. P. 454
11. Ibid. P. 364
12. Ibid. P. 185
13. Ibid. P. 207
14. Dewey Robert E. "Freedom" The Macillan Co. London (1970) P. 347.
15. Cranston M. "Human Rights Today". London (1964) P. 9
16. Gouis Ezejiofor, "Protection of Human Rights under the Law" (1964) P. 4.
17. Brohi A. K. "Fundamental Law of Pakistan" Karachi (1958) P. 733.
18. Henry Marsh "Documents of Liberty" David & Charles, New Town Abbot, England (1971) P. 51

مغرب کا تصوّرِ حقوق

انسان کے بنیادی حقوق کا مسئلہ درحقیقت، اس کائنات میں انسان کی حیثیت، اس کے مقصدِ وجود، معاشرے اور ریاست کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت اور خود اس کائنات کی تخلیق اور اس کے آغاز و انجام کی حقیقت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کا مسئلہ ہے۔ انسان کے حقوق کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب ممکن ہی نہیں ہے جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا منصب و مقام کیا ہے۔ گویا حق کا سوال حیثیت کے سوال سے مربوط ہے۔ انسان کی حیثیت کو جانے بغیر یا اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کئے بغیر ہم اس کے حقوق کا تعین نہیں کر سکتے۔

انسانی زندگی سے متعلق ان بنیادی سوالات کو حل کرنے کے لئے ہمیں صرف الہامی مذاہب ہی سے رہنمائی حاصل ہو سکتی تھی کیونکہ ہمارے پاس کوئی دوسرا قابلِ اعتماد ذریعہ علم موجود نہیں تھا لیکن انسان نے جب وحی کے ذریعۂ علم کو نظر انداز کر کے محض عقل کے بل پر ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی تو یہیں سے ظن و گمان کی بھول بھلیوں اور جہل کی وادیوں میں ٹھوکر در ٹھوکریں کھانے کا آغاز ہوا۔ یہ حقائق حواس پر مبنی تجربہ اور مشاہدہ کی گرفت سے ماوراء تھے بلدن تاریخ جو اس کائنات میں انسانی زندگی کے آغاز سے لاکھوں سال بعد وجود میں آئی۔ ان حقائق تک رسائی کے لئے اپنے ریکارڈ میں کوئی مواد پیش کرنے سے قاصر تھی۔ اس گمبھیر تاریکی میں جب

وحی کی روشنی سے محروم اور حقائق سے ناآشنا عقل نے زندگی کے پیچیدہ مسائل کو ناخن تدبیر سے سلجھانے کی کوشش کی تو سب سے پہلی اور بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کیا جائے؛ عقل کے سامنے چونکہ مسلمات نہیں تھے جن کی بنیاد پر وہ اپنے دلائل قائم کرتی۔ اس لئے لامحالہ اسے نقطۂ آغاز کے طور پر خود ساختہ دعاوی (Thesis) نظریات (Ideologies) اور تصورات (Theories) قائم کر کے ان کی بنیاد پر بحث و کلام کی طرح ڈالنی پڑی۔ یوں عقل نے ایک ناقابل اعتماد اور قیاس و گمان پر مبنی طریقۂ بحث اختیار کر کے اپنی مشکل تو رفع کر لی لیکن وہ انسانیت کو درپیش مسائل کا کوئی قابل اطمینان حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے پیش کردہ مبہم، متضاد، غیر مربوط اور بے ہنگم افکار و نظریات کے طومار نے ان مسائل کو اور الجھا دیا۔ اور اس طرح انسانیت جہل و حماقت کے گرداب میں پھنستی چلی گئی۔ قرآن نے عقل کی اسی درماندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

"اور اے محمدؐ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین پر بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔" (الانعام۔۱۱۶)

"ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے۔ جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کر رہے ہو۔" (الانعام۔۱۴۸)

عقل کا سفر چونکہ جہل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے شروع ہوا تھا۔ اس لئے اس کے موضوعہ مقدمات (Premises) کی کوئی اساس نہیں ہے۔ وہ اٹکل سے آگے بڑھتی اور سلجھاؤ کی کوشش میں نت نئے الجھاؤ پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ اس نے انسان کے بنیادی حقوق کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تو اس معاملہ میں بھی اسے مفروضات اور نظریات ہی کا سہارا لینا پڑا۔ بنیادی حقوق کے سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ آخر ان حقوق کا جواز کیا ہے؟ کس بنیاد پر انسان کے لیے کچھ حقوق تسلیم کیے جائیں اور تسلیم کیے بھی جائیں تو کس اتھارٹی کے کہنے پر؟ یہ آخر ہیں کس کے عطا کردہ؟

عقل نے بہت غور وفکر کے بعد اس سوال کا یہ جواب تلاش کیا کہ انسان کو چونکہ خود فطرت نے بعض حقوق عطا کئے ہیں اس لئے انھیں تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ یہ نظریہ، فطری حقوق (Natural Rights) کا نظریہ کہلایا۔ اس پر اعتراض ہوا کہ یہ اصطلاح مبہم اور غیر واضح ہے۔ خود لفظ فطرت کا کوئی واضح اور متفقہ مفہوم آج تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ اس لئے فطری حقوق کا تعین کیسے ہو؟ سب سے بڑا اعتراض یہ ہوا کہ ان حقوق کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ حقوق کا تصور تو معاشرہ کے اندر اس کی منظوری ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ معاشرہ کی منظوری کے بغیر حق کا سوال کیسا؟

اب ان حقوق کو قانونی حیثیت دینے اور معاشرے کی منظوری حاصل کرنے کے لئے معاہدہ عمرانی (Social Contract) کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اور دعویٰ کیا گیا کہ چونکہ ریاست کا وجود اسی معاہدہ کا مرہونِ منت ہے۔ اس لئے حکمرانوں کے اختیارات اور شہریوں کے حقوق کا اصل سرچشمہ یہی ہے۔ اس طرح حقوق کے لئے ایک قانونی جواز فراہم کرنے کی ضرورت پوری کر لی گئی۔ لیکن اس معاہدہ کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ جی ڈبلیو گف سے سنیئے!۔

"بلیک سٹون (Black Stone) اور پیلے (Paley) سے لے کر مین (Maine) اور اس کے متبعین تک پورے تاریخی مدرسہ فکر کا کہنا ہے اور اب یہ بالکل واضح اور ناقابل تردید بھی ہے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ریاستیں اور حکومتیں ارادتاً کسی معاہدہ کے ذریعہ سے وجود میں نہیں آئیں بلکہ فطری طور پر ایک خاندان یا قبیلہ کی طرح ابتدائی گروہ بندیوں سے بتدریج قائم ہوئی ہیں"۔ ۱۵

پروفیسر الیاس کہتے ہیں:۔

"کیا نظریہ معاہدہ عمرانی پورا کا پورا غیر تاریخی ہے؟ کیا یہ سراسر افسانہ ہے؟ کیا یہ مجموعی طور پر بے بنیاد اور محض تصوراتی ہے؟ ان سوالات کا جواب ہمیشہ اثبات میں دیا گیا ہے اور آج تک کسی نے نہیں کہا کہ "نہیں"۔ یہ سارا نظریہ اس وقت اور

حیرت انگیز بن جاتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ یہ تو اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود ظن و گمان۔ اسی لئے غیر تاریخی ہونے کے باوجود اس کی اپنی تاریخ ہے۔ غیر تاریخی سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان کی پوری سیاسی تاریخ میں ہمیں کوئی ایک واقعہ یا ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں ریاست کی تشکیل کے لئے معاہدہ عمرانی کو استعمال کیا گیا ہو"۔ ۲

سوال یہ ہے کہ جو نظریہ اتنا بے بنیاد ہو کہ اس کی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہ ہو۔ اور خود مغرب کے مورّخ بالاتفاق اسے غیر تاریخی قرار دے چکے ہوں۔ اسے اس قدر اہمیت کیوں دی گئی اور اس کی بنیاد پر تصورِ حقوق کی پوری عمارت کیوں تعمیر کر لی گئی؟ اس کی وجہ خود اہل مغرب سے سن لیجئے:۔

"یہ نظریہ سولہویں اور سترہویں صدی میں اس وقت نمودار ہوا جب سیاسی مفکرین کو فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کی تعبیر کے لئے ایک ایسے معاہدے کی ضرورت لاحق ہوئی"۔ ۳

گویا یہ معاہدہ اپنے نظریات کو جواز یا قانونی اساس مہیا کرنے کی ضرورت کے تحت "ایجاد" کیا گیا ہے۔

جی ڈبلیو گف اس معاہدہ کی اصل اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ نظریہ بڑے اہم عملی نتائج کا حامل ہے۔ معاہدہ عمرانی کی شرائط یا اس کے جھوٹے اور سچے ہونے کے سوال سے زیادہ اہم وہ اصول ہے جسے معاہدہ کے حامی بلند و برقرار رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں"۔ ۴

"اگر "معاہدہ عمرانی" کی اصطلاح کو برقرار رکھنا ہی ہے تو اسکی بہترین صورت یہ ہو گی کہ اسے معاہدہ میں پیش کردہ تصور کے مطابق سیاسی وفاداری سے متعلق نظریات کا ایک مخفف (Abbreviation) سمجھ لیا جائے"۔ ۵

"ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے معاہدہ عمرانی کو مسترد کیا جا چکا ہے۔ اس کے جدید علمبرداروں نے بڑی دانشمندی سے خود کو اس دعویٰ تک محدود کر لیا ہے کہ یہ معاہدہ ریاست کی فلسفیانہ بنیاد ہے۔ اس دعوے نے بھی کئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ کانٹ (Kant) کی طرح یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ "گو یہ معاہدہ تاریخی اعتبار سے افسانہ ہے لیکن "عقل کے تصور" کی حیثیت سے وہ جائز ہے۔ اس کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ سیاسی حقوق و فرائض کو منضبط ہونا چاہیئے۔" ملے

ان اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ معاہدہ عمرانی کو افسانہ سمجھنے کے باوجود اہل مغرب اسے مسترد کر دینے پر کیوں آمادہ نہیں۔ وہ اسے ترک کر دیں تو "حقوق و فرائض" کو منضبط کرنے والی کوئی چیز ان کے پاس باقی نہیں رہتی۔ اسی مجبوری کے پیش نظر سرارنسٹ بارکر معاہدہ عمرانی کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس نظریہ کی حمایت میں اب بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ریاست جو معاشرہ سے بالکل مختلف ہے ایک قانونی تنظیم ہے جو بنیادی طور پر معاہدہ کے "مفروضہ" ہی پر قائم ہے"۔ ملے

اس معاہدہ کی ایجاد سے بنیادی حقوق اور ریاست کے اختیارات کا جواز تو مہیا ہو گیا لیکن اب ایک اور اہم سوال سامنے آ کھڑا ہوا۔ مقتدر اعلیٰ کون ہے، ریاست یا عوام؟ حقوق اور اختیارات کے لحاظ سے ان میں سے بالادستی کس کو حاصل ہے؟

معاہدہ عمرانی ہی کو بنیاد بنا کر اس مسئلہ کو بھی حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اپنے اپنے عہد کے تقاضوں اور مخصوص ضروریات کو پیش نظر رکھ کر۔ ہابس (Hobbes) کا مقصود اسٹورٹ بادشاہوں کی مطلق العنان حکمرانی کے لئے قانونی جواز مہیا کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے معاہدہ عمرانی سے قبل کی حالت فطری (State of Nature) کا نقشہ اپنی ضرورت کے مطابق کھینچا۔ حکمرانوں

کو مقتدرِ اعلیٰ قرار دے کر سارے اختیارات کا مالک بنا دیا۔ اور بے بس و بے اختیار عوام کے لئے ان حکمرانوں کی غیر مشروط اور بے چون و چرا اطاعت لازم ٹھہری۔

۱۶۸۸ء کے "شاندار انقلاب" نے جب مطلق العنان بادشاہت کی گرفت کمزور کی۔ اور قانونِ حقوق (Bill of Rights) کے ذریعہ پارلیمنٹ اور عوام کے حقوق و اختیارات میں کچھ اضافہ ہوا تو جان لاک (John Locke) کو نئی صورتِ حال کے جواز کے لئے اس معاہدۂ عمرانی کی ایک نئی تعبیر پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اس کے تخیل نے حالتِ فطری کی ایک قطعی مختلف تصویر پیش کی جس میں انسان کی زندگی "تنہا، افلاس زدہ، بدتر، وحشیانہ اور مختصر" نہیں تھی۔ بلکہ ہابس کے دعوے کے برعکس وہ "امن، خیرسگالی، باہمی تعاون اور تحفظ" کا دور تھا جس میں انسان آزادی اور مساوات کے اصولوں پر بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لاک نے اس پس منظر کے ساتھ معاہدہ عمرانی کی نئی تعبیر میں اقتدار اعلیٰ کو بادشاہ اور عوام کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اور عوام کو بالاتر حیثیت دی جنکی رضامندی (Consent) کے بغیر کسی بادشاہ کو حقِ حکمرانی نہیں مل سکتا۔

فرانسیسی مفکر روسو (Rousseaue) کا عہد آتے آتے چونکہ بادشاہ اور عوام کے درمیان حقوق و اختیارات کی کشمکش اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس لئے جمہوری قوتوں کو توانائی بخشنے اور بادشاہ کی مطلق العنان حکمرانی پر آخری ضرب لگانے کے لئے معاہدہ عمرانی کی ایک نئی تعبیر پھر ناگزیر ہو گئی۔ اس لئے روسو نے اپنے عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات اور نئے تقاضوں کو سامنے رکھ کر حالتِ فطری کا بڑا حسین منظر پیش کیا۔ اور معاہدۂ عمرانی کی ایسی توجیہہ کی جس نے اقتدار اعلیٰ کا تاج بادشاہ کے سر سے اتار کر عوام کے سر پر رکھ دیا۔

اقتدارِ اعلیٰ کا سوال چونکہ ریاست اور شہریوں کے باہمی تعلقات اور ان کے حقوق و فرائض کے تعین سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے ہابس، لاک اور روسو کے علاوہ دوسرے تمام سیاسی مفکرین اور قانون دانوں نے بھی اس پر تفصیلی بحث کی ان میں گروشس (Grotius) بودین (Bodin) آسٹن (Austin) بنتھم (Bentham) لاسکی (Laski) ٹی ایچ گرین (T. H. Green)

اور ڈائسی (Dicey) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کے مجموعی نتیجہ فکر پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر الیاس احمد کہتے ہیں :۔

"فلسفہ سیاست میں اقتدار اعلیٰ در در کی ٹھوکریں کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ کبھی وہ ایک فرد سے چند افراد کی طرف منتقل ہوتا ہے اور کبھی بہت سے افراد کی طرف کبھی فرد سے معاشرے کیطرف کبھی اقلیت سے اکثریت کی طرف، کبھی اکثریت سے پھر اقلیت کی طرف، کبھی انتظامیہ سے مقننہ کی طرف، کبھی مقننہ سے عدلیہ کی طرف، اور بالآخر معاشرے سے پھر ریاست کے مجرد تصوّر کی طرف"۔ [۴۵]

نظریۂ فطری حقوق سے لے کر اقتدارِ اعلیٰ کی اس بحث تک کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب کا سارا کام قیاس و گمان اور ان کی بنیاد پر قائم کیے جانے والے نظریات کے بل پر چل رہا ہے وہاں چونکہ خود انسان کی حقیقت و حیثیت کے بارے میں کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ اس لئے اس کی زندگی سے متعلق تمام بنیادی مسائل میں زبردست فکری الجھاؤ ہے۔ دوسرے مسائل کی طرح بنیادی حقوق کے تعین کا مسئلہ بھی اسی فساد فکر و نظر کا شکار رہا ہے۔

مغرب میں حقوق مستقل اقدار (Permanent Values) کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کا کوئی دائمی اور آفاقی ماخذ و معیار بھی نہیں ہے۔ تمام مآخذ یا تو تصوّراتی ہیں یا پھر قانون جس ہیجا، میگنا کارٹا، قانونِ حقوق، فرانس کے منشور انسانی حقوق اور امریکی آئین کی دس ترمیمات کی طرح وہ دستاویزات ہیں جن کی نوعیت علاقائی ہے اور جو برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے مخصوص سیاسی و معاشرتی حالات کی پیداوار ہیں وہاں بنیادی حقوق کا تصوّر انسانی شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ابھرا ہے۔ اور ان حقوق نے عوام اور بادشاہ یا حکمرانوں کے درمیان تقسیم اختیارات کی طویل کشمکش کے دوران وجود میں آنے والے معاہدات، پارلیمنٹ کے فیصلوں، منشور، اعلانات اور سیاسی مفکرین کے پیش کردہ نظریات کے بطن سے ایک ایک کر کے جنم

لیا ہے۔ یہ کشمکش جوں جوں آگے بڑھتی گئی حقوق کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ گویا آج جنہیں "بنیادی حقوق" کہا جا رہا ہے وہ کل تک بنیادی حقوق نہیں تھے اور اگر تھے تو ان کی حیثیت محض ایک آرزو اور تمنا کی سی تھی جن کی پشت پر کوئی قوتِ نافذہ (Sanction) موجود نہیں تھی۔ ان میں سے ہر حق اس وقت حق قرار پایا ہے جب ملک کے مروجہ قانون و دستور نے اسے تسلیم کر کے سندِ جواز مہیا کی ہے۔

اب مغرب کے تصورِ حقوق کے ایک اور پہلو کا جائزہ لیجئے۔ اہلِ مغرب یوں تو پوری بنی نوعِ انسان کے لئے بنیادی حقوق کی علمبرداری کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہے۔ ان کا تصورِ حقوق ان کے نظریہ قومیت اور نسلی امتیاز پر مبنی ہے۔ وہ اپنی قوم یا سفید فام نسل کے لئے جن بنیادی حقوق کی ضمانت چاہتے ہیں دوسری قوموں اور نسلوں کو ان کا مستحق نہیں سمجھتے۔ فرانس کے منشورِ انسانی حقوق کو جب ۱۷۹۱ کے آئین میں شامل کیا گیا تو ساتھ ہی یہ صراحت بھی کر دی گئی:۔

"اگرچہ کالونیاں اور ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں فرانسیسی مقبوضات سلطنتِ فرانس ہی کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن اس آئین کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا۔" [۹]

اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جس منشور کو "منشورِ انسانی حقوق" کہا جا رہا ہے وہ دراصل فرانسیسی عوام کا منشورِ حقوق ہے۔ کسی اور قوم کو بلکہ خود فرانسیسی مقبوضات میں رہنے والے غیر فرانسیسی عوام کو ان حقوق کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ روسو کے ہم وطنوں نے الجزائر، ویتنام اور دوسرے مقبوضات میں ان حقوق کا مطالبہ کرنے والے لوگوں کے ساتھ جس درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا وہ عہدِ جدید کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے۔

یہی حال برطانیہ کا ہے۔ اس کے غیر تحریری دستور میں برطانوی شہریوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ انگریز آقاؤں نے اپنی نوآبادیات میں خود اپنے وضع کردہ قوانین میں کبھی شامل نہیں ہونے دیئے۔ ان کا میگنا کارٹا ان کا قانون حبس بیجا اور ان کا قانونِ حقوق بس انہی کے لئے تھے اس

لئے انھیں بھی "انسانی حقوق" کی دستاویز قرار دینا سراسر مغالطہ آرائی ہے۔ ان دستاویزات کے ذریعہ ملنے والے حقوق صرف برطانیہ کے شہریوں تک محدود تھے۔ کسی اور قوم نے اگر خود برطانوی حکمرانوں سے ان حقوق کا مطالبہ کیا تو اسے باغی اور غدار قرار دے کر ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ آج بھی جنوبی افریقہ میں سیاہ فام باشندوں اور شمالی آئرلینڈ میں محکوم سفید فام باشندوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ انسانی حقوق کے بارے میں انگریزوں کے دوغلے پن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۳۰ر نومبر ۱۹۷۲ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے جب نسلی امتیاز کو قابلِ تعزیر جرم بنانے کے لئے ایک قرارداد منظور کی تو اس کے چار مخالفین میں امریکہ، جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ برطانیہ بھی شامل تھا۔

امریکہ کا حال برطانیہ اور فرانس سے مختلف نہیں۔ امریکہ کے سفید فام نوآباد کاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں ریڈ انڈینز کی تو نسل ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دی۔ اپنی "نئی دنیا" کی تعمیر و ترقی کے لئے انھوں نے براعظم افریقہ میں سیاہ فام باشندوں کو جانوروں کی طرح پکڑ پکڑ کے اپنا غلام بنایا۔ اور جہازوں میں لاد لاد کر امریکہ روانہ کیا۔ ان غلاموں کو باقاعدہ خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ افریقہ کے جس ساحل سے انھیں جہازوں میں لادا جاتا تھا۔ اسکا نام ہی ساحلِ غلاماں (Slave Coast) پڑ گیا۔ ان درآمد شدہ غلاموں کی جو نسل باقی رہ گئی ہے وہ آج تک مساوی حقوق حاصل نہ کر سکی۔ اس نے جب کبھی امریکی دستور میں دیئے گئے "انسانی حقوق" کے حوالے سے اپنے لئے ان حقوق کے نفاذ کا مطالبہ کیا تو اسے نہایت بے رحمی سے کچل دیا گیا۔ اس صورت حال پر رابرٹ ڈیری کا یہ بھرپور طنز ملاحظہ ہو۔

> "۵ لاکھ غلاموں اور ہزاروں درآمد شدہ سفید فام خدمت گاروں کی کالونی میں بیٹھ کر تھامس جیفرسن نے جو خود بھی ان غلاموں کے ایک دولتمند آقا تھے۔ کس طمطراق سے امریکہ کے اعلانِ آزادی کے یادگار الفاظ رقم فرمائے ہیں"۔ [۱۰]

اندرونِ ملک اس نسلی امتیاز سے ہٹ کر باہر کی دنیا میں امریکہ کے کردار کا جائزہ لیجئے

تو صورت حال اور بھی بھیانک نظر آتی ہے۔ ہیروشیما، ناگاساکی، کوریا، ویت نام، کمبوڈیا اور مشرق وسطےٰ کے چپے چپے پر اس کے ہاتھوں "بنیادی انسانی حقوق" کی پامالی کی روح فرسا داستانیں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔

اب مغرب کے چوتھے علمبردار انسانی حقوق ــــ کمیونسٹ روس کو لیجیے۔ یہ اس اشتراکیت کا گہوارہ ہے جو انسانیت کو امریکی برطانوی سامراج اور ہر قسم کے استحصال سے نجات دلانے کا پرچم لے کر اٹھی تھی اور جس نے انسان کو امن، خوشحالی اور حقیقی آزادی کی مسرتوں سے ہمکنار کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اسے جب پہلی بار زمین پر جلوہ گر ہونے کا موقع ملا تو اس کا سرخ سویرا پونے دو کروڑ انسانوں کی لاشوں کے پہاڑ کی اوٹ سے طلوع ہوا۔ اور جب اس کی کرنیں مشرق و مغرب میں پھیلیں تو ہنگری، مشرقی جرمنی، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، مقبوضہ ترکستان اور وہ تمام علاقے خون میں نہا گئے جہاں کمیونزم کو در آنے کا موقع ملا۔ روسی ماہر عمرانیات اور فلسفی پروفیسر پٹی رم سوروکن انقلاب روس میں انسانی جانوں کے اتلاف کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انقلاب ۲۲-۱۹۱۸ء میں براہ راست تصادم میں ۶ لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ گویا فی سال ایک لاکھ افراد موت کے گھاٹ اترے۔ خانہ جنگی کے ہلاک شدگان اور بالواسطہ زد میں آکر مرنے والوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ایک کروڑ ۵۰ لاکھ سے ایک کروڑ ۷۰ لاکھ تک پہنچتی ہے۔" [۱۱]

"جو لوگ سُرخ انقلاب کا خونیں چہرہ دیکھ کر اپنی جان بچانے کیلئے ملک سے بھاگ کھڑے ہوئے ان کی باقاعدہ تصدیق شدہ تعداد ۲۰ لاکھ ہے۔" [۱۲]

ان واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی ممالک کا تصورِ حقوق انسانی نہیں بلکہ نسلی، علاقائی، قومی اور نظریاتی تعصبات سے آلودہ ہے۔ وہ جن حقوق کو اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں انھیں نہ صرف دوسری اقوام تک وسعت دینے کے قائل نہیں بلکہ انھوں نے پوری قوت صرف کر کے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ان کے سوا یہ حقوق کسی اور کو نہ ملنے پائیں۔

اشتراکی تصورِ حقوق

مغرب کے عمومی تصورِ حقوق پر گفتگو کے ساتھ ساتھ مناسب ہوگا کہ ہم اشتراکیت کے تصورِ حقوق پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ مارکس اور لینن کے پیش کردہ نظریات کے مطابق بنیادی حقوق کا اصل سرچشمہ تاریخ کا جدلیاتی عمل ہے۔ یہ حقوق فطرت کے عطا کردہ نہیں بلکہ اسی عمل کی پیداوار ہیں۔ یہ تاریخ کے مختلف مراحل میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے بالآخر کمیونزم کے غیر طبقاتی معاشرے میں ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے سب سے پہلے بورژوا طبقے کو جاگیردارانہ معاشرے کا تختہ الٹنے اور سرمایہ دارانہ معاشرہ قائم کرنے میں مدد دی۔ بعد ازاں انھیں پرولتاریوں نے اپنی طبقاتی جنگ میں سرمایہ داروں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا۔ اب یہ سوشلزم کے تحت محنت کش عوام کے مفادات کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اور آخر کار مکمل آزادی اور مساوات کی خاطر کمیونزم میں از خود منسوخ ہو جائیں گے۔ اس فلسفہ کے مطابق یہ حقوق نہ تو فطرت سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ نہ انسان کی ذات کا لازمی حصہ ہیں اور نہ یہ غیر منفک (Inalienable) ہیں۔ ان کی کوئی خصوصی حیثیت اور اہمیت بھی نہیں ہے۔ یہ ملک کے عام قانون ہی کا ایک حصہ ہیں۔ ان حقوق کے تعین کا اختیار صرف حکمران پارٹی کو ہے جو ملک کے محنت کش عوام کے مفادات کی نگران اور ان کی خواہشات کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے۔ بنیادی حقوق کے نفاذ کی اجازت صرف اسی حد تک دی جا سکتی ہے، جہاں تک یہ محنت کش عوام کے مفادات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس بنیادی اصول کے سوا کسی اور حوالے سے ان حقوق کا مطالبہ سراسر غیر قانونی اور غیر آئینی ہے۔ محنت کشوں کا معاشرتی مفاد، تمام بنیادی حقوق کی حدود کو متعین کرنے والا واحد اصول ہے۔ اور اس مفاد کا تعین کمیونسٹ پارٹی کرتی ہے۔ کیونکہ وہی محنت کشوں کے ترقی پسند اور ذمہ دار نمائندوں پر مشتمل واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ محنت کشوں کے مفاد کا خیال رکھے گی۔ اور ان کی معاشرتی بہبود کو یقینی بنانے کے لئے مناسب قوانین وضع کرے گی جن میں بنیادی حقوق کا تعین بھی شامل ہے۔ ایڈری وشنسکی روس کے فلسفہ قانون

کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"روس کا قانون کردار کے ان ضوابط کا مجموعہ ہے جو محنت کشوں کی حاکمیت اور ان کی ظاہر کردہ منشا سے قانونی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ان قوانین کے مؤثر نفاذ کی ضمانت سوشلسٹ ریاست کی مکمل جابرانہ قوت فراہم کرتی ہے اور ان کا مقصد (و) ان تعلقات اور انتظامات کا دفاع، تحفظ اور فروغ ہے جو محنت کشوں کے لئے فائدہ مند اور پسندیدہ ہوں اور (ب) معاشی نظام، طرز زندگی اور انسانی شعور سے سرمایہ کاری اور اس کے پیچھے اثرات کا مکمل اور قطعی صفایا ہے تاکہ کمیونسٹ معاشرہ کی تعمیر کی جا سکے۔" ص۱۳

روسی دستور کے شارح گرگوریین اور ڈولگروپوف بنیادی حقوق کی یہ تعریف پیش کرتے ہیں:۔

"روسی شہریوں کے بنیادی حقوق و فرائض دراصل سوویٹ ریاست کی سوشلسٹ روح کا اظہار ہیں۔" ص۱۴

گویا روس میں ریاست کو فرد پر مکمل بالادستی حاصل ہے۔ وہ اس کے لئے جو حقوق طے کر دے بس وہی اس کے حقوق ہیں اور ریاست کے عام دائرہ قانون سازی سے ماوراء نہیں ہیں۔

یہ تصور حقوق مغربی ممالک کے تصور بنیادی حقوق سے یکسر مختلف بلکہ اس کی عین ضد ہے۔ مغربی ممالک میں ان حقوق کا اصل مقصد فرد کو ریاست کے مقابلہ میں تحفظ دینا ہے۔ اسی لئے وہاں ان حقوق کو ریاست کے وضع کردہ عام قوانین سے بالاتر حیثیت دی جاتی ہے۔ انھیں ملک کے آئین میں شامل کر کے ریاست کے اختیارات قانون سازی کو محدود کر دیا جاتا ہے اور بنیادی حقوق کے نفاذ کی ذمہ داری عدلیہ کو سونپی جاتی ہے۔

اس کے برعکس روس اور دوسرے اشتراکی ممالک میں ان حقوق کی حیثیت کیا ہے سی، ڈی کرنگ سے سنیئے۔

"بنیادی حقوق ریاست کے وضع و نافذ کردہ قوانین سے جنم لیتے ہیں۔ فطری

قانون کی بنیاد پر ان کے کسی جواز کو یہاں سختی سے مسترد کر دیا گیا ہے۔ اسطرح ریاست کے مقابلہ میں شہریوں کی مؤثر حفاظت کی ضمانت یہاں ناممکن بنا دی گئی ہے کیونکہ اس بات کا انحصار کہ یہ حفاظت کس کس درجہ تک مہیا کی جائے خود ریاست کی مرضی پر موقوف ہے۔ مغربی تصور کے مطابق ہر فرد ان حقوق کا مستحق ہے۔ کیونکہ اسے ایک زندہ ذی شعور اور قابلِ قدر وجود کی حیثیت سے خود مختاری حاصل ہے جبکہ کمیونسٹ نظریہ کے مطابق ایک فرد کی حیثیت سے انسان کی قدر و قیمت محض اضافی ہے۔ اس کا مقام معاشرہ میں افادیت کے لحاظ سے طے ہوتا ہے۔ بنیادی حقوق کسی "انسان" کے لئے نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی "بنی نوع انسان" کے لئے ہوتے ہیں۔"

"یوگوسلاویہ کے سوا تمام کمیونسٹ ممالک میں عام عدالتیں بہت محدود قانونی تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ اور وہاں انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے کوئی بین الاقوامی ادارہ بھی نہیں ہے۔ پبلک پراسیکیوٹر کے ذریعہ شہری حقوق کی حفاظت فریب کارانہ ہے کیونکہ یہ پبلک پراسیکیوٹر خود مختار نہیں، حکومت کی ہدایات کے پابند ہیں۔" [۱۵]

روس کے دستور میں شہریوں کے لئے جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) کام کا حق (۲) آرام کا حق (۳) بڑھاپے، بیماری یا معذوری کی صورت میں مادی ضروریات کی فراہمی کا حق (۴) تعلیم کا حق (۵) عورت و مرد کے درمیان مساوات کا حق (۶) قوم اور نسل کے امتیازات سے قطع نظر روس کے تمام شہریوں کے درمیان مساوات کا حق (۷) ضمیر کی آزادی (۸) تقریر، پریس، اجتماع، جلسوں اور مظاہروں کا حق (۹) معاشرتی تنظیموں میں شمولیت کا حق (۱۰) فرد اور خاندان اور خط و کتابت میں عدم مداخلت کا حق (۱۱) پناہ حاصل کرنے کا حق۔

ان حقوق کے ساتھ ساتھ روسی دستور میں فرائض کی بھی صراحت کر دی گئی ہے جو یہ ہیں:۔

(۱) دستور کی پاسداری، قوانین کی پابندی، محنت کی تنظیم کا خیال، سماجی فرائض کے

بارے میں معقول رویہ، سوشلسٹ معاشرہ کی زندگی کے اصولوں کا احترام۔

(۲) سوشلسٹ املاک کی حفاظت اور ان کا استحکام۔

(۳) لازمی فوجی خدمت اور مادرِ وطن کا دفاع۔

روسی دستور کی فہرستِ حقوق میں جماعت سازی کا حق شامل نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اینڈری ونسکی کہتا ہے:۔

"شہریوں کو آزادی عطا کرتے ہوئے سوویٹ ریاست محنت کشوں کے مفادات کو سب سے پہلے سامنے رکھتی ہے۔ اور یہ فطری بات ہے کہ ان آزادیوں میں وہ سیاسی جماعتوں کی آزادی کو شامل نہیں کر سکتی۔ روس کے موجودہ حالات میں جہاں محنت کشوں کو کمیونسٹ پارٹی پر مکمل اعتماد ہے۔ یہ آزادی صرف فسطائیت کے ایجنٹوں اور بیرونی گماشتوں ہی کو مطلوب ہو سکتی ہے جن کا واحد مقصد محنت کشوں کو ساری آزادیوں سے محروم کرنا اور ان کی گردنوں پر ایک بار پھر سرمایہ داری کا جوا رکھ دینا ہے"۔ ص ۱۶

روس اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں یک جماعتی نظام، ریاست کے تمام وسائل اور اداروں پر حکمران پارٹی کی بالادستی، بنیادی حقوق کے کسی اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی تصور کی عدم موجودگی ریاست ہی کو حقوق کے تعین کے مکمل اختیار اور عدلیہ کے ذریعہ ان حقوق کے حصول و نفاذ کی کوئی ضمانت مہیا نہ ہونے کے باعث وہ برائے نام حقوق بھی بالکل بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں جنھیں ان ملکوں کے دساتیر میں گنوایا گیا ہے۔ یہاں کوئی شہری دستور کے عطا کردہ حق سے محرومی کی صورت میں ریاست پر کوئی دعویٰ دائر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نہ اس دعویٰ کی سماعت کے لئے کوئی عدالت موجود ہے اور نہ ریاست کو مدعا علیہ بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تو خود حقوق کا اصل سرچشمہ ہے۔ جسے وہ حق قرار دے وہی حق ہوگا اور جسے وہ حق تسلیم نہ کرے یا تسلیم کرنے کے بعد منسوخ، محدود یا معطل کر دے وہ حق باقی ہی کب رہتا ہے کہ اس کے سلب ہونے

کا الزام عائد کیا جا سکے ؛ یہاں ریاست کی مرضی (Will of S tate) کا دوسرا نام حق ہے اس مرضی کے دائرے سے باہر حق کا فی نفسہ اپنا کوئی وجود نہیں۔

اشتراکیت کا یہ تصورِ حقوق بھی دراصل فلسفہ اشتراکیت کے تصورِ انسان پر مبنی ہے۔ اشتراکی مفکرین کا نظریۂ حیات خالص مادہ پرستانہ ہے۔ ان کے نزدیک اس کائنات کی دوسری مادی اشیاء کی طرح انسان بھی ایک مادی وجود ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت اس کی پیداواری صلاحیت کے مطابق متعین ہوتی ہے جس طرح مشین کا ایک پرزہ اپنی کارکردگی اور پیداواری صلاحیت کے اظہار کے لیے بجلی، پانی، تیل، مناسب دیکھ بھال اور دوسری ضروریات کا محتاج ہے اسی طرح انسان بھی اپنی پیداواری صلاحیت کی ترقی اور اسکے عملی اظہار کیلئے خوراک لباس تعلیم و تربیت رہائش اور علاج معالجہ کی ضروریات کی کفالت چاہتا ہے، یہ کفالت صرف ایسے اجتماعی نظام میں میسر آ سکتی ہے۔ جہاں تمام افراد معاشرہ پیداواری عامل کی حیثیت سے اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہوں۔ اور ایک مرکزی نظم ان سب کے لئے روٹی، کپڑے، مکان اور دوسری مادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا کام سنبھالے ہوئے ہو۔

پیداواری عامل سے زیادہ انسان کی کوئی حیثیت نہیں۔ مذہب، اخلاق، روح، ایمان، آخرت اور اسی طرح کی دوسری تمام اصطلاحات عوام کے استحصال کے لئے سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ لینن کا قول ہے:۔

> "ہم ایسے اخلاق کے منکر ہیں جس کی بنیاد سرمایہ داروں نے خدائی احکام پر رکھی ہے۔ ہم تمام ایسی اخلاقی اقدار کے منکر ہیں جن کی بنیاد انسانی اور طبقاتی نظریات سے بالاتر ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک فریب ہے۔ اور کسانوں اور مزدوروں کو زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کی خاطر بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہماری اخلاقی اقدار غریبوں کی طبقاتی جد و جہد کے تابع ہیں۔ ہماری اخلاقی اقدار کا منبع غریبوں کی طبقاتی جد و جہد کا مفاد ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کوئی ایسی

اخلاقی اقدار موجود نہیں جو انسانی معاشرے سے باہر ہوں"۔ ؏۱۷

اشتراکی تصوّر کے مطابق انسان بس معدے اور مادے کا مجموعہ ہے اور معاشی جدوجہد اس کا واحد مقصدِ حیات ہے۔ جب معاشرے میں انسان کی یہ حیثیت متعین ہو گئی تو اب غور فرمائیے کہ روٹی کپڑے، مکان اور علاج کے سوا اس کے اور کون سے حقوق بنتے ہیں؟ اشتراکی ممالک اگر صرف انہی مادی حقوق کی ضمانت دیتے ہیں اور اخلاقی اقدار پر مبنی کسی دوسرے حق کو تسلیم نہیں کرتے تو یہ ان کے نظریہ حیات کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ وہ جب تک انسان کے بارے میں اپنا نقطہ نظر تبدیل نہ کریں ان سے بنیادی حقوق کے دائرہ کو وسعت دینے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

○

کتبِ حوالہ

1. Gough J. W. "The Social . Contract" Clarendon Press Oxford. (1967) p. 4

2. Ilyas Ahmad. "The Social Contract And the Islamic State" Urdu publishing House Allahabad (1944) p. 1.

3. Gaius Ezejiofor "Protection of Human Right under The Law" London (1964) p. 3

4. Gough J. W. "The Social Contract p. 6.

5. Ibid. p. 248

6. Ibid. p. 244

7. Ibid. p. 250

8. Ilyas Ahmad "Sovereignty-Islamic and Modern" The Allies Book Corporation, Karachi.

9. Vyshinsky. Andrie. Y. "The Law of the oviet State". The Macmillan Co. New York. (1948) p. 555

10. Dewey Robert, E. "Freedom" The Macmillan Co. London (1970) p. 347

11. Sorokin Pitirim A. "The Crisis of our Age". E.P. Duttan & Co. Newyork (1951) p. 229

12. Encycl, Britannica. "15th Ed" Vol. 16. p. 71.

13. Vyshinsky Andrie. Y. "The Law of the Soviet State" (1948) p. 74

14. Grigorian. L. & Dolgopolory. "Fundamentals of Soviet State Law" Progressive Publishers Moscow (1971) p. 1950

15. Kernig. C. D. 'Marxism Communism & Western Society" Herder and Herder. Newyork (1972) p. 63

16. Vyshinsky Andrie. Y. "The Law of the Soviet State" (1943) p. 617

17. Marx & Engels "Selected Correspondence" Progressive Publishers. Moscow (1965) p. 423

بنیادی حقوق کے تحفّظات

جمہوری اور اشتراکی ممالک کے تصورِ حقوق کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ بنیادی حقوق کے عملی نفاذ کے لیے ان ممالک نے جو تحفظات (Protections) فراہم کیے ہیں وہ فرد کو ریاست کے جبر و ستم سے محفوظ رکھنے میں فی الحقیقت کہاں تک مؤثر و کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

مغرب کے نظامِ قانون و سیاست میں ان حقوق کا سب سے بڑا محافظ دستور کو قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان کے عملی نفاذ کی واحد صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ ان حقوق کو دستور میں شامل کر کے عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول بنا دیا جائے۔ یہ انتظام بظاہر بڑا مستحکم نظر آتا ہے اور بعض مغربی ممالک بالخصوص برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں اس پر خوش اسلوبی سے عمل بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک اسی دستوری انتظامِ حکومت پر کاربند ہیں اور عوام اپنے بنیادی حقوق کے سلسلہ میں دستور کی مقدس ترین قانونی دستاویز کو اپنا واحد سہارا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب ہم مختلف ممالک کے دساتیر کا تجزیہ اور ان ممالک میں رونما ہونے والے واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس دستور کو بنیادی حقوق کا سب سے بڑا محافظ سمجھا جا رہا ہے وہ تو خود ہی حکومت کی دستبرد سے محفوظ نہیں ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کو چھوڑ کر، جن کے تحریری اور غیر تحریری دستور پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے آپ دنیا کا کوئی بھی دستور اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس کے قلب میں آپ کو "دستوری ترمیمات" کا ایک پورا باب رکھا ہوا ملے گا جس کے ذریعہ حکمران پارٹی

کو مطلوبہ اکثریت اور مقررہ طریقۂ کار کے ذریعہ دستور میں حسبِ منشاء ترمیمات کرنے اور اسے اپنی خواہشات و ضروریات کے مطابق ڈھال لینے کی کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ دستور جو بالعموم کسی اکثریتی پارٹی کے ہاتھوں یا اس کے زیرِ اثر تیار ہوتے ہیں اس پارٹی کو آمرانہ انداز میں حکومت کرنے کے لیے بے لگام اور لامحدود اختیارات سے لیس کر دیتے ہیں۔ یوں دستور سازی کے ابتدائی مرحلے ہی میں دستور کے استحکام کی ساری چولیں ڈھیلی کرنے کا اہتمام کر لیا جاتا ہے۔ ڈورو تھی پکلز نے اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دساتیر، سیاست دانوں کے وضع کردہ ہوتے ہیں۔ جو اپنی پارٹی کے نظریات و رجحانات سے وفاداری کے پابند ہوتے ہیں اور بعض اوقات مخلوط حکومتوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا بھی لحاظ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔" [۱]

دستوری حکومت کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ حکمرانوں کے اختیارات کا دائرہ متعین کر کے انہیں اس کا پابند کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے طے شدہ اختیارات سے تجاوز کریں تو عدلیہ کے ذریعہ انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا جاتا ہے۔ لیکن، ہم دیکھتے ہیں کہ عملی صورت اس کے بالکل برعکس ہے وہ عدلیہ جسے حکمرانوں کو قابو میں رکھنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے خود انہی حکمرانوں اور سیاست دانوں کے وضع کردہ دستور اور ان کے عطا کردہ اختیارات کے تحت کام کرتی ہے۔ ان کے اپنے اختیارات کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہی دستور جس کی تیاری میں اس کا اپنا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور جو حکمرانوں کے ہاتھوں ترمیم و تنسیخ اور تحدید و تعطل کے ذریعہ مسلسل تختۂ مشق بنا رہتا ہے، جو دستور حکمرانوں کے اختیارات پر پابندی کے سوا اپنا کوئی اور مقصدِ وجود نہیں رکھتا وہ اس سے حسبِ منشاء اختیارات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بعض دفعات میں ترمیم، بعض نئی دفعات کی شمولیت، بعض کی تنسیخ، ہنگامی حالت کے اعلان اور اس کے تحت حاصل شدہ اختیارات کے استعمال، بنیادی حقوق سے متعلقہ دفعات کے تعطل اور پھر نئے قوانین کے مؤثر بہ ماضی اطلاق کی صورت میں اپنے لیے ہر طرزِ عمل کی راہ نکال لیتے ہیں۔ عدلیہ، جس کے اختیارات دستور میں کی جانے والی ترمیم و تنسیخ کے ذریعہ

مسلسل تغیر پذیر رہتے ہیں، حکمرانوں کی اِن من مانی کارروائیوں میں کہیں آڑے نہیں آتی۔ کیونکہ مقننہ (Lagislature) کو اس پر بالادستی حاصل ہے۔ اور اس مقننہ پر اپنی اکثریت کے ذریعہ حکمران پارٹی کی بالادستی قائم ہے۔ پاکستان کے سپریم کورٹ نے ریاست بنام ضیاء الرحمٰن کے مقدمہ میں عدلیہ کے دائرہ اختیار کی وضاحت کرتے ہوتے اپنے فیصلے میں لکھا ہے:

"جہاں یہ بات درست ہے کہ عدالتی اختیارات سلب نہیں کیے جاسکتے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو قیام انصاف کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے ان کے دائرہ اختیار کو قانوناً دستور ہی میں متعین کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ دستور کا کام ہے کہ وہ بتائے کہ ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار کیا ہوگا اور سپریم کورٹ کا کیا۔ اسی طرح دستور ہی یہ صراحت کرسکتا ہے کہ مقدمات کی کون سی قسمیں ہیں جن کا فیصلہ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کی بجائے ٹربیونل میں ہوگا۔ اختیارات کے درمیان اس طرح کی حد بندی پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسی نوعیت کی حد بندی موجود نہ ہو تو انتشار پیدا ہوگا۔ کیونکہ کسی کو یہ علم نہ ہوگا کہ اس کے متعلقہ اختیارات کی متعین حدود کیا ہیں۔" ۲؎

اب ظاہر ہے کہ ان حدود کا تعین قانون سازوں اور بہ الفاظِ دیگر حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لیے عدالتیں انہی اختیارات کے مطابق کام کرنے کی پابند ہیں جو حکمران انہیں عطا کردیں۔ یہ اسی تلخ حقیقت کا نتیجہ ہے کہ حکمرانوں کی وہ ساری کارروائیاں جو دستور کی روح اور اس کے بنیادی ڈھانچے کو بالکل مسخ کردیتی ہیں۔ عین مطابق دستور قرار پاتی ہیں۔ کیونکہ ان کارروائیوں کے لیے وہ دستور میں ترمیم کرکے قانونی جواز پیدا کرلیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک ایسا اقدام جو کل تک ناجائز اور غیر قانونی تھا آج محض دستوری ترمیم کے باعث جائز اور قانونی بن جاتا ہے۔ اس تبدیلی میں کوئی اخلاقی اصول یا عدل و انصاف کا کوئی معروف ضابطہ کہیں حائل نہیں ہوتا۔ عدالت محض قانونِ موضوعہ کی پابند ہے کسی اخلاقی ضابطہ کی نہیں۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ایف بی علی

اور کرنل (ریٹائرڈ) عبدالعلیم آفریدی کے مقدمہ میں اپنا فیصلہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

" یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ آرڈیننسوں کو قانون کی حیثیت ہی حاصل نہیں ہے اس لیے کہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شہری کو بلا وجہ عدالتی سماعت کے حق تک سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن یہ عمومی کلیہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں قانون کی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا عام طور پر تسلیم شدہ مفہوم کی رو سے اس کا مطلب قانونِ موضوعہ ہے۔ یعنی قانون دینے والے کی خواہش اور مرضی کا رسمی اعلان۔ ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے کہ قانون کی حیثیت اختیار کرنے کے لیے قانون کا دلیل یا اخلاق پر مبنی ہونا بھی ضروری ہے۔ عدالتیں اس طرح کے کسی اعلیٰ اخلاقی اصول کی وجہ سے قانون کو مسترد نہیں کر سکتیں۔ اور نہ قانون کے فلسفیانہ تصورات کی بنیاد پر عدالتیں کارروائی کر سکتی ہیں جیسا کہ عدالت اس سے پہلے اسماء جیلانی کے مقدمے میں وضاحت کر چکی ہے۔ ان وجوہ و اسباب کی بنا پر فاضل چیف جسٹس جنہوں نے اصل فیصلہ لکھا ہے یہ قبول کرنے سے قاصر ہیں کہ جن آرڈیننسوں کے خلاف دلائل دیئے گئے ہیں وہ آرڈیننس قانون نہیں تھے اور اس لیے بنیادی حق نمبر۱ کے منافی تھے۔" ع۳

اب جہاں قانونِ موضوعہ کو یہ بالادستی حاصل ہو اور خود قانون ــــ قانون دینے والے کی خواہش اور مرضی کا رسمی اعلان ہو، وہاں عدالتیں شہریوں کو صرف اتنا ہی تحفظ فراہم کر سکتی ہیں جتنا تحفظ فراہم کرنے کی اجازت انہیں مروجہ دستور کی طے کردہ حدودِ اختیارات اور حکمرانوں کے جاری کردہ قوانین نے دی ہو۔ ان قوانین کے جائز اور ناجائز ہونے کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوتے اسماء جیلانی کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس حمود الرحمٰن اپنے فیصلے میں کہتے ہیں:۔

" اگر قانون کی کوئی تعریف ضروری ہے تو جہاں تک ایک جج کا تعلق ہے اسے صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جس قانون کے نفاذ کا اس سے مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ ایسے

فرد یا اتھارٹی کا وضع کردہ ہے جو قوانین بنانے کا قانوناً مجاز ہے اور یہ کہ وہ قانونی مشنری کے ذریعہ قابلِ نفاذ ہے۔ میری رائے میں اس تعریف کے اندر قانون کا جواز اور اس کے موثرات دونوں آجاتے ہیں۔"[۱۲]

تشکیلِ دستور اور قانون سازی میں حکمرانوں کی بالاتر حیثیت اور انہی کے ہاتھوں عدلیہ کے دائرہ اختیار دسماعت کی حدود کے تعین سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ واضعینِ دستور و قانون پر محافظینِ قانون (عدلیہ) کی گرفت فی الواقع کتنی مضبوط ہے۔ ۱۹۷۵ء کی آخری ششماہی میں بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان میں بنیادی حقوق سے متعلق دستوری دفعات کا جو حشر ہوا ہے وہ ان حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں عدلیہ کی بے اختیاری و بے بسی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ بنگلہ دیش میں مجیب نے ایک پارٹی کی آمریت قائم کی، مخالف جماعتوں پر پابندی لگائی، ان کے رہنماؤں کو جیلوں میں ڈالا، پریس کی آزادی سلب کی، اسمبلیوں کو عضوِ معطل بنایا اور عدلیہ کو متعلقہ اختیارات سے محروم کر کے بنیادی حقوق کے نفاذ کے معاملہ میں غیر مؤثر بنا دیا تو یہ سب کچھ دستور کے مطابق قرار پایا۔ بھارت میں اندرا گاندھی نے انتخابات میں دھاندلی کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنے کے جرم کی سزا سے بچنے کے لیے عدالتی فیصلہ کو ناکام بنانا چاہا تو پارلیمینٹ میں حکمران جماعت کی اکثریت نے دستور میں ترمیمات کر کے انہیں تحفظ مہیا کر دیا۔ عدلیہ کا اختیارِ سماعت واپس لے لیا گیا۔ مخالف پارٹیوں پر پابندی عائد ہوئی، اندرا کے انتخابی حریف اور ہائیکورٹ میں مقدمہ جیتنے والے فریق راج نرائن اور ان کے ہمنوا تمام سیاسی رہنما جیل میں ٹھونس دیئے گئے، ہنگامی حالت کا اعلان کر کے تمام بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے اور ان ساری کارروائیوں پر چیخ پکار کرنے والے اخبارات کا گلا گھونٹ کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اندرا کے وکیل سٹرایے۔ کے۔ سین نے ملک کی سب سے بڑی لیکن محرومِ اختیار عدالت، سپریم کورٹ میں کھڑے ہو کر کہا:

"آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا تصور خیالی ہے اور اسے آئین کا بنیادی جزو نہیں کہا جا سکتا۔ عدالتیں یہ فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہیں کہ انتخابات آزادانہ بنیاد پر کرائے

گئے یا نہیں" ۵؎

یہ سارا کھیل بھی دستور کے تحت اور اس کے عطا کردہ اختیارات کے مطابق کھیلا گیا۔ اس لیے سپریم کورٹ نے جو ترمیم شدہ دستور ہی کے تحت فیصلہ کرنے کی پابندی تھی، اندرا کو ان تمام جرائم سے بری کر دیا جو غیر ترمیم شدہ دستور کے تحت ہائی کورٹ نے ان پر عائد کیے تھے اور انہیں سزا بھی دی تھی۔

ہمارے اپنے ملک پاکستان میں، جہاں اب چوتھا دستور نافذ ہے، نفاذِ دستور کے ساتھ ہی ہنگامی حالت کے تحت بنیادی حقوق معطل کر دیتے گئے۔ بعدازاں ایک آرڈی ننس جاری کر کے پھر دستور میں چوتھی اور پانچویں ترمیم کے ذریعہ انہیں محدود کر دیا گیا ہنگامی حالت کا اعلان، آرڈی ننسوں کا اجراء اور دستور میں ترمیمات کا سلسلہ بھی چونکہ خود دستور ہی کے بخشے ہوئے اختیارات کے تحت تھا۔ اس لیے یہ سارا کام عین مطابقِ دستور ٹھہرا۔ اور یہ مطابقِ دستور ہونا ایک ایسی صفت ہے جو حکمرانوں کو کم از کم قانون اور عدالت کی نگاہ میں کسی ارتکابِ جرم کا مجرم نہیں ٹھہراتی۔

یہی صورتِ حال ایشیاء اور افریقہ اور جنوبی امریکہ کے اُن دوسرے ممالک میں بھی ہے جہاں دستور، بنیادی حقوق کا محافظ بننے کی بجائے حکمرانوں کے آمرانہ اقتدار کا محافظ، ان کے ظالمانہ اقدامات کا پشت پناہ اور ان کے لیے لامحدود اختیارات کے حصول کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے سی۔ ڈی۔ کرننگ کہتے ہیں :۔

"جہاں تک بیسویں صدی میں بنیادی حقوق کے تحفظ کا سوال ہے خود عوام کے منتخب نمائندوں نے اس سلسلہ میں اپنے آپ کو ناقابلِ اعتماد ثابت کر دیا ہے۔ عموماً یہ ہوتا رہا ہے کہ اکثریتی پارٹیوں نے نہ صرف دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کو تبدیل کر ڈالا بلکہ پورا دستور ہی بدل دیا" ۶؎

دُنیا کا ہر دستور ترمیمات کی کھلی چھوٹ دینے کے ساتھ ساتھ "ہنگامی حالت" کے زیرِ عنوان جو اختیارات حکمرانوں کو عطا کرتا ہے وہ رہی سہی کسر پوری کر دیتے ہیں۔ ہنگامی حالت کے لیے

معروضی حالات کا ہونا لازمی نہیں حکمران اپنی صوابدید پر جب چاہیں اس کا اعلان کر سکتے ہیں اور یہ اعلان ہوتے ہی دستور انہیں اپنی پابندی سے یکسر آزاد کر دیتا ہے۔ وہ دستور کی موجودگی میں مارشل لاء نافذ کر سکتے ہیں، عدلیہ کو تمام اختیارات سے اور عوام کو تمام بنیادی حقوق سے محروم کر سکتے ہیں۔ ملک کا دستور اور قانون کہیں ان کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔

دستور کی ان خامیوں اور حکمرانوں کے سامنے اس کی بے بسی سے بڑھ کر خود اس کے وجود و بقاء کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے اور ہم پاکستانی اس کا بڑا تلخ تجربہ رکھتے ہیں کہ حکومتوں کی تبدیلی، داخلی انقلاب، فوجی بغاوت، بیرونی جارحیت اور سیاسی جماعتوں کے ناقابلِ مصالحت اختلافات، دستور کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ ہر جانے والے کے ساتھ اس کا نافذ کردہ دستور بھی داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ اور ہر آنے والا ایک نیا مسودہ دستور لیے نمودار ہوتا ہے۔ اور اس کی قوتِ اقتدار اب نئے دستور کو وہی قانونی حیثیت عطا کر دیتی ہے جو اس کے پیشرو کے عہد میں اس کے دستور کو حاصل تھی۔ اسماء جیلانی کیس کے فیصلے میں بین الاقوامی قانون کا حوالہ دیتے ہوئے سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس لکھتے ہیں:۔

"بین الاقوامی قانون کی رو سے انقلابی حکومت اور نیا دستور، ریاست کی ایک قانونی حکومت اور ایک جائز دستور ہیں۔ اس لیے ایک فاتح انقلاب یا ایک کامیاب بغاوت، دستور میں تبدیلی کا بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ طریقہ ہیں۔"[۷]

واقعاتی شہادت اور اس بین الاقوامی قانون سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دستور اپنی تمام تر بلند و بالا حیثیت کے باوجود کس قدر کمزور، غیر یقینی، بے ثبات اور ناپائیدار قانونی دستاویز ہے۔

جب اس کے اپنے وجود کی کوئی مضبوط ضمانت موجود نہیں ہے تو ہم ان بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے اس پر کتنا اعتماد کر سکتے ہیں جو خود اسی کا ایک جزو ہیں۔ جو دستور مسلسل انتقال پذیر رہتا ہو وہ ناقابلِ انتقال اور غیر منفک (Inalienable) حقوق کا محافظ کیسے بن سکتا ہے؟

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بنیادی حقوق کے بارے میں غیر منفک ہونے کا

دعویٰ درست نہیں ہے۔ ان حقوق کے تعین اور ان کے نفاذ کا واحد ذریعہ دستور ہے، دستور کے بغیر ان حقوق کی کوئی قانونی بنیاد باقی نہیں رہتی اور دستور ایک ایسی کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور حکومت کی گرفت میں رہتی ہے کبھی اس میں ترمیم ہوتی ہے، کبھی تنسیخ، کبھی کوئی اضافہ ہوتا ہے اور کبھی کچھ حصے معطل کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی یہ جانے والے حکمرانوں کے ساتھ خود بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ ان مختلف کیفیات میں بنیادی حقوق کبھی دستور میں شمولیت کی راہ پا لیتے ہیں۔ کبھی محدود ہو جاتے ہیں، کبھی تعطل کا شکار ہوتے ہیں اور کبھی منسوخ شدہ دستور کے ساتھ خود بھی منسوخ ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ کسی ملک کے عوام کو میسر بھی ہوں تو تعبیرات کے پھندے میں پھنس کر غیر موثر ہو جاتے ہیں۔ اصولی طور پر یہ عام قانون سے ماوراء ہوتے ہیں لیکن ان کا نفاذ ہمیشہ "قانون کے مطابق" ہوتا ہے، اور دستور کے اندر ہی انہیں "اگر، مگر بشرطیکہ، اِلّا یہ کہ" اور اسی طرح کے دوسرے سابقوں اور لاحقوں سے گھیر کر پابندِ قانون بنا دیا جاتا ہے۔ اور یہ قانون حکمرانوں کی مرضی کے مطابق استعمال ہوتا ہے۔ سی۔ ڈی، کرنگ لکھتے ہیں :-

"بنیادی حقوق کی جڑیں گو جدید دساتیر کے مسودوں میں پیوست ہوتی ہیں لیکن یہ ہمیشہ "قانون کے مطابق تعبیر" کی زد میں رہتے ہیں حالانکہ اپنی روح کے اعتبار سے یہ ناقابلِ مداخلت (Inviolable) سمجھے جاتے ہیں۔" عشہ

یہ اسی پابندیٔ قانون کا کرشمہ ہے کہ جن بنیادی حقوق کو دستور "غیر منفک" اور "ناقابلِ مداخلت" قرار دیتا ہے انہیں کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی نافذ کردہ دفعہ ۱۴۴ معطل کر دیتی ہے۔ اور اس صورت میں دستور متاثرہ شہریوں کی کوئی مدد کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

دستور کی اس بے بسی اور اس کی بے ثباتی سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ "بنیادی حقوق" کا کوئی قابلِ اعتماد محافظ نہیں ہے اور نہ اس کی عطا کردہ ضمانت کی بنیاد پر ان حقوق کو "ناقابلِ مداخلت" سمجھنے کی کوئی گنجائش موجود ہے۔

دنیا میں دستور کے نفاذ کی عمومی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اب برطانیہ اور امریکہ کے

ان دساتیر پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے جو جمہوریت کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور بظاہر ان کے نفاذ کی شکل بھی خاصی اطمینان بخش نظر آتی ہے۔

برطانیہ میں سرے سے کوئی تحریری دستور ہی نافذ نہیں ہے۔ اس لیے وہاں دوسرے ممالک کی طرح بنیادی حقوق کو آئینی تحفظ حاصل نہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ اس کے اختیاراتِ قانون سازی پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ ملک کی کوئی عدالت اس کے منظور کردہ قانون کو منسوخ کر سکتی ہے اور نہ اس کے نفاذ کو روک سکتی ہے۔ وہاں بنیادی حقوق کا محافظ ملک کا عام قانون ہے اور ان کے حصول کے لیے عام عدالتوں ہی سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تحریری دستور نہ ہونے کے باوجود برطانیہ کے شہری بنیادی حقوق کے معاملہ میں دنیا کے دوسرے ممالک کے شہریوں سے بہتر پوزیشن کے حامل ہیں۔ اسی لیے جیننگز بڑے فخر سے کہتا ہے:

"برطانیہ میں کوئی قانونِ حقوق نہیں ہے۔ ہم صرف قانون کے مطابق آزادی کا حق رکھتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے، جس پر میں پختہ یقین رکھتا ہوں، کہ ہمارا کام کسی بھی ایسے ملک کے مقابلے میں بہت اچھی طرح چل رہا ہے جہاں قانونِ حقوق یا کوئی منشورِ انسانی حقوق موجود ہے۔" ؏۹

لیکن یہ اظہارِ اطمینان اب رفتہ رفتہ رخصت ہو رہا ہے۔ اور برطانیہ کے ماہرینِ قانون بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک تحریری دستور کی ضرورت پر شدت سے زور دے رہے ہیں۔ اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے تھامس پین کو ہوا تھا جس نے ۱۷۹۱ء میں اپنی کتاب "حقوقِ انسانی" میں بڑے طنزیہ انداز میں لکھا تھا:

"بلند بانگ برطانوی دستور سراسر فراڈ ہے۔ اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ایک رکن اُٹھ کر کہتا ہے دستور یہ ہے، دوسرا کہتا ہے نہیں دستور یہ ہے۔ آج یہ ایک شئے ہے کل دوسری شئے اور اس پر بحث جاری رکھی جائے تو آخر میں ثابت یہ ہوتا ہے کہ اس کا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں۔" ؏۱۰

برطانیہ کے موقر جریدے "اکنامسٹ" (Economist) نے اپنی ۸ نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں بنیادی حقوق سے متعلق تازہ ترین سروے رپورٹ میں لکھا ہے :-

" آج سے ۲۰ برس پہلے یہ دعویٰ کہ " بنیادی حقوق کے معاملہ میں برطانیہ سب سے بہتر ہے " بڑا محکم نظر آتا تھا۔ اس کے حامی آج بھی یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ پارلیمنٹ نے اسقاط، طلاق اور نسلی امتیاز سے متعلق اصلاحی قوانین منظور کرتے وقت شہری آزادیوں کے لحاظ کا اچھا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ لیکن اب قدامت پسند حقِ ملکیت کی تحدید اور یونینوں کی رکنیت پر پابندی کی مثال دیں گے۔ اور لیبر پارٹی کے حامی اسی طرح قدامت پسندوں کے منظور کردہ قانون تارکینِ وطن کے موثر بہ ماضی اطلاق اور ہڑتال کے حق پر ان کے صنعتی تعلقات ایکٹ کی عائد کردہ پابندی کی مثال پیش کریں گے۔

علاوہ ازیں کچھ دوسرے پہلو بھی موجود ہیں جن میں ملک کا قانون، بین الاقوامی قانون بلکہ یورپی کنونشن برائے انسانی حقوق کے عام اصولوں سے بھی متصادم ہے، اس کی ایک مثال تو قانونِ انسدادِ دہشت گردی کے تحت مشتبہ لوگوں کی امتناعی نظر بندی کا اختیار ہے۔ یہ قانون پارلیمنٹ نے نومبر ۱۹۷۴ء میں منظور کیا ہے۔" (صفحہ نمبر ۲۴)

اس رپورٹ کے مطابق لبرل رکن پارلیمنٹ ایلن بیتھ Allen Beit نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا ہے۔ جس کا مقصد اس تکلیف دہ حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ برطانیہ نے ۲۵ سال قبل یورپی کنونشن برائے انسانی حقوق کی جس دستاویز پر دستخط کیے تھے وہ آج تک برطانوی قانون کا حصہ نہیں بن سکی۔

برطانیہ میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان طویل کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہاں بادشاہ تو بالکل بے اختیار بنا دیا گیا لیکن اس کی جگہ پارلیمنٹ آمرِ مطلق بن بیٹھی کیونکہ اس کے اختیاراتِ قانون سازی پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ جبکہ دستور کا مقصد ہی حکمرانوں کے اختیارات کی حد بندی ہے۔ آج اسی پہلو پر سب سے زیادہ تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔" اکنامسٹ "

برطانیہ میں بنیادی حقوق کے مسئلہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک قانونِ حقوق منظور کیا جاسکتا ہے اور اس کے تحفظ کے لیے آئینی عدالت بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ جو کسی قانون کو بنیادی حقوق کے منافی قرار دینے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ لیکن اصل مشکل تو یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ اس اختیار کے باوجود کوئی غیر آئینی قانون منظور کر لیتی ہے تو عدالت بیچاری کر کیا سکتی ہے؟ کیا وہ پارلیمنٹ کے خلاف اپنے فیصلے کو نافذ کر سکے گی؟ وہ زیادہ سے زیادہ کسی قانون کو غیر آئینی قرار دے سکتی ہے لیکن پارلیمنٹ کی بالادستی کی مضبوط روایت کے قوی ہیکل دیو کو ہلاک کرنا آسان نہیں۔" (صفحہ ۲۵)۔

تجزیہ نگار بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ :۔

"کسی اطمینان بخش قانونِ حقوق (Bill of Rights) کا انحصار سیاسی نظام اور بالخصوص انتخابی نظام، اس کے ذریعہ ابھرنے والے حریفانہ گروہ بندی کے اثرات اور حکومت و پارلیمنٹ کے باہمی تعلق پر مرتب ہونے والے اثرات کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ بہ الفاظِ دیگر کسی قانونِ حقوق سے پہلے ایک آئینی دستاویز کی ضرورت ہوگی۔" (صفحہ ۲۵)

اس رپورٹ میں رائے عامہ کے عمومی رجحان پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۰ء سے شروع ہونے والے عشرہ میں قانونِ حقوق کے مطالبہ کی مہم زور پکڑتی جا رہی ہے اور ۱۹۷۴ء سے اس میں بڑی شدت آگئی ہے۔ وزارتِ داخلہ اب دوسرے سرکاری محکموں سے یہ صلاح مشورہ کر رہی ہے کہ آیا برطانیہ میں اس قسم کا قانون قابلِ عمل اور پسندیدہ ہوگا؟

برطانیہ کو چونکہ جمہوریت کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے اور ہم پاکستانیوں سمیت دنیا کے بیشتر ممالک، جہاں پارلیمانی نظام حکومت رائج ہے، اسی کا اتباع کرتے ہیں اس لیے مناسب ہو گا کہ ہم مطالبہ قانونِ حقوق کی اس مہم کے سرکردہ کی آراء پر بھی ایک نظر ڈال لیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو کہ خود اہلِ برطانیہ اب اپنے دستور کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

معروف قانون داں، ڈی۔ ڈبلیو۔ ہینن (D. W. Hanson) بنیادی حقوق کے منشورِ

اعظم "میگنا کارٹا" کے حوالے سے پارلیمنٹ کی بالادستی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"قانونی نقطہ نظر سے اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ بیرنز (Barons) نے اپنے مخالفانہ سیاسی کردار کو عام قانون کے اصول کی راہ پر نہیں ڈالا۔ اس کے برعکس انہوں نے ایک ایسی راہ اختیار کی جس کے نتیجے میں پارلیمنٹ کے اندر امراء اور عام ارکان کے درمیان سیاسی سمجھوتہ وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ دوہری بادشاہت (Double Majesty) کا مسئلہ حل کرنے کے لیے جو سترہویں صدی میں شدت سے ابھرا تھا، قانون کی بالادستی کی بجائے پارلیمنٹ کی بالادستی کا نظریہ اپنا لیا گیا۔" ع۱۱۔

پارلیمنٹ کی اس بالادستی نے بنیادی حقوق کو دستوری تحفظ سے محروم کر کے محض روایات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ مشہور ماہر قانون، سابق جج اور برمنگھم یونیورسٹی کے کلیہ قانون کے سربراہ پروفیسر ہڈ فلپس لکھتے ہیں :

"عام مفہوم کے اعتبار سے برطانوی دستور میں بنیادی حقوق کا کوئی وجود نہیں، انفرادی آزادی سے متعلق اصول کو پارلیمنٹ ایک معمولی قانون کے ذریعہ تبدیل کر سکتی ہے۔ اور پارلیمنٹ ان حقوق کو جو بہت سے دساتیر میں بنیادی قرار دیئے گئے ہیں۔ کہاں تک محدود یا منسوخ کر سکتی ہے اس کی کوئی قانونی حد نہیں۔" ع۱۲

وہ اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کی کارگزاری کی مثالیں پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر قانون دفاع سلطنت (Defence of the realm Act) اور دوسری جنگ عظیم میں قانون ہنگامی اختیارات (دفاع) مجریہ ۱۹۳۵ء (Emergency Powers Defence Act) منظور کر کے پارلیمنٹ نے حکومت کو قومی دفاع اور معیشت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لینے والے اتنے وسیع اختیارات سونپ دیئے جن کی پارلیمانی تاریخ میں نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ بعد ازاں ۱۹۴۰ء میں ایک اور ایکٹ منظور ہوا جس نے دونوں ایوانوں میں بحث و خواندگی اور شاہی منظوری کے تمام مراحل ایک ہی دن میں طے کر لیے۔ اس ایکٹ کے

ذریعہ شہریوں کو اپنی جان، املاک اور خدمات ہز مجسٹی کے حوالے کر دینے کا پابند بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں حالتِ امن کے دوران حکومت کو ہنگامی اختیارات بخشنے کیلئے ایک ایکٹ منظور کیا گیا جس کے تحت ذہنی انتشار و افراتفری کے دوران ہنگامی حالت کا اعلان کر کے شہری آزادیاں معطل کی جا سکتی ہیں۔ اس قانون کو بندرگاہوں کے مزدوروں، ٹرانسپورٹ اور بجلی گھروں کے ملازمین کی ہڑتال کے موقع پر کئی بار استعمال کیا جا چکا ہے۔

پروفیسر فلپس پارلیمنٹ کی بالادستی پر اصرار اور تحریری دستور سے انکار کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"سیاسی کھیل میں یہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں ہی کے لیے فائدہ مند ہے۔ آج اس کے ذریعہ موجودہ وزیر اعظم کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں، کل یہ حزبِ اختلاف کے لیڈر کو منتقل ہو جائیں گے۔ جب کہ عام شہری یا تو بے تعلق ہیں یا لاعلم" ۱۳

وہ برطانوی دستور کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔

"ایک تحریری دستور، جس میں عدلیہ کو بالادستی حاصل ہو، اس ملک کے لیے ضروری ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پارلیمنٹ کے اختیاراتِ قانون سازی کی کوئی حد نہیں ہے، پارلیمنٹ کی ساری سرگرمیوں کو عملاً حکومت ہی کنٹرول کرتی ہے۔ حکومت کا عرصہ اقتدار بہت طویل ہے، ایک ایسے ایوانِ بالا کی تشکیل، جسے مسودۂ قانون مسترد کر دینے یا کچھ عرصے روک لینے کا اختیار ہو، ناگزیر ہے، قانون اور اس پر عمل درآمد کے اہم شعبے غیر یقینی ہیں، پارلیمنٹ ایکٹ مجریہ ۱۹۴۹ء کی حیثیت مشتبہ ہے، وزیر اعظم کے ہاتھ میں بے پناہ اختیارات مرتکز ہو گئے ہیں۔ پارلیمنٹ کو توڑ دینے کے طریقہ کار کو باضابطہ بنانے کی ضرورت ہے، عدلیہ کے اختیارات اور ججوں کی ملازمت سے متعلق قوانین کو بہتر بنانا ہوگا اور ایک نیا قانون بنیادی حقوق وقت

کا تقاضا ہے۔" ع۱۴

برطانیہ کے ایک جج سر لیزلی اسکارمین اپنے ملک میں بنیادی حقوق کے احترام کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" برطانوی قانون میں انسانی حقوق کا کوئی مکمل ضابطہ موجود ہوتا تو کیا آپ کے خیال میں شمالی آئرلینڈ میں تفتیش کے جو انتہائی اذیت ناک طریقے اختیار کیے گئے ہیں وہ ممکن تھے ؟" ع۱۵

وہ قانونِ حقوق کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" اگر انسانی حقوق کو ہماری بین الاقوامی ذمہ داریوں کے مطابق تحفظ فراہم کیا جاتا ہے تو عام قانون سے ہٹ کر ہمیں کچھ دوسرے ذرائع تلاش کرنے ہوں گے۔ ایک ایسا نظامِ قانون جو مقننہ کے رحم و کرم پر ہو اور جس میں خود یہ مقننہ بھی چند استثنائی صورتوں کے سوا، انتظامیہ کے رحم و کرم پر ہو بنیادی حقوق کی یقینی ضمانت نہیں بن سکتا اور اسی وجہ سے محض قانون سازی کوئی تحفظ مہیا نہیں کرتی۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قانون، قانون سازی کا نگراں ہو۔ اس طرح بنیادی حقوق کی تحریک جواب محض ایک مہم نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی ذمہ داری کا معاملہ بن چکی ہے، ہمارے دستور کے عدم توازن کو پوری طرح عیاں کر دیتی ہے۔ اور ایک نئے دستوری بندوبست کی ضرورت ظاہر کرتی ہے۔ اب ایک قانونِ حقوق کے بغیر جو وقت کی حکومت کے کنٹرول میں کام کرنے والی پارلیمانی اکثریت کے ہاتھوں کسی تنسیخ، ترمیم اور تعطل سے محفوظ ہو بنیادی حقوق ہمیشہ خطرے سے دوچار رہیں گے۔" ع۱۶

جے۔ جے کریک ہنڈرسن، پارلیمنٹ کے اقتدارِ اعلیٰ کی قلعی کھولتے ہوئے کہتے ہیں :

" برطانیہ میں کسی مقتدرِ اعلیٰ پارلیمنٹ کا ذکر کرنے کی بجائے غالباً یہ کہنا زیادہ

مناسب ہوگا کہ یہاں ایک مقتدرِ اعلیٰ کابینہ ہے۔ جو ایوانِ زیریں میں اکثریتی پارٹی پر کنٹرول کے ذریعہ اپنے انتظامی اختیارات اور قانون سازی کے اختیارات استعمال کرتی ہے۔" ۱۷؎

وہ بنیادی حقوق کے سلسلہ میں موجودہ تحفظات پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اگر ہر شخص پر یہ اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ دستور کی خوبیوں اور روایات کا پورا پورا احترام کرے گا اور ہمیشہ دانش مندی ہی سے کام لے گا تو پھر مضبوط انتظامیہ اور لیسے لچک دار دستور سے بہتر کوئی چیز نہیں جو تمام اختیارات کابینہ کو سونپتا ہو لیکن بدقسمتی سے کوئی بھی اس امر کو یقینی نہیں سمجھتا اس لیے کچھ تحفظات کا فراہم کیا جانا ضروری ہے۔" ۱۸؎

برطانیہ میں بنیادی حقوق کے آئینی تحفظ کے لیے آج جو مہم چلائی جارہی ہے، ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر چارلس ہوورڈ میکلوین نے اس کی پیش گوئی ۱۹۴۷ء ہی میں کردی تھی۔ وہ فرماتے ہیں :-

"روایات کا امتناعی اثر جوں جوں کمزور پڑتا جارہا ہے، اکثریت کی آمریت کا خطرہ قریب تر آتا جارہا ہے۔ اور وہ وقت بھی دور نہیں جب اقلیت کے حقوق کے لیے رواج کی جگہ قانون کو لینی ہوگی۔ تاکہ انہیں وہی احترام و تحفظ حاصل ہو جو ماضی میں میسّر رہا ہے۔ پارلیمنٹ کو جو بالادستی آج قانون کی صورت میں حاصل ہے وہ اس کا عام طرزِ عمل بن گئی تو ایک بھیانک آمریت کا ابھر آنا ناگزیر ہے۔" ۱۹؎

اور آج یہ آمریت اہلِ برطانیہ کو صاف اُبھرتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ اسی لیے وہ تحریری دستور اور قانونِ حقوق کی مہم چلا رہے ہیں۔ تاکہ اس آمریت کا راستہ روکا جاتے

اور اسے عدلیہ کا تابع بنا کر قابو میں کیا جاتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ صرف برطانیہ ہی نہیں اس کی تمام نوآبادیات کنیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں کہیں بھی بنیادی حقوق کو آئینی تحفظ حاصل نہیں۔ کنیڈا میں ۱۹۶۰ء میں ایک قانونِ حقوق منظور ہوا، مگر یہ پارلیمنٹ کے اختیاراتِ قانون سازی پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اس میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ کوئی قانون اس کے منافی بھی ہو تو عدالتیں اس کے نفاذ کو نہیں روک سکیں گی۔ کنیڈا کے جسٹس بورا لاسکن (Bora Laskin) نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

"قانونِ حقوق صرف وزیرِ قانون کی رہنمائی کے لیے ہے تاکہ وہ قانون بنانے وقت اسے سامنے رکھ لیا کریں۔" ع۲۰

وزیرِ اعظم لیسٹر پیرسن (Lester Pearson) نے قانونِ حقوق کو دستور میں شامل کرانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ وزیرِ اعظم ٹروڈو (Trudeau) نے ۱۹۶۹ء میں اسے منظور تو کرا لیا لیکن اس کی حیثیت وہی ۱۹۶۰ء والی رہی۔ ۱۹۶۳ء میں نیوزی لینڈ کے اٹارنی جنرل جے آر ہینن (Hanan) نے قانونِ حقوق منظور کرانے کی کوشش کی مگر پارلیمنٹ نے اسے مسترد کر دیا۔ یہی صورتِ حال آسٹریلیا میں ہے۔

برطانیہ اور اس کی نوآبادیات کے شہری، بنیادی حقوق کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کے رحم و کرم پر ہیں۔ ان کا واحد سہارا روایات (Traditions) اور رواج (Custom) کا احترام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان روایات کے احترام کی جڑیں بہت گہری ہیں اور کوئی حکومت ان سے انحراف کی جرأت نہیں کرتی۔ لیکن پارلیمنٹ کی بالادستی اور عدلیہ کی بے اختیاری کے باعث بنیادی حقوق کے آئینی تحفظ کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے۔ سپریم کورٹ امریکہ کے جج ولیم او۔ ڈگلس کے بقول:

"برطانوی آئین دراصل "ضبطِ نفس" کی اس روایت کا نام ہے جس پر پارلیمنٹ کے ارکان اور برطانوی حکام کاربند چلے آرہے ہیں۔" ع۲۱

مگر برطانیہ کے جج صاحبان، ماہرینِ قانون اور عام شہری اب محض اس "ضبطِ نفس" کی روایت کو بنیادی حقوق کا کوئی قابلِ اعتماد محافظ نہیں سمجھتے کیونکہ یہ روایت ان حقوق کو معطل، منسوخ یا محدود ہونے سے نہیں روک سکتی۔ پارلیمنٹ جب چاہے انہیں ختم کر سکتی ہے اور اس صورت میں کہیں داد فریاد بھی نہیں ہو سکتی۔

برطانیہ کے بعد اب امریکہ کے دستور کا جائزہ لیجیے۔ یہ دستور اس لحاظ سے دنیا کا مثالی جمہوری دستور سمجھا جاتا ہے کہ اس میں عدلیہ کو بنیادی حقوق کا محافظ بنایا گیا ہے۔ اور اسے مقننہ پر بالادستی حاصل ہے۔ وہ کانگریس کے منظور کردہ قوانین کو منافیٔ دستور قرار دے کر منسوخ کر سکتی ہے اور ان کا نفاذ روک سکتی ہے۔ لیکن عدلیہ کی اس بالادستی کے باوجود داخلی بغاوت، شورش یا بیرونی حملے کی صورت میں انتظامیہ اور کانگریس کو وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ دستور کے آرٹیکل نمبر ا سیکشن ۹ اور دفعہ نمبر ۲ کے تحت ملک میں مارشل لاء لگایا جا سکتا ہے، بنیادی حقوق معطل کیے جا سکتے ہیں اور عدالتوں سے رٹ کی سماعت کا اختیار واپس لیا جا سکتا ہے۔ دلوبی (Willoughby) اس دفعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> "زمانۂ جنگ، داخلی شورش یا بدامنی کی حالت میں جب مارشل لاء نافذ کر دیا جائے تو ہائی کورٹ میں رٹ کا حق، اور شہری آزادی کی دوسری تمام ضمانتیں عارضی طور پر معطل کر دی جائیں گی۔" ؎۲۲

۱۹۵۴ء میں کانگریس نے قانونِ تحفظ (Immunity Act) منظور کیا۔ جس کے تحت بعض حالات میں کسی بھی شخص کو خود اپنے خلاف گواہی دینے پر مجبور نہ کیے جانے کے اس حق سے محروم کیا جا سکتا ہے جو دستور کی پانچویں ترمیم میں غیر مشروط طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی سال آزادیٔ اجتماع و تنظیم سازی کی آئینی ضمانتوں کے باوجود امریکہ میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کی گئی اور عدلیہ کی بالادستی، انتظامیہ کے اس فیصلے کو غیر آئینی قرار دے کر پارٹی کو بحال کرانے میں کوئی مدد نہ دے سکی۔

پروفیسر میکلوین امریکی دستور میں بنیادی حقوق کے تحفظ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"انسان کے وہ حقوق جو ہمیں بے حد عزیز ہیں مثلاً آزادیٔ افکار، آزادیٔ اظہار، ملزموں کی یکطرفہ نظر بندی اور ظالمانہ و ناروا سلوک سے تحفظ وغیرہ سب مستقل خطرہ سے دوچار ہیں۔ جب بھی "مصالح ریاست" (Reasons of State) کا تقاضا سامنے آتا ہے یہ ہمیشہ خطرے میں پڑتے نظر آتے ہیں۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ ہم اس وقت ان حقوق سے ہاتھ دھو لینے اور ان خطرات کو نظر انداز کر دینے کے خصوصی خطرہ سے دوچار ہیں۔" ع۲۳

ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنیادی حقوق امریکہ میں بھی غیر منفک نہیں ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ میں نظر آنے والی قدرے اطمینان بخش صورتِ حال کی اصل وجوہ کیا ہیں ڈورو تھی پکلز سے سنیئے :-

" دستوری نظام حکومت کے تحفظ کی واحد اور آخری صورت طویل عرصے تک دستور پر عمل درآمد ہے اور حالات ہمیشہ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بیرونی حملے، جنگ میں شکست اور ناقابل مصالحت گہرے سیاسی اختلافات، دستوری حکومت کے ارتقاء کو بہت مشکل بلکہ ناممکن بنا دیتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہیں کہ وہ طویل عرصے سے بیرونی حملوں سے نسبتاً محفوظ رہے ہیں اور داخلی عدم استحکام سے بھی انہیں نجات حاصل رہی ہے۔" ع۲۴

اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ میں بنیادی حقوق کا تحفظ ان کے دستور اور روایات سے زیادہ ان سازگار حالات کا مرہونِ منت ہے جو ان دونوں ملکوں کو میسر رہے ہیں۔ یہ حالات بدل جائیں اور ان ملکوں کو بھی دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح بیرونی حملوں یا داخلی خلفشار کا شکار ہونا پڑ جائے تو دستور اور روایات ان کے شہریوں کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ ان

دونوں ملکوں کے دستور کا استحکام ان کے مخصوص حالات اور تاریخی تسلسل پر مبنی ہے۔ اسی لیے جن ملکوں نے تاریخی پس منظر کو نظر انداز کر کے ایسے دستور کی نقل کی وہ کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے الٹے مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ لارڈ ڈایری اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جن دساتیر نے برطانوی دستور کی محض ظاہری شکل کو اختیار کیا، ان کے غیر مؤثر ہونے کا لازمی نتیجہ آمریت کے عروج اور یک جماعتی نظام کے تسلط کی صورت میں ظاہر ہوا ہے"۔ ع۲۵

فرانس کے ایک رکن اسمبلی کو برطانوی دستور کی نقل سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہوئے برک (Burke) اپنے خط میں لکھتا ہے:

"میں جب برطانوی دستور کو سراہتا ہوں اور اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ظاہری شکل اور اس کے تحت کیے گئے مثبت انتظامات آپ کے لیے یا دنیا کے کسی اور ملک کے لیے نمونہ بن جائیں، اور آپ ان کی ہو بہو نقل کرنے لگیں"۔ ع۲۶

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کے دستور بھی انسان کے بنیادی حقوق کے ناقابلِ انتقال ہونے کی ضمانت مہیا نہیں کرتے۔ اور اگر ان سے ان دونوں ملکوں کے عوام کو کچھ فائدہ پہنچ بھی رہا ہے تو وہ انہی تک محدود ہے، کوئی دوسرا ملک اُن کے دستور کو اپنے ہاں آزمانا چاہے تو نتیجہ آمریت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

اشتراکی ممالک کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ وہاں "معاشی حقوق" کے سوا کسی اور حق کا وجود نہیں ہے اور جو دوسرے حقوق دستور میں گنوائے گئے ہیں وہ عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول نہیں۔ اس لیے وہاں بنیادی حقوق کے تحفظ کا سرے سے کوئی مسئلہ ہی موجود نہیں۔ اشتراکی ریاست خود حقوق طے کرتی ہے۔ اور وہی ان کے نفاذ کی حدود متعین کرتی ہے، گویا وہ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ہے"۔ اس سے ماوراء نہ کوئی حق ہے اور نہ کسی حق کو

نافذ کرنے والی کوئی اتھارٹی۔

جمہوری اور اشتراکی ممالک کے دساتیر کا یہ جائزہ اس حقیقت کو عیاں کر دیتا ہے کہ دستور بنیادی حقوق کے تحفظ کی کوئی مضبوط ضمانت نہیں ہے۔ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ اس امر کا گواہ ہے کہ بنیادی حقوق کے تعین اور ان کے عملی نفاذ کے لیے ہم محض مسودہ دستور پر انحصار نہیں کر سکتے۔ ان دساتیر کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کی پشت پر کوئی قوت نافذہ (Sanction) موجود نہیں جو حکمرانوں کو ان کی عائد کردہ حدود کا پابند بنا سکے اور بنیادی حقوق کو دائمی تحفظ مہیا کر سکے۔

کتبِ حوالہ

1. Dorothy Pickles. "Democracy" Mathuen & Co. London. (1970) p. 101.

2. PLD 1973, Supreme Court, p. 49 : State, Vs. Ziaur Rehman, p. 62.

3. PLD. 1975, Supreme Court, p. 506. Re. : State Vs. F. B. Ali & Others, p. 527.28.

4. PLD. 1972. Supreme Court, p. 139. Re. Asma Jilani. Vs. Govt. of Punjab & Other, p. 159.

5. Daily "Jang" Karachi Oct. 4, 1975 p. 1 Col. 8.

6. Kemig C. D. "Marxism, Communism and Western Society," Newyork (1972) p. 58.

7. PLD. 1972, Supreme Court p. 139 Re. Asma Jilani, Vs. Govt. of Punjab & other, p. 153-54.

8. Kemig. C. D. (Marxism) Communism and Western Society p, 56.

9. Jennings, Sir. Ivor "Approach to self Government" Oxford London p. 20.

10. Fennessy R.R "Burke, Paine and the rights of man." Martiness Nijhaoff Hague. (1965) p. 179

11. Hanson. D.W. "From Kingdom to Common-Wealth" Princeton, London, (1970) p. 190.

12. Phillips, O. Hood. "Reform of the Constitution" London, (1970) p. 120.

13. Ibid p. 144.

14. Ibid p. 144.

15. Scarman, Sir, Leslie. "English Law-The New Dimensions." Stevens & Sons, London, (1974) p. 18.

16. Ibid. p. 69.

17. Henderson J. J. Craik. "Parliamant-A Survey— George Allen & Unwin London (1965) p. 89.

18. Ibid p. 98.

19. Mcllwain, Charle, Howard. "Constitutionalism." Great Seal Books, Newyork, (1947) p. 21

20. Phillips O. Hood, "Reform of the Constitution. p. 143.

21. Douglas, Willium. O. "Bunyadi Insani Haqooq Ka Masla (Urdu Translation) Lahore. (1965) p. 116

22. Willoughby W. "Principles of the Constitutional Law of the United States" Baker Voorthis & Co. New York (1938) p. 677.

23. Mcllwain Charles Howard, "Constitutionalism" p. 140.

24. Dorothy Pickles, "Democracy", London (1960) p. 113.

25. Amery L. S. "Thoughts on the Constitution" Oxford, (1956) p. 18.

26. Ibid p. 19.

منشورِ انسانی حقوق

قومی سطح پر بنیادی حقوق کے تحفظ میں دستور کی ناکامی کے بعد اب یہ دیکھتے کہ اس سلسلہ میں بین الاقوامی سطح پر جو انتظامات کیے گئے ہیں وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو انسانی حقوق سے متعلق جس عالمی منشور کا اعلان کیا تھا وہ گویا اس ضمن میں انسانی کوششوں کی معراج ہے یہ منشور ۳۰ دفعات پر مشتمل ہے جو حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور وقار و حقوق کے معاملہ میں مساوی الحیثیت ہیں۔

(۲) ہر فرد نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی یا دوسرے نظریات، قومی و سماجی حیثیت املاک، پیدائش یا کسی اور حیثیت اور کسی بھی قسم کے امتیاز کے بغیر اس منشور میں صراحت کردہ تمام حقوق اور آزادیوں کا مستحق ہو گا۔

(۳) ہر فرد کو زندہ رہنے، آزاد رہنے اور اپنی جان کی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہے۔

(۴) کسی بھی شخص کو نہ غلام بنایا جاتے گا اور نہ محکوم رکھا جاتے گا۔ غلامی اور غلاموں کی تجارت کی ہر شکل ممنوع ہو گی۔

(۵) کسی بھی شخص کو تشدد، ظلم و ستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جا سکے گا۔

(۶) ہر فرد کو قانون کی نظر میں بحیثیت فرد ایک تسلیم شدہ حیثیت حاصل ہوگی۔

(۷) قانون کی نگاہ میں سب کی حیثیت مساوی ہوگی اور انہیں کسی امتیاز کے بغیر یکساں قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔

(۸) ہر فرد کو آئین یا قانون کے ذریعہ ملنے والے بنیادی حقوق کے منافی قوانین کے خلاف با اختیار قومی ٹربیونل کے ذریعہ مؤثر چارہ جوئی کا حق حاصل ہوگا۔

(۹) کسی شخص کو بلا جواز گرفتاری، نظر بندی یا جلاوطنی کی سزا نہیں دی جا سکے گی۔

(۱۰) ہر شخص کو اپنے بنیادی حقوق و فرائض کے تعین یا اپنے خلاف عائد کردہ الزامات سے برأت کے لیے آزاد و خود مختار اور غیر جانبدار ٹربیونل میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا یکساں حق حاصل ہوگا۔

(۱۱)۔ ا۔ کسی تعزیری جرم کی صورت میں ہر فرد کو اس وقت تک بے قصور سمجھے جانے کا حق حاصل ہوگا جب تک ایسی کھلی عدالت میں اسے قانون کے مطابق مجرم ثابت نہ کر دیا جائے جہاں اسے اپنی صفائی کی تمام ضمانتیں فراہم کی گئی ہوں۔

۲۔ کسی فرد کو کسی ایسے ارادی یا غیر ارادی فعل کی بناء پر قابل تعزیر جرم کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا جو فی الواقع قومی یا بین الاقوامی قانون کے تحت قابلِ تعزیر نہ ہو۔

(۱۲) کسی فرد کی خلوت، گھریلو زندگی، خاندانی امور اور خط و کتابت میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے گا۔

(۱۳)۔ ا۔ ہر فرد کو اپنی حدود ریاست میں نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

۲۔ ہر فرد کو بیرون ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۴)۔ ا۔ ہر فرد کو ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے دوسرے ممالک میں پناہ لینے کا حق

حاصل ہوگا۔

۲۔ غیر سیاسی جرائم یا اقوام متحدہ کے اصول و مقاصد کے منافی اعمال کے سلسلہ میں مقدمات سے بچنے کے لیے یہ حق قابلِ استعمال نہیں ہوگا۔

(۱۵)۔ ا۔ ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

۲۔ کسی فرد کو بلا جواز اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا۔

(۱۶) ا۔ ہر بالغ مرد اور عورت کو بلا امتیاز نسل، شہریت یا عقیدہ شادی کرنے اور گھر بسانے کا حق حاصل ہوگا۔

۲۔ شادی زن و شوہر کی آزادانہ مرضی و منظوری سے ہوگی۔

۳۔ خاندان، معاشرہ کا بنیادی اور فطری یونٹ ہے جو ریاست اور معاشرہ کی طرف سے مکمل تحفظ کا مستحق ہے۔

(۱۷)۔ ا۔ ہر فرد کو تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہوگا۔

۲۔ کسی کو بلا جواز اس کی ملکیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

(۱۸)۔ ہر فرد کو فکر و خیال، ضمیر اور عقیدے کی آزادی حاصل ہوگی اور اس حق میں تبدیلیٔ عقیدہ، اظہارِ عقیدہ، تبلیغِ عقیدہ اور عبادت کا حق بھی شامل ہے۔

(۱۹)۔ ہر فرد کو آزادئ اظہارِ خیال کا حق حاصل ہے اور اس میں کسی مداخلت کے بغیر کوئی بھی رائے رکھنے، کسی بھی ذریعہ سے اور سرحدوں کا لحاظ کئے بغیر خیالات و معلومات حاصل کرنے اور پہنچانے کا حق بھی شامل ہے۔

(۲۰) ا۔ ہر فرد کو پُر امن اجتماع و تنظیم کا حق حاصل ہے۔

۲۔ کسی کو کسی خاص تنظیم سے وابستہ ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲۱) ا۔ ہر فرد کو اپنے ملک کی حکومت میں براہِ راست یا منتخب نمائندوں کے ذریعہ

شرکت کا حق ہے۔

۲۔ ہر فرد کو اپنے ملک کی سرکاری ملازمت کے حصول کا مساوی حق حاصل ہے۔

۳۔ حکومت کے اختیار کی اصل بنیاد عوام کی خواہش و مرضی ہوگی جس کا اظہار انتخابات کے ذریعہ آزادانہ رائے شماری اور خفیہ رائے دہی کی صورت میں ہوگا۔

(۲۲)۔ ہر فرد کو اپنی باوقار زندگی اور تعمیر شخصیت کے لیے سماجی تحفظ کا حق ہوگا اور وہ قومی مساعی اور بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ اور ہر ریاست کے وسائل کے مطابق معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا مستحق ہوگا۔

(۲۳)۔ ۱۔ ہر فرد کو کام کرنے، اپنی پسند کا پیشہ منتخب کرنے، بہتر اور منصفانہ شرائطِ کار حاصل کرنے اور بیروزگاری سے تحفظ پانے کا حق ہوگا۔

۲۔ ہر فرد کو بلا امتیاز یکساں کام کی یکساں اجرت ملے گی۔

۳۔ ہر فرد کو بہتر اور منصفانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق ہے جو اس کی ذات اور اس کے خاندان کے لیے باعزت زندگی بسر کرنے کی ضمانت فراہم کر سکے اور ضروری ہو تو اس کے سماجی تحفظ کے لیے کچھ دوسرے ذرائع بھی مہیا کیے جائیں۔

۴۔ ہر فرد کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین بنانے اور ان میں شامل ہونے کا حق حاصل ہوگا۔

(۲۴)۔ ہر فرد کو راحت و آرام، تفریح، اوقاتِ کار کے معقول تعین اور تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں کا حق ہوگا۔

(۲۵)۔ ۱۔ ہر فرد کو اپنی اور اپنے اہلِ خاندان کی صحت و خوشحالی کے لیے معقول معیارِ زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے جس میں خوراک، لباس، رہائش، طبی امداد ضروری سروس، بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے اور اسی نوعیت کے دوسرے حالات میں تحفظ بھی شامل ہے۔

۲۔ زچگی و شیر خوارگی کو خصوصی توجہ اور امداد کا مستحق سمجھا جائے گا۔ اور تمام بچوں کو خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز یکساں سماجی تحفظ حاصل ہوگا۔

(۲۶)۔ ۱۔ ہر فرد کو حصولِ تعلیم کا حق حاصل ہے۔

۲۔ تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی مکمل تعمیر اور انسانی حقوق و آزادیوں کے احترام کو مستحکم بنانا ہوگا۔

۳۔ والدین کو اپنے بچوں کے لیے نوعیت تعلیم کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔

(۲۷)۔ ۱۔ ہر فرد کو معاشرہ کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصّہ لینے علوم و فنون سے لطف اندوز ہونے اور سائنسی ترقی کے ثمرات سے متمتع ہونے کا حق ہے۔

۲۔ ہر فرد کو اپنی سائنسی، ادبی یا فنی تخلیقات کے اخلاقی و مادی ثمرات کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔

(۲۸)۔ ہر فرد ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی ماحول میں زندگی بسر کرنے کا مستحق ہے۔ جس میں منشور کے ان حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور ہونے کی ضمانت ہو۔

(۲۹)۔ ۱۔ ہر فرد پر اس معاشرے کی طرف سے ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جس میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور مکمل نشو و نما ممکن ہے۔

۲۔ اپنے حقوق اور آزادیوں کے سلسلہ میں ہر شخص صرف قانون کی عائد کردہ ان پابندیوں کے دائرہ میں رہے گا جن کا مقصد دوسروں کے حقوق اور آزادیوں کے احترام کو یقینی بنانا ہے۔

۳۔ ان حقوق اور آزادیوں کو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے منافی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

(۳۰)۔ اس منشور کے کسی بھی حصے کی ایسی تعبیر نہیں کی جا سکے گی جس کا مقصد کسی بھی ریاست، گروپ یا فرد کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے کا حق دلانا ہو جس کے

ذریعہ وہ ان متعلقہ حقوق اور آزادیوں ہی کا صفایا کر دے۔

اس منشور میں جن حقوق اور آزادیوں کا اعلان کیا گیا ہے انہیں بعد میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک فہرست میں معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کو یکجا کر دیا گیا اور دوسری فہرست میں شہری اور ریاستی حقوق کو۔ جنرل اسمبلی نے ۱۹۶۶ء میں ان دو عہد ناموں :Covenants: کی منظوری دی اور رکن ریاستوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ جو ملک رضاکارانہ طور پر ان حقوق کو تسلیم کرنا ہو وہ ان عہد ناموں پر دستخط کر دے۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق نے اس سلسلہ میں مزید کچھ کام کیا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس نے بچوں کے حقوق سے متعلق اور ۱۹۶۳ء میں نسلی امتیاز کے انسداد کے لیے ایک اعلان جاری کیا۔ جنرل اسمبلی نے ۱۹۴۸ء میں نسل کشی کی روک تھام کے لیے ۱۹۵۱ء میں مہاجرین اور جلاوطن لوگوں کے تحفظ کے لیے ۱۹۵۲ء میں خواتین کے سیاسی حقوق کے لیے، ۱۹۵۷ء میں شادی شدہ عورتوں کی قومیت کے تعین کے لیے ۱۹۵۱ء میں غلامی کے مکمل انسداد اور خاتمہ کے لیے اور ۱۹۶۵ء میں جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی مذمت کے لیے مختلف عہد نامے اور قرار دادیں منظور کیں۔

اقوام متحدہ کے خصوصی اداروں مثلاً بین الاقوامی ادارہ محنت (.I.L.O) یونیسکو، بین الاقوامی ادارہ مہاجرین (.I.R.O) اور ہائی کمشنر برائے مہاجرین نے بھی اپنے دائرہ عمل میں انسانی حقوق کے تعین و تحفظ کے لیے قابل ذکر کام کیا ہے۔

لیکن حقوق انسانی کے عالمی منشور اور اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں کی ان شاندار کوششوں کا ماحصل کیا ہے؟ کیا منشور نے فی الواقع انسان کو جبر و استبداد اور آمریت و فسطائیت کے چنگل سے نجات دلا کر آزادی کی فضا میں سانس لینے اور اپنے حقوق سے متمتع ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے؟ اس منشور کی حقیقت اور اقوام متحدہ کی بے بسی کی کیفیت کا حال خود مغربی مفکرین اور بین الاقوامی ماہرین قانون کی زبانی سنیئے۔

"کمیشن برائے انسانی حقوق نے ۱۹۴۷ء میں منشور کے نفاذ سے متعلق ایک رپورٹ منظور

کی جس میں سابقہ اندازِ فکر کو یکسر الٹ دیا گیا۔ اس میں یہ عام اصول طے کر دیا گیا کہ "کمیشن تسلیم کرتا ہے کہ انسانی حقوق سے متعلق شکایات کے معاملہ میں وہ کسی قسم کی کارروائی کا اختیار نہیں رکھتا۔" ع۱

گویا منشور کے اعلان سے ایک سال قبل ہی یہ طے ہو گیا کہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی۔ کوئی ملک چاہے تو اس منشور پر از خود رضا کارانہ طور پر عمل درآمد کر سکتا ہے اور چاہے تو اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں بھی پھینک سکتا ہے۔

ہینز کیلسن کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

"خالص قانونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو منشور کی دفعات کسی بھی رکن ملک پر انہیں تسلیم کرنے اور منشور کے مسودہ یا اس کے ابتدائیہ میں صراحت کردہ انسانی حقوق اور آزادیوں کو تحفظ دینے کی پابندی عائد نہیں کرتیں۔ منشور کی زبان میں کسی ایسی تعبیر کی گنجائش نہیں جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ رکن ممالک اپنے شہریوں کو انسانی حقوق اور آزادیاں دینے کے قانونی طور پر پابند ہیں۔" ع۲

منشور نے ریاستوں کی چیرہ دستی کے ازالہ کے لیے ایک فرد کو کیا کچھ عطا کیا ہے اس کے بارے میں کارل منہائم لکھتے ہیں:۔

"منشور نے کسی فرد کو یہ قانونی حق نہیں دیا کہ وہ منشور میں دیئے گئے حقوق اور آزادیوں میں سے کسی ایک کے سلب ہو جانے کی صورت میں بین الاقوامی عدالت یا اقوام متحدہ کے سب سے بڑے ادارہ انصاف، بین الاقوامی عدالتِ انصاف سے اپیل کر سکے۔ اس عدالت کے قانون کی دفعہ ۳۴ میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ عدالت کے سامنے صرف ریاستیں ہی فریق کے طور پر پیش ہو سکتی ہیں۔" ع۳

منشور میں جن معاشی اور سماجی حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کی اصل حقیقت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر رفائل کہتے ہیں:۔

"یہ نام نہاد معاشی اور سماجی حقوق کوئی بین الاقوامی فرض عائد نہیں کرتے۔ یہ

ایسے حقوق ہیں جن کا تعلق کچھ چیزیں دینے سے ہے مثلاً معقول آمدنی، اسکول، اور سماجی خدمات وغیرہ۔ لیکن کس سے کہا گیا ہے کہ وہ یہ چیزیں مہیا کرے؟ یہ فرض آخر کس سے متعلق ہے؟ اقوام متحدہ کے منشور انسانی حقوق کے مصنفین جب یہ کہتے ہیں کہ" ہر فرد کو سماجی تحفظ کا حق حاصل ہوگا" تو کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کو ایک عالمگیر نظام تحفظ کو کچھ عطیہ دینا چاہیئے جس سے ضرورت پڑنے پر وہ فائدہ اٹھا سکے گا۔ اگر واقعی ان کی مراد یہی ہے تو ان عہد ناموں کے مسودے میں جن کا مقصد منشور کا نفاذ ہے، اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لیے کوئی دفعہ کیوں نہیں ہے؟ اور اگر ایسا نظام وجود نہیں رکھتا تو پھر کیسا فرض اور کہاں کا حق؟ لوگوں پر ایسا فرض عائد کرنا جس کی ادائیگی کا امکان ہی نہ ہو، سراسر حماقت ہے تاہم یہ اتنی ظالمانہ نہیں جتنی یہ حماقت کہ لوگوں کو ایسے حقوق عطا کر دیئے جائیں جن سے وہ کوئی استفادہ ہی نہ کر سکیں"۔ ع[۴]

ان حقوق کے بارے میں لیے کے بروہی فرماتے ہیں:-

" معاشی اور سماجی حقوق کے عہد نامہ میں دیئے گئے حقوق درحقیقت اس اصطلاح کے تسلیم شدہ مفہوم کی رو سے حقوق ہی نہیں ہیں۔ یہ تو سماجی اور معاشی پالیسیوں کے محض اصول ہیں اور اسی سے اتفاقاً یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کمیشن کو ایک کی بجائے دو علیحدہ عہد نامے (Covenants) کیوں مرتب کرنے پڑے"۔ ع[۵]

ان کا اشارہ دنیا کے دو مختلف نظریاتی کیمپوں کی جانب ہے جو نہ صرف متضاد پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں بلکہ حقوق کا قطعی مختلف تصور رکھتے ہیں۔

منشور کی حقیقت اور اقوام متحدہ کی بے بسی کی یہ تصویر دیکھ لینے کے بعد اب مغرب ہی کے ایک مفکر سے مستقبل کے امکانات کا یہ مایوس کن تجزیہ بھی سن لیجئے:

" انہی وجوہ کی بناء پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اقوام متحدہ کے تحت انسانی حقوق

کے قانونی تحفظ کا کوئی روشن مستقبل ہے۔ یہ ادارہ ایسی ریاستوں کے گروپوں پر مشتمل ہے جو جمہوریت اور ریاست و فرد کے باہمی تعلق کا قطعی مختلف تصور رکھتے ہیں۔ مغربی ممالک کے نزدیک بعض حقوق اور آزادیاں مہذب معاشرہ کے لیے بنیادی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حقیقی جمہوریت کی بنیادیں انہی حقوق سے استوار ہوتی ہیں۔ دوسری طرف کمیونسٹ ممالک کا خیال ہے کہ کوئی حق اور آزادی بنیادی نہیں۔ تمام حقوق کا ماخذ ریاست ہے اور اسی کو یہ حق ہے کہ بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کے مفاد میں وہ ان حقوق اور آزادیوں کی حدود کا تعین کرے۔ ان سے الگ وہ ترقی پذیر ریاستیں ہیں جن کا مقصد تیز رفتار معاشی و سماجی ترقی کا حصول ہے اور جو سمجھتی ہیں کہ شہری اور سیاسی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت مطلوبہ معاشی و سماجی مقاصد کے حصول میں ایک رکاوٹ ہے۔ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اقوام متحدہ انسانی حقوق کے میدان میں بہتر نتائج نہ دکھا سکی اور نہ اس سے مستقبل میں ایسی توقع رکھنا حقیقت پسندانہ طرزِ فکر ہوگا۔"[۱۷]

منشور انسانی حقوق کے مطالعہ اور اس پر کیے گئے تبصروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر انسان کی اجتماعی کوششیں بھی اس کے لیے پُر وقار اور آبرومندانہ زندگی کو کوئی ضمانت مہیا نہیں کر سکیں۔ وہ اپنے اپنے ملک میں حکومتوں کی قہرمانی کے سامنے جتنا بے بس و بے اختیار پہلے تھا اتنا ہی آج بھی ہے بلکہ حکومتوں کے دائرہ کار اور اس کے اختیارات میں مسلسل وسعت و اضافے نے بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کو بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔ منشور انسانی حقوق کی حیثیت ایک خوشنما دستاویز سے زیادہ کچھ نہیں اس میں حقوق کی ایک فہرست تو مرتب کر دی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک حق بھی اپنے پیچھے قوتِ نافذہ نہیں رکھتا۔ یہ نہ ریاستوں پر کوئی قانونی پابندی عائد کر کے انہیں بنیادی حقوق سلب کر لینے سے باز رکھنے کا کوئی اہتمام کرتا ہے اور نہ کسی فرد کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے کسی قانونی چارہ جوئی کا کوئی نظام مہیا

کرتا ہے۔ اس طرح یہ منشور تحفظ انسانی حقوق کے معاملہ میں بالکل ناکارہ اور ناقابل اعتماد دستاویز ہے اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کا ایک معیار قائم کردیا ہے اور عامی انسانی برادری کو اپنے حقوق کے تحفظ کا ارتقائی احساس و شعور بخشا ہے۔ معاشرہ میں فرد کی اہمیّت پر زور دیا ہے اور اس کی مدد سے نوآزاد ممالک اپنے آئین وضع کرتے وقت بنیادی حقوق کے رسمی باب کو سہولت کے ساتھ مرتب کر لیتے ہیں۔ اس منشور کی حیثیت سراسر اخلاقی ہے۔ قانونی نقطہ نظر سے اس کا کوئی وزن و مقام نہیں۔ بنیادی حقوق کے محافظ کی حیثیت سے اس منشور کی قوت و اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف سیاسی قیدیوں کے معاملات سے متعلق بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی شائع شدہ رپورٹ برائے سال ۱۹۷۵-۷۶ کے مطابق اقوام متحدہ کے ۱۴۰ رکن ممالک میں سے ۱۱۳ ملکوں میں بنیادی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کی گئیں اور ضمانت کے بجا استعمال بلا جواز گرفتاریوں، سیاسی قید و بند، جبر و تشدد اور سزائے موت کے واقعات اور پریس پر پابندی، عدلیہ کے اختیارات میں کمی، آمرانہ قوانین کے نفاذ اور بنیادی حقوق منسوخ و معطل کئے جانے کے اقدامات میں عالمگیر سطح پر تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔

کتب حوالہ

1. Gaius Ezejiofor, "Protection of Human Rights under the Law" (1964) p. 80
2. Hans Kelson. "The Law of United Nations" London, (1950) p. 29
3. Karl Mannheim. "Diagonosis of Our Time" London (1947) p. 15.
4. Raphael D. D. "Political Theory And the Rights of Man. Indiana University Press, Bloomington (1967) p. 96.
5. Brohi A.K. "United Nations and The Human Rights" (1968) p. 44
6. Gaius Ezejiofor. "Protection of Human Rights Under the Law" (1964) p. 136

ناکامی کے اسباب

انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت میں قومی دستور اور بین الاقوامی منشور کی ناکامی کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس بنیادی سوال پر آتے ہیں کہ آخر انسان اپنے حقوق کے تحفظ کا کوئی اطمینان بخش انتظام دریافت کر لینے میں اب تک کیوں کامیاب نہیں ہو سکا اور اس معاملہ میں اس کی فکر و نظر کی نارسائی اور عقل و شعور کی درماندگی کے اصل اسباب کیا ہیں؟

اس کا واضح اور دوٹوک جواب ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس سارے بگاڑ کا سبب صرف ایک ہے۔ تم نے مقتدرِ اعلیٰ کی ہستی کو تبدیل کر دیا ہے اور جن خود ساختہ خداؤں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا مرکز بنایا ہے آج وہی تمہاری گردن دبوچ رہے ہیں۔ اور تمہارے حقوق پامال کر رہے ہیں قرآن کہتا ہے کہ انسان کا اولین عہد اپنے خالق و مالک اور اس کائنات کے حقیقی حاکم و فرمانروا سے ہوا تھا اور اس عہد کی رو سے خدا کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کر کے فرداً فرداً یہ حلف اٹھایا گیا تھا کہ اس کے سوا کسی کو حاکم اور رب نہیں مانا جائے گا اور نہ اس کی ذات، صفات یا اقتدار میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے گا۔ یہ حلف اور شہادت ہی وہ بنیاد ہے جس پر انسان کو اپنا نائب (خلیفہ) بنا کر اور ایک ضابطہ حیات دے کر مقتدرِ اعلیٰ نے اپنی سلطنت میں بھیجا تھا جہاں اسے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات اسی ضابطہ کے مطابق اور مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً اپنے انبیاء، الہامی کتب اور صحیفوں کے ذریعہ ملنے والی ہدایات

کے تحت چلانے تھے۔ اس عہد میں جس کی بار بار یاد دہانی اور تجدید بھی ہوتی رہی اور نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے کامل و اکمل صورت میں نازل کر کے اور ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر کے قیامت تک کے لیے انسان کی رہنمائی کا دائمی بندوبست بھی کر دیا گیا، مقتدرِ اعلیٰ کے حقوق و اختیارات، اس کی حدود سلطنت، اس کے ساتھ بندوں کے تعلق کی صحیح نوعیت، دنیا میں انسان کی حیثیت، اس کے مقصدِ زندگی، حصولِ مقصد کے ذرائع و وسائل کامیابی و ناکامی کے معیار، انسان اور انسان کے باہمی روابط انفرادی و اجتماعی زندگی کے دائرہ کار، خدائی سلطنت میں اس کے بندوں کے اجتماعی معاملات کی نگرانی کرنے والے صاحبان امر کے دائرہ اختیار، فرد کے بنیادی حقوق، اطاعت کی حدود و شرائط اور آخرت میں مقتدرِ اعلیٰ کے سامنے اپنے ایک ایک عمل کی جوابدہی کے بعد نامۂ اعمال کے مطابق جزاء یا سزا پانے کی ایسی واضح تصریحات کر دی گئی ہیں کہ ان کی روشنی میں زندگی کا صحیح راستہ بالکل صاف اور روشن ہو کر تمہارے سامنے آگیا ہے۔ اب جس کسی نے اس راستے کو، جسے قرآن، صراطِ مستقیم" اور سواء السبیل" (توسط اور اعتدال کی شاہراہ) کے نام سے موسوم کرتا ہے، اختیار کیا وہ اس دنیا میں بھی کامیاب و کامران ہوا اور آخرت کی سرخروئی اور سرفرازی سے بہرہ یاب ہو کر وہ جنت کی ابدی راحت کا بھی مستحق قرار پایا۔ اور جس نے اس راستے کو چھوڑ کر بزعم خود کوئی دوسرا راستہ نکالنا چاہا وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ناکام و نامراد ہو کر جہنم کے ابدی عذاب میں مبتلا ہوا۔

پورا قرآن اسی "صراطِ مستقیم" اور "سواء السبیل" کی نشاندہی کے لیے نازل ہوا ہے، زبور، توریت اور انجیل بھی اسی شاہراہ حیات کو اجاگر کرنے کے لیے نازل ہوئیں۔ حضرت آدمؑ سے لے کر ختمی مرتبت حضرت محمدؐ تک تمام انبیاء کرام بھی صرف یہی ایک پیغام لے کر آتے رہے کہ خدا کے بندو! بندوں کو اپنا خدا مت بناؤ، تم صرف ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کے لامحدود، دائمی ہمہ گیر اور کائنات کے ایک ایک ذرّے پر محیط اقتدار کے تحت زندگی بسر کر رہے ہو، اس کے سوا تمہارا کوئی رب، کوئی مطلق العنان حاکم، کوئی مالک اور کوئی رازق نہیں۔ قرآن میں ایک ایک نبی کے

حالات پڑھ جائیے ان سب کا مشن ایک ہی تھا۔ اپنے اپنے عہد کے شداد، فرعون اور نمرود کی حاکمیت کا خاتمہ اور اللہ کے بندوں کو ان کی غلامی سے نجات دلا کر احاکم الحاکمین سے ان کا رشتۂ بندگی جوڑنا۔

اس ایک مقتدرِ اعلیٰ سے کیے گئے عہد کی پابندی اور اس سے روگردانی کے نتیجے میں انسانی زندگی پر جو عظیم اور ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل یہ دیکھیے کہ وہ اولین عہد کیا تھا جو خدا نے اپنے بندوں سے لیا تھا۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (الاعراف۔۱۷۲-۱۷۳)

"اور اے نبی! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے یا یہ نہ کہنے لگو کہ شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔"

دنیا میں انسانی زندگی کے آغاز سے قبل ہونے والے اس عہد میں حسب ذیل نکات بہت واضح ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کو اپنا واحد رب ماننے کا اقرار

(۲) ازل سے ابد تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں سے فرداً فرداً خدا سے وفاداری کا حلف اور اس حلف پر خود ان کی شہادت۔

(۳) شرک یعنی کسی اور کو خدا ماننے یا خدائی میں شریک ٹھہرانے سے باز رہنے کا پختہ عہد۔

(۴) باپ دادا کے عقائد و اعمال کو عذر بنا کر ارتکاب شرک کی ذمہ داری سے بچنے کی گنجائش کا خاتمہ۔

(۵) قیامت میں اپنی دنیوی زندگی سے متعلق ایک ایک عمل کی جوابدہی۔

اللہ تعالیٰ نے اس اولین میثاق کے بعد اس کی مسلسل یاد دہانی اور تجدید کا بھی اہتمام فرمایا تاکہ انسان ہدایت کا راستہ چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے اور اپنی گردن میں کسی اور کی غلامی و بندگی کا طوق ڈال کر ذلت و پستی کے گڑھے میں نہ جا گرے انسانوں سے بحیثیت مجموعی جو عہد لیا گیا تھا اس کی تجدید و یاد دہانی پر مامور کیے جانے والے انبیاء کرامؑ سے ایک الگ عہد لیا گیا حالانکہ وہ اولین عہد میں بھی بحیثیت انسان شریک تھے لیکن ان کے منصب اور اس منصب کی عظیم ذمہ داریوں کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض نے ان سے علیحدہ حلفِ وفاداری (Oath of Allegiance) لیا۔

"یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے۔ کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اُس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے ان سے پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔

اللہ نے فرمایا کہ اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔" (آلِ عمران۔ ۸۲)

منصبِ خلافت اور منصبِ نبوت کے اس عہد کی بار بار تجدید ہوتی رہی اللہ تعالیٰ نے ایک ایک نبی اور اس کے ذریعہ ایک ایک امت سے اس عہد و پیمان کو تازہ کرایا۔

"اور اے پیغمبر! یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے تم سے

بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابن مریم سے بھی۔ ہم سب سے
پختہ عہد لے چکے ہیں تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے
میں سوال کرے اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا
ہے۔" (احزاب ۷-۸)

پیغمبروں سے صرف یہی عہد نہ لیا گیا تھا کہ وہ خدا کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں اور کسی اور کی بندگی قبول نہ کریں بلکہ ان سے یہ عہد بھی لیا گیا تھا کہ دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کریں، اس کے بندوں کو ان باغیوں اور غداروں سے نجات دلائیں جنہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کر کے اور اللہ کی سلطنت میں اپنا تخت اقتدار بچھا کر اس کی رعایا کو اپنی رعایا اور اس کے بندوں کو اپنا بندہ بنا کر انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے اور انہیں اللہ کی بخشی ہوئی آزادی سے محروم کر کے اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کی کوشش کی ہے۔ انبیاءؑ کو ان کے مشن کی یاددہانی کراتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

"اللہ نے مقرر کر دیا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ
کو اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ) تمہاری طرف اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ
اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں
متفرق نہ ہو جاؤ۔" (الشوریٰ ۱۳)

ان انبیاء کرامؑ کو جن امتوں کی ہدایت و رہنمائی پر مامور کیا گیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان سے بھی عہدِ وفاداری لیا اور انہیں ان کے قول و قرار یاد دلائے۔ بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا:

"اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور
ان سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی
اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے
تو یقین رکھو میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں
داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے

کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواء السبیل گم کردی"۔ (المائدہ ۱۲)

اسی عہد کو دوسری جگہ یوں یاد دلایا گیا ہے:

" یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا مگر بھتوڑے آدمیوں کے سوا تم اس عہد سے پھرے ہوتے ہو پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا، تم نے اس کا اقرار کیا تھا تم خود اس پر گواہ ہو (البقرہ ۸۲-۸۴)

ان آیات میں صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے کا اقرار ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کا وہ پورا ضابطہ حیات بھی موجود ہے جس کی پابندی کا عہد کیا گیا تھا۔ ان آیات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تمام انبیاء کرام ایک ہی دعوت لے کر آتے رہے ہیں۔ یہ نماز، زکوٰۃ، اللہ کی راہ میں مال کا خرچ، ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک، حق گوئی، انسانی جان کا احترام اور لوگوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانے سے گریز کی ہدایات صرف امت محمدیؐ ہی کو نہیں دی گئیں، سابقہ امتوں کو بھی یہی ہدایات دی جاتی رہی ہیں اور خدا نے انسانی معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کے لیے ہمیشہ ایک ہی ضابطہ حیات پر کاربند رہنے کا عہد لیا ہے۔

بنی اسرائیل کو سورہ البقرہ، آیت ۶۳ اور ۹۵۔ آل عمران آیت ۱۸۷ اور النساء آیت ۱۵۵ اور ۱۵۴ میں بھی خدا سے کیے جانے والے عہد یاد دلائے گئے ہیں۔

اب حضرت عیسیٰؑ کی امت کے بارے میں یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

" اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی عہد لیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا بڑا حصہ انھوں نے فراموش کر دیا (المائدہ ۱۴)

سابقہ امتوں سے لیے گئے عہد، ان امتوں کی عہد شکنی اور اس کے مہلک نتائج کی روداد

سنانے کے بعد قرآن نبی آخر الزماںؐ کی امت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"اللہ نے تم کو (مسلمانوں کو) جو نعمت (دین) عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے یعنی تمہارا یہ قول کہ ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔ اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے"۔ (المائدہ ۷)

الگ الگ امتوں کو ان کے حلف کی ذمہ داریاں یاد دلانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ قرآن میں اولین میثاق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوری نسلِ انسانی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی مت کرو، وہ تمہارا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرو یہی سیدھا راستہ ہے"۔ (یٰسین ۶۰-۶۱)

انسان کو اپنے عہد کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے ساتھ ہی قرآن عہد کی پابندی اور اس کی خلاف ورزی کا انجام بھی کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ تاکہ انسان اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ عہد شکنی پر اس کی کوئی پکڑ نہ ہو گی اور نہ اس افسردگی میں مبتلا ہو کہ پابندیٔ عہد سے اسے کیا مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ عہد کی پابندی کرنے والوں کو اجرِ عظیم کی نوید اور عہد شکنی کرنے والوں کو عذابِ الیم کی وعید سناتے ہوئے اپنے بندوں کے ساتھ خود بھی ایک پختہ عہد کرتا ہے۔

"جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں، رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (آلِ عمران ۷۷)

"جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں"۔ (البقرہ ۲۷)

یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ الرعد کی آیت ۲۵ میں کہی گئی ہے۔ پابندِ عہد اور عہد شکن لوگوں کی حیثیت کا فرق اور ان کے ساتھ اپنے مختلف سلوک کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے :۔

" بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے اور وہ جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کرتے ہیں اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ اسے مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے (الرعد ۱۹۔۲۰)

قرآن کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر نسل آدم کے آخری فرد تک ہم میں سے ہر انسان میثاق اول اور پھر ہر نبی کے ذریعہ اس میثاق کی تجدید کے تحت فرداً فرداً اپنے خالق و مالک کے ساتھ اس عہد میں جکڑا ہوا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کو اپنا رب نہیں مانے گا۔ اپنا سر اطاعت اس کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھکائے گا۔ اس کے سوا کسی اور کو حاکم مطلق اور فرمانروا تسلیم نہیں کرے گا جو ہدایات اور جو احکام اسے مقتدر اعلیٰ کی جانب سے مبعوث ہونے والے انبیاء کرامؑ کے ذریعہ ملتے رہے ہیں اور اب خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کامل و اکمل صورت میں ملے اور ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیئے گئے ہیں وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل انہی کے مطابق کرے گا۔ ان میں سے کوئی فرد اٹھ کر اگر خدائی کا دعویٰ کرے گا تو اس کا دعویٰ اس کے منہ پر دے مارا جائے گا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو باغیوں اور غداروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ خود بھی اپنے رب کی اطاعت کرے گا اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے گا۔ زندگی کے کسی ایک معاملہ میں بھی وہ اپنے رب اس کے مقرر کردہ نبی یا ان کی اطاعت کرنے والے صاحبان امر کے سوا کسی اور کی بات نہیں مانے گا اور شرک سے مکمل اجتناب کرے گا۔

خدا کے ساتھ کیے جانے والے میثاق اوّل اور اس کے تجدیدی عہدوں کی ان تصریحات کے بعد اب یہ دیکھئے کہ ایک خدا کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کر لینے یا اس کے اقتدار اعلیٰ سے انکار کر دینے

کے کیا نتائج انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں اور صرف اسی ایک فیصلے سے حق و باطل کا فاصلہ بڑھتے بڑھتے کہاں تک جا پہنچتا ہے اور خدا کی نیابت کے عظیم منصب پر فائز انسان جو اپنے خالق کے بعد اس کائنات کی سب سے عظیم ہستی ہے اپنی عظمت و رفعت سے محروم ہو کر پستی اور ذلت کے کیسے عمیق گڑھے میں جا گرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کیے گئے میثاق کے تحت صرف اسی کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کر لینے اور اُسی کی بندگی کے عہد پر قائم رہنے سے حسب ذیل نتائج آپ سے آپ نکلتے ہیں:

(۱) ریاست کسی معاہدہ عمرانی سے نہیں بلکہ انسان اور اس کے خالق و مالک کے درمیان ہونے والے میثاق (Covenant) سے وجود میں آتی ہے۔

(۲) اس میثاق کی رو سے رَبّ صرف ایک ہی ہے، باقی سب اس کے بندے ہیں۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط (یوسف ۴۰) فرمان روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف ۵۴) خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔

(۳) اس کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں، نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (بنی اسرائیل ۔ ۱۱۱) بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (الکھف ۔ ۲۶) اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ قف (القصص ۔ ۸۸) اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہ پکارو، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۴) اس کا اقتدار دائمی اور ہمہ گیر ہے، اس کائنات کا ایک ذرہ بھی اس کے دائرہ اقتدار سے باہر نہیں۔

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی (طٰہٰ ۔ ۶)

مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (الروم۔ ۲۶)

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اس کے بندے ہیں، سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

(۵) ہماری یہ دنیا اور اس سے ماوراء پوری کائنات ایک ہی سلطنت یا ریاست (State) ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ (الملك۔۱)

نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (البقرہ۔۲۵۵)

اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔

(۶) انسان اس زمین پر خدا کا نائب ہے اور اس اعتبار سے وہ اپنے خالق کے بعد اس کائنات کی سب سے عظیم اور مکرم ہستی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام۔۱۶۵)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل۔۷۰)

ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

(۷) وحدتِ اقتدار اور وحدتِ سلطنت کا منطقی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کی رعایا اور ایک ہی ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے تمام انسان مساوی ہیں۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقوں کی تمام تفریقیں اور تمام امتیازات بے بنیاد ہیں۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات ۱۳)

لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

(۸) وحدتِ انسانیت کا تقاضا تھا کہ پوری نسل آدم کے لیے ایک ہی ضابطہ حیات مقرر کیا جاتا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔۱۹)

اللہ کے نزدیک دین تو صرف اسلام ہی ہے۔

یہ صرف محمدؐ ہی کا پیش کردہ دین نہیں ہے۔ تمام سابق انبیاءؑ بھی اسی دین کی دعوت دیتے رہے اور وہ سب کے سب مسلمان تھے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ۔۱۳۶)

مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔

(۹) ایک ہی ضابطہ حیات نے انسان کے لیے ایک ہی انفرادی و اجتماعی کردار کی تشکیل کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کر دیں۔ فطری صلاحیتوں کے تفاوت، رجحانات و میلانات کے اختلافات فرائض اور ذمہ داریوں کی مختلف نوعیت کے باوجود نصب العین کی وحدت اور تشکیل کردار کے بنیادی عواطف (Sentiments) اور عوامل (Factors) کی یکسانیت نے انسان کو فکر و عمل کے لحاظ سے ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جسے اللہ تعالیٰ صبغۃ اللہ کا نام

دینا ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (البقرہ۔۱۳۸)

کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔

(۱۰) انسان کا یہ ضابطہ حیات اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ہے اسی لیے یہ مفادات کے ٹکراؤ، طبقات کے وجود اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں تصادم و کش مکش کے امکانات کا مکمل خاتمہ کر کے تمام انسانوں کے درمیان کامل ذہنی ہم آہنگی اور عملی اشتراک و تعاون کا مضبوط رشتہ قائم کرتا ہے جو چھینا جھپٹی، لوٹ مار، استحصال اور حرص و ہوس کی جڑیں کاٹ کر انسان کے اندر باہمی ہمدردی و ایثار کی روح بیدار کرتا ہے۔ اور اس طرح مادی مفادات پر مبنی طبقوں کی جتھہ بندی کا امکان ختم کر کے ایک غیر طبقاتی معاشرہ (Class less Society) وجود میں لاتا ہے۔ اخلاق، اس ضابطہ حیات کی روح اور اس کا بنیادی عنصر ہے۔ قرآن، حضور اکرمؐ کی سب سے بڑی صفت اسی اخلاق کو قرار دیتا ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم۔۴)

اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو۔

انسان کو اسی نمونہ اخلاق کی پیروی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

(۱۱) اس ضابطہ حیات میں انسان کے لیے مقابلے اور مسابقت کا بھی ایک میدان فراہم کر دیا گیا ہے تاکہ جہد و عمل کا جذبہ اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فطری خواہش انسان کو اپنی انفرادی صلاحیتوں کے اظہار اور شخصیت کے نشوونما میں مدد دے سکے لیکن اس جذبہ مسابقت کو مادی آسائشوں کے حصول اور ذاتی اغراض و خواہشات کی تکمیل کے لیے محرکات سے پاک

کر دیا گیا ہے جو انسان کو انسان کا دشمن بنا کر اسے حیوانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا دیتے ہیں۔
یہاں مسابقت ہے "تقویٰ" میں یعنی نفس کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی میں دل و دماغ کی پوری آمادگی اور شخصیت کی مکمل سپردگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں۔
یہاں بڑائی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی اپنے دوسرے ہم جنسوں کے مقابلے میں زیادہ دولت کا مالک ہو، اونچی اور عظیم الشان عمارتوں میں رہتا ہو، اسے وہ اسبابِ عیش مہیا ہوں، جن سے اسی جیسے لاکھوں انسان محروم ہوں بلکہ اصل بڑائی یہ ہے کہ وہ اپنے حسنِ عمل اور اطاعت و فرمانبرداری کے اچھے ریکارڈ کی بناء پر خدا کے ہاں معزز قرار پائے اور دوسروں سے بہتر اجر و انعام کا مستحق ٹھہرے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات - ۱۳)

"درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ معیارِ فضیلت ہے۔ انسانی معاشرے میں اب کسی کو دوسروں پر برتری حاصل ہو سکتی ہے تو صرف نیکی اور پرہیزگاری کے میدان میں آگے بڑھنے سے۔ شرف و فضیلت کا کوئی بھی دوسرا معیار اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

(۱۲) خدا کا مقرر کردہ ضابطہ حیات محض خوشنما اخلاقی اصولوں کا کوئی بے جان مجموعہ نہیں ہے۔ اس کی پشت پر ایک مضبوط قوتِ نافذہ ہے اور یہی قوتِ نافذہ اس کی اصل روح ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ کا ارشاد ہے۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ (الزلزال - ۷-۸)

پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

اِنَّآ اَنْذَرْنٰکُمْ عَذَابًا قَرِیْبًا یَّوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ (النباء - ۴۰)

ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرایا ہے جو قریب آ لگا ہے، جس روز وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (البقرہ ۔۱۵۶)

ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

آخرت کی جوابدہی کا یہ احساس انسان کی زندگی میں ذمہ داری کا عنصر داخل کر کے اسے بے مہار ہونے سے بچا لیتا ہے اور وہ اپنے نفس کے اشاروں پر چلنے کی بجائے اپنے ایک ایک عمل میں مالک کی خوشنودی اور اس کے سامنے اپنی سرخروئی کا خیال رکھتا ہے۔

(۱۳) خدا کی اس سلطنت میں قانون کی مکمل حکمرانی ہے۔ بندوں کا کام صرف اس قانون کی پابندی اور بحیثیت خلیفہ اس کا نفاذ ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی، یہاں تک کہ کسی نبی کو بھی، خدا کے قانون میں کسی ترمیم و تنسیخ یا کمی بیشی کا اختیار نہیں۔ اس کی پابندی جس طرح ایک عام آدمی پر لازم ہے اسی طرح اللہ کا نبی بھی اس کا پابند ہے۔ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) کا یہ تصور خدا کے دین کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ (النساء ۱۰۵)

ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس علم حق کے ساتھ فیصلہ کرے جو خدا نے تجھے دیا ہے۔

قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (یونس ۔ ۱۵)

اے محمدؐ! کہہ دو کہ مَیں اس کتاب کو اپنی طرف سے بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔ مَیں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف اتاری جاتی ہے۔ اگر مَیں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

(۱۴) اللہ کے ذاتی ناقابلِ انتقال اور غیر متبدل اقتدارِ اعلیٰ کی طرح اس کی طرف سے

مقرر کردہ انسان کے بنیادی حقوق بھی دائمی اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی کو تبدیلی یا تنسیخ کا حق نہیں ہے۔ یہ محفوظ و متعین حقوق فرد اور ریاست کے درمیان ایک مستحکم رشتہ قائم کرتے ہیں اور باہمی نزاع و کشمکش کی بجائے ان دونوں کو ایک دوسرے کا معاون و سرپرست بنا دیتے ہیں۔ اللہ کے قوانین آئے دن تبدیل نہیں ہوتے۔ اس نے جن امور میں انسان کو آزادی بخشی ہے ان میں کسی کو مداخلت کا اختیار نہیں اور جن امور کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں ان میں کسی اور کو قانون سازی کا حق نہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (الانعام۔ ۱۱۵)

تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔ کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (الروم۔ ۳۰)

اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب۔ ۶۲)

اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (الانعام۔ ۳۴)

اللہ کی باتوں (قوانین و احکام) کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔

گویا اس کا عطا کردہ ضابطہ حیات ایک مستقل دستور (Permanent Constitution) کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی کسی ایک دفعہ میں بھی قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد و میثاق کی پاسداری کے ان نتائج پر غور کرنے سے آپ لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اللہ نے اپنی بندگی کا حلف لے کر انسان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ میثاق دراصل انسان کے لیے آزادی کا منشورِ اعظم (Magna Charta) ہے جس کے ذریعہ بندوں پر بندوں کی حاکمیت کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناپسند

ہے کہ جس انسان کو اس نے بہترین صورت پر پیدا کیا (وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ المومن ۶۴) جس کی تخلیق بہترین ساخت پر ہوئی (لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ التین - ۴) جسے علم کی دولت بخشی گئی (وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا البقرہ - ۳۱) جس کی خدمت کے لیے کائنات کی تمام اشیاء کو مسخر کر دیا گیا (أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ (الحج ۶۵) اور پھر اپنی روح پھونک کر اسے مسجود ملائک بنا دیا گیا (وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ. الحجر ۲۹) وہ انسان خود اپنے ہی جیسے انسانوں یا اپنی خدمت پر مامور دوسری مخلوقات کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے اور اللہ کی بخشی ہوئی عزت و عظمت کو گنوا کر ذلت و پستی کے گڑھے میں جا گرے وہ انسان کو خود اس کے مفاد میں بار بار یہ بات ذہن نشین کراتا ہے کہ عقیدہ توحید میں تمہارے لیے شرف و فضیلت ہے، وقار و سربلندی ہے۔ تم اس سے بال برابر ہٹے اور ہلاکت و بربادی کے نرغے میں پھنسے۔ اسی لیے قرآن کا پورا زورِ کلام صرف دو نکتوں پر ہے ایک خدا کی وحدانیت اور دوسرے انسان کی حیثیت بندگی۔ وہ اس بنیادی رشتہ کو مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے اور انسان کو کسی بھی دوسرے شخص یا شئے کے سامنے سر جھکانے سے روکتا ہے وہ کہتا ہے:

(۱) "تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔" (الاعراف - ۱۹۴)

(۲) "وہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے، اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ ایک پر کاہ کے مالک بھی نہیں ہیں۔" (فاطر - ۱۳)

(۳) "اگر آسمان اور زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین و آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔" (الانبیاء - ۲۲)

(۴) "اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (المومنون ۹۱)

(۵) "اے محمدؐ! ان سے کہو اگر اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو وہ مالک عرش کے مقام پر پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے (بنی اسرائیل ۴۲)

(۶) "اللہ ایک مثال دیتا ہے، ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے"۔ (الزمر۔۲۹)

دوسرے تمام مدعیان ربوبیت کی حقیقت کو واضح کرنے اور انسانی ذہن کو ان کی مرعوبیت سے نجات دلانے کے لیے قرآن کا یہ اندازِ تفہیم ملاحظہ ہو:

"لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو، جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور"۔ (الحج۔۷۳)

اب بتائیے خدا کے غلام کو دنیا کی کوئی بھی بڑی سے بڑی قوت اپنا غلام بنا سکتی ہے؟ ہے کوئی دوسرا مقتدرِ اعلیٰ جو اس کا سر اپنے سامنے جھکوا سکے؟

؎ یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات! (اقبالؒ)

خدا کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کر لینے کے ان منطقی نتائج اور ان سے وجود میں آنے والے انسانی معاشرہ کی ایک اجمالی تصویر دیکھ لینے کے بعد اب ان اثرات و نتائج کا جائزہ لیجیے جو اس مقتدرِ اعلیٰ کو نہ ماننے اور اس کے ساتھ کیے گئے میثاق سے روگردانی کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں اور آج بہت ٹھوس اور واضح شکل میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

(۱) انسان نے خدا کے ساتھ ہونے والے میثاق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو فوراً یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ اپنے حقوق، ریاست کے وجود اور حکمرانوں کے اختیارات کے لیے سندِ جواز کہاں سے مہیا کرے؟ کس قانونی دستاویز کے حوالے سے فرد اور ریاست کے تعلقات کا تعین کرے؟ اس ضرورت سے مجبور ہو کر اسے حقیقی میثاق کی جگہ ایک مفروضہ میثاق، معاہدہ عمرانی (Social Contract) کے نام سے گھڑنا پڑا۔

(۲) حقیقی میثاق نے انسان سے اپنے خالق و مالک کو رب ماننے کا حلف لیا تھا مفروضہ معاہدہ نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو خدا ماننے اور ان کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیا اور یوں انسان پر انسان کی خدائی کا آغاز ہو گیا۔

(۳) حقیقی میثاق میں مقتدرِ اعلیٰ صرف ایک ہی ہستی کو مانا گیا تھا، مفروضہ میثاق سینکڑوں مقتدرِ اعلیٰ وجود میں لے آیا۔ جنہیں حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کے تمام حقوق و اختیارات سونپنے پڑے اور ایک خدا کی بندگی کی بجائے انسان کو اپنے خود تراشیدہ خداؤں کی بندگی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑا۔

(۴) وحدتِ اقتدار نے وحدتِ ریاست کو جنم دیا تھا۔ اب کثرتِ اقتدار نے دُنیا کو سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے انسانیت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔

(۵) خدا کا اقتدار دائمی اور ہمہ گیر تھا۔ اب عارضی اور محدود مقتدرِ اعلیٰ وجود میں آئے اور انہوں نے جب اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو دوام بخشنے اور اختیارات و حدودِ سلطنت کو وسعت دینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے تو یہیں سے ظلم اور فساد کا آغاز ہو گیا۔ یہ انسان کے بنائے ہوئے خدا آپس ہی میں لڑ پڑے اور ان کے باہمی جنگ و جدل، ہوسِ ملک گیری، عیاشی اور استحصال نے انسانی دنیا کا امن و سکون غارت کر دیا۔

(۶) انسان خدا کے نائب کی حیثیت سے اس دنیا میں عظمت و تکریم کے بلند ترین مقام پر فائز تھا اور اشرف المخلوقات تھا اب اپنے ہی جیسے انسانوں کی خدائی میں ارذل المخلوقات،

بن گیا۔ اس کی دو کوڑی کی حیثیت نہ رہی، کسی مقتدرِ اعلیٰ نے اسے درندوں کے سامنے ڈال کر کھیل تماشے سے لطف اندوز ہونے کی خواہش پوری کی، کسی نے اسے آگ کے الاؤ میں جھونکا، کسی نے گیس چیمبر کا ایندھن بنایا، کسی نے کولہو میں پلوایا، کسی نے اس کے کاندھوں پر اپنا تختِ اقتدار رکھ کر سواری گانٹھی، کسی نے کتوں کے گلوں میں پڑے ہوتے پٹوں کی طرح اس کی گردنوں میں آہنی طوق ڈالے اور بھیڑ بکریوں کی طرح بازاروں میں لے جا کر بیچا، کسی نے اس پر ایٹم بم برسائے، کسی نے سمندروں میں غرق کیا اور ان کے درمیان اب بھی یہ مقابلہ جاری ہے کہ ہم میں سے کون فی سیکنڈ کتنے آدمیوں کو ہلاک کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ غرض ان خود ساختہ مقتدرانِ اعلیٰ نے انسان کا جینا دوبھر کر دیا، ان کے ہاتھوں نہ اس کی جان محفوظ ہے نہ مال، نہ عزت سلامت ہے نہ آبرو، وہ ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو گیا ہے جس سے نکلنے کی کوئی راہ اسے سجھائی نہیں دے رہی۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے انسان کو مساوی الحیثیت قرار دیا تھا۔ اب رنگ، نسل، علاقوں، زبانوں اور دوسرے امتیازات پر مبنی گروہ بندیوں نے اسے مختلف قوموں میں بانٹ دیا اور پھر قومی مفادات کی وسعت و حفاظت نے ایک باقاعدہ فلسفہ کی صورت اختیار کر کے نیشنلزم کو جنم دیا جس نے چھوٹی اور کمزور قوموں کو طاقتور قوموں کا غلام بنا دیا۔

اسی نیشنلزم کے بطن سے ہٹلر کے نازی ازم، مسولینی کے فاشزم، امریکہ اور برطانیہ کے امپیریلزم کی شاخیں پھوٹیں اور ان کے غلبہ و تسلط نے پہلے ساری دنیا کو نوآبادیاتی نظام میں جکڑا اور پھر مفادات کے تصادم نے اسے دو عالمی جنگوں کے جہنم میں جھونک دیا۔

(۸) خدا کے ہاں سے پوری نسلِ آدم کو ایک ہی ضابطہ حیات ملا تھا۔ اب انسان اپنا ضابطہ حیات خود وضع کرنے بیٹھا تو نت نئے متضاد اور بے ہنگم فلسفے، نظریے اور تصورات اُبھر کر سامنے آتے مگر ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو پوری انسانیت کے لیے قابلِ قبول ہوتا کیونکہ ان پر مخصوص مفادات، مخصوص جغرافیائی اور تاریخی حالات، مخصوص ماحول اور سب

سے بڑھ کر محدود علم و عقل کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ ان نظریات اور تصورات کی کثرت نے انسانی ذہن کو اس قدر الجھا دیا کہ زندگی کی صراطِ مستقیم اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

افلاطون (Plato) اور ہیگل (Hegel) کے نظریہ عینیت (Idealism)، جان اسٹورٹ مل (J. S. Mill) کے نظریہ انفرادیت (Individualism) بینتھم (Bentham) کے نظریہ افادیت (Utilitarianism) اور مارکس (Marx) کے نظریہ اشتراکیت (Communism) سے لے کر گاڈون (Godwin) اور کروپاٹکن (Kropotkin) کے نظریہ نراجیت (Anarchism) تک زمان و مکان میں مقید سینکڑوں نظریات اور ان کی ہزاروں تعبیرات کے طومار نے انسان کو حواس باختہ کر دیا اور اسے مختلف ذہنی اور سیاسی دائروں میں محصور کر کے نہ صرف ایک دوسرے سے کاٹ دیا بلکہ باہم دشمن بنا دیا۔

(۹) انسان کا وضع کردہ ضابطہ حیات چونکہ کسی مشترک نصب العین اور اخلاقی اقدار پر مبنی نہیں تھا اس لیے سیرت و کردار کی یک رنگی کا بھی کوئی امکان باقی نہ رہا۔ ہر چھوٹے مقتدرِ اعلیٰ نے اپنی اپنی ریاست میں اپنے مخصوص قومی مفادات کی تکمیل کے لیے ایک خاص تربیتی نظام کے تحت شہریوں کو ایسے کردار کے سانچے میں ڈھالا کہ وہ اپنے ملک کے لیے تو مفید شہری ثابت ہوں مگر ملک کی حدود سے باہر باقی انسانی دنیا کے لیے ڈاکوؤں، لیٹروں، قاتلوں اور غنڈوں کا کردار ادا کر سکیں۔ یوں انسان اور انسان کے درمیان عالمگیر رشتۂ اخوت کی کوئی بنیاد باقی نہ رہی۔ سب ایک دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو، وطن، نسل، ملکی وسائل اور حکومت و اقتدار کے دشمن بن گئے۔ عقائد و افکار، مقاصد و نصب العین، ذہنی رجحانات و میلانات اور اطاعت و وفاداری کے مراکز کی جدائی نے ان سب کو ایک دوسرے سے جدا کر کے پوری انسانی دنیا کو تضادات، اختلافات، کشیدگی اور دشمنی کی آماجگاہ بنا دیا۔

(۱۰) خدا کا عطا کردہ ضابطہ حیات اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیمات پر مبنی تھا۔ خدا کے باغی انسان

نے اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر مادی مفادات کو اس کی بنیاد بنایا۔ اس مفاد پرستی نے ایک ہی ملک میں رہنے والے باشندوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ ان کے درمیان ایثار و ہمدردی اور تعاون و خیر خواہی کی بجائے خود غرضی اور مردم آزادی کے رجحانات ابھر آئے۔ اسی مفاد پرستی نے ایک طرف جارحانہ لوٹ مار اور دوسری طرف منظم دفاع کے لیے طبقات (Classes) کو جنم دیا اور پھر ان طبقات کی سرد و گرم جنگ نے انسان کو انسان کے خون کا پیاسا بنا کر دنیا کا امن و سکون تہہ و بالا کر دیا۔ یہ طبقاتی جنگ ایک باقاعدہ فلسفہ بن گئی اور اس فلسفے کی رو سے مخالف طبقے کے لوگوں کی گردن مارنا ایک کارِ ثواب ٹھہرا اور اس جنگ میں مارا جانا شہادت قرار پایا۔

(۱۱) خدا کے ضابطہ حیات کی رو سے مسابقت کا اصل میدان تقویٰ تھا، لیکن اب اس کی جگہ اسبابِ عیش کی فراوانی اور نفس کی لذتوں کو تسکین پہنچانے اور مزید پروان چڑھانے والے ساز و سامان کے حصول کی جد و جہد نے لے لی۔ اس میدان مسابقت نے ہر انسان کو اپنے نفس کا غلام بنا کر اسے جنون زر اندوزی میں مبتلا کر دیا۔ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور بڑائی کا معیار یہ قرار پایا کہ دوسروں کے مقابلے میں ایک شخص کے پاس اس دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا کتنا وافر سامان موجود ہے؟ اس اندازِ فکر نے انسان کو خود غرضی اور نفس پرستی کی راہ پر ڈال کر اسے دوسرے افرادِ معاشرہ کے لیے ایک بھیڑیا بنا دیا۔

(۱۲) انسان کے وضع کردہ تمام نظام ہائے حیات کی ایک مشترکہ کمزوری یہ ہے کہ ان کے اخلاقی اصولوں کی پشت پر کوئی قوتِ نافذہ نہیں انہوں نے اوّل تو اخلاق کو وہ اہمیت ہی نہیں دی جو اسے الہامی نظامِ حیات میں حاصل ہے۔ اگر مہذب معاشرتی زندگی کے لیے کچھ اخلاقی اصول طے کیے بھی گئے تو وہ بالکل بے روح اور بے جان ثابت ہوتے کیونکہ انسان کو ان اصولوں کی پابندی پر آمادہ کرنے والی کوئی قوت موجود نہیں تھی۔ عقیدۂ آخرت سے روگردانی

نے انسان کو غیر ذمہ دارانہ زندگی کا عادی بنا دیا۔ اس نے بس اسی دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور اپنے اعمال کے سلسلہ میں کسی جوابدہی کے احساس سے عاری ہو کر وہ شتر بے مہار بن گیا۔ اجتماعی زندگی میں "سب کے مفاد" کی خاطر اگر وہ کچھ اخلاقی اصولوں پر کاربند ہوا بھی تو انفرادی زندگی کو اس نے ان اصولوں کی گرفت سے یکسر آزاد رکھا اور اس دائرہ میں اس کی زندگی تمام تر حیوانی سطح پر اتر آئی۔

(۱۳) خدا کی سلطنت میں قانون کی حکمرانی تھی مگر انسان کی قائم کردہ سلطنت میں "حکمران کی مرضی" (Will of the ruler) کو قانون کا درجہ حاصل ہوا۔ حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کی مرضی کا اظہار ایک مستقل اور دائمی دستور کی صورت میں ہوا جس کا اطلاق ہمہ گیر اور زمان و مکان کی قیود سے بالاتر تھا لیکن انسان کے اپنے تراشیدہ مقتدرِ اعلیٰ کی مرضی کو کوئی قرار نہیں۔ وہ گھڑی میں کچھ ہے اور گھڑی میں کچھ۔ اس کا اطلاق ایک خاص زمانے اور خاص علاقے تک محدود ہے۔ اس میں آتے دن ترمیمات ہوتی رہتی ہیں اور مقتدرِ اعلیٰ کی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ بار بار تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے انسان کے وضع کردہ دستورِ حیات میں "قانون کی حکمرانی" کا تصور محض ایک فریب ہے۔

(۱۴) خدا کے عطا کردہ بنیادی حقوق مستقل اور ناقابلِ انتقال تھے مگر انسان کے وضع کردہ دستور کی ناپائیداری نے اس کے عطا کردہ بنیادی حقوق کو بھی ناپائیدار بنا دیا اور ان حقوق کو فرد اور ریاست کے درمیان ایک مسلسل نزاع و کش مکش کا موضوع بنا کر رکھ دیا۔ اب یہ حقوق بڑی جدوجہد اور جانفشانی سے حاصل کیے جاتے ہیں لیکن کسی آمر کی ایک ہی ٹھوکر سے کانچ کی چوڑیوں کی طرح چھن سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ ہیں وہ سنگین اور تباہ کن نتائج جو انسان کو حقیقی مقتدرِ اعلیٰ سے رشتہ بندگی توڑنے اور اپنے ہی جیسے بندوں کو مقتدرِ اعلیٰ بنا لینے کے جرم میں اسی دنیا کے اندر بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ اس نے خدا کے قانون کی پابندیوں سے بچنے اور اس کی سلطنت میں اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنے کی خاطر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا لیکن

کیا حقیقتاً اسے مطلوبہ آزادی اور خود مختاری میسّر آ گئی؟ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو گیا؟ یا اُلٹا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ ایک خدا کو چھوڑ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے سر پر اقتدارِ اعلیٰ کا تاج رکھنے، ان کے حضور اپنی پیشانی رگڑنے، ان کے حق میں اپنی ساری آزادیوں، بنیادی حقوق اور خلافت کے اعلیٰ ترین منصب سے وابستہ عزت و عظمت سے دستبردار ہونے اور اپنے جان و مال، آبرو، وسائل اور ذہنی و جسمانی قوتوں کو ان کے تصرف میں دینے پر مجبور ہو گیا اور ان جھوٹے خداؤں کی بندگی میں بدترین محکومی، ذلت و رسوائی اور حسرت و مایوسی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

انسان کے تراشیدہ خداؤں میں سے کون ہے جس نے مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟ (حٰمٓ السجدہ۔۱۵) اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ (النّٰزعٰت۔۲۴) کا نعرہ لگا کر اپنے اور پرائے سب پر مظالم کے پہاڑ نہ توڑے ہوں اور اپنی ادنیٰ سی خواہش پر ہزاروں گھر ویران نہ کر دیتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو حاکمیت و فرمانروائی کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا، اس کا کام بندگی ہے خدائی نہیں اس کے خالق نے صفت بندگی کو اس کی سرشت میں شامل کر دیا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت۔۵۶)

مَیں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

یہاں بندگی سے مراد محض نماز، روزہ اور تسبیح و تہلیل ہی نہیں بلکہ اس نوعیت کی عبادت کے ساتھ ساتھ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرمانبرداری اور نیازمندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے، ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجا لانا، کسی اور سے ڈرنا، کسی اور کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا اور کسی اور ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں صرف ایک خدا کی کامل اطاعت و

فرمانبرداری اور اسی کے احکام کی بجاآوری کا نام بندگی ہے۔

انسان کو دل و دماغ کی ساری صلاحیتیں اور جسم کی ساری قوتیں اسی بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دی گئی ہیں۔ اس حیثیت بندگی کو نظر انداز کرنے کا مطلب انسان کا خود اپنی ذات اور اپنی فطرت سے باغی ہو جانا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود اپنی خدائی کا مدعی بن بیٹھے یا اپنا سر کسی جھوٹے خدا کے سامنے جھکا دے۔ انسان جوں ہی بغاوت کی اس راہ پر قدم بڑھاتا ہے اس کی ذات سے ظلم و فساد کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ نے چونکہ تمام انسانوں کو ایک ہی فطرت پر پیدا کیا ہے اس لیے کسی کا حاکم بن جانا اور کسی کا محکوم ہو جانا دونوں ہی صورتیں خلافِ فطرت ہیں۔ حاکمیت خواہ بادشاہ اور آمر کی صورت میں کسی ایک فرد کی ہو یا پارلیمنٹ کی صورت میں بہت سے منتخب افراد کی، کسی ایک ریاست کے شہریوں کی ہو یا بحیثیت مجموعی پوری دنیا کے عوام کی "ظلم ہر صورت میں سر ابھار کر رہے گا۔ کیونکہ انسان کی حاکمیت ہر انفرادی و اجتماعی شکل میں ایک ایسے مقتدر اعلیٰ کو وجود میں لے آتی ہے جو حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کی جگہ نہیں لے سکتا اور یہی فساد فی الارض کی اصل جڑ ہے

اس فساد کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی قائم بالذات ہستی، اپنی غیر فانی حیثیت، اپنی قوتِ تخلیق، اپنی شانِ ربوبیت اور اپنی دوسری لامحدود و بے مثال صفات کی بناء پر مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ اس کا اقتدار کسی کا بخشا ہوا نہیں اس کی ذات کا حصہ ہے۔ اس کے اختیارات کا ماخذ کوئی اور نہیں خود اس کی اپنی ذات ہے۔ وہ خود ہر چیز اور ہر سہارے سے بے نیاز ہے وہ کسی سے کچھ نہیں لیتا اور اس کی دین کا دائرہ اس کائنات کے ایک ایک ذرہ تک پھیلا ہوا ہے۔ سب اسی کے محتاج ہیں لیکن وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس لیے اقتدار اعلیٰ کا منصب اسی کو سزاوار ہے۔ لیکن اس کے سوا جو کوئی بھی اپنی حاکمیت و فرمانروائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے وہ ان میں سے کسی ایک صفت کا بھی حامل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں، اپنے علم و شعور، اپنے جذبات و احساسات، اپنی ضروریات اور خواہشات اور اپنے اختیار و ارادہ

کی فطری حدود (Limitations) کے لحاظ سے عام لوگوں ہی کی طرح ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ان حدود اور تمام بشری کمزوریوں کے باوجود دوسروں پر اپنی برتری کا سکہ کیسے جمائے، اپنی حاکمیت و فرمانروائی کا اظہار کس طرح کرے اور دوسروں کو اپنی اطاعت و محکومی پر کیونکر آمادہ کرے؟ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ خود کو بڑا بنانے کے لیے وہ اپنے دائرہ اقتدار میں رہنے والے لوگوں ہی سے اختیاراتِ حکمرانی، حقوق و مراعات، مال و دولت، جاہ و حشمت اور اپنی جان کی حفاظت سے لے کر مسندِ اقتدار کے تحفظ تک کی ضروریات پوری کرنے والے ذرائع و وسائل سمیٹ سمیٹ کر اپنے قبضے میں کرے اور پھر حاصل شدہ اختیارات و وسائل کو منظم کر کے مزید حصولِ اختیارات و وسائل کے لیے استعمال کرے۔ اور جب ملکی وسائل اس کی خواہشات و ضروریات کے لیے کافی نہ رہیں تو پڑوسیوں پر چڑھ دوڑے، ان کے انسانی و مادی وسائل پر قبضہ کرے اور اس طرح اپنے دائرہ اقتدار کو وسعت دینے کی مسلسل جدوجہد میں لگا رہے اور اس راہ میں اسی نوعیت کی جدوجہد کرنے والے جتنے لوگ بھی ملتے چلے جائیں وہ بزوران کا وجود مٹاتا یا ان کی قوت سے ٹکرا کر مٹتا چلا جائے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کے لیے موجود نہیں کیونکہ قرآن کی پیش کردہ مثال کے مطابق وہ خود تو ایک مکھی بنانے یا اس کے قبضے سے کوئی چیز چھڑانے تک پر قادر نہیں ہے۔ اس کا سارا کاروبارِ حکومت دوسروں سے حاصل کردہ اختیارات اور ان سے چھینے ہوئے وسائل کے ذریعہ چلتا ہے۔ یہ اختیارات و وسائل جس نسبت سے کھنچ کھنچ کر اس کے قبضے میں آتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے اس کی مطلق العنانی، اس کے رعب و دبدبہ، اس کے محلوں کی وسعت و رفعت، اس کے اسباب عیش کی فراوانی اور اس کے دائرہ اختیار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ٹھیک اسی نسبت سے اس کے پنجۂ اقتدار میں جکڑے ہوئے لوگ اپنی آزادی، اپنے حقوق، اپنے وسائل رزق اور اپنے شرف و وقار سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دنیا کے اکثر ممالک میں اسی نوعیت کی حکمرانی کا تسلط ہے۔ بڑی طاقتوں (Super

Powers) کی عالمی سیاست بھی اسی نہج پر چل رہی ہے۔ انسان نے جب اور جہاں خدا کی بندگی سے آزاد ہو کر اپنی حکمرانی کا سکہ چلایا ہے نتیجہ ایک ہی نکلا۔ بے ظلم اور پیہم ظلم۔ ظلم کے بغیر انسان کی حاکمیت کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں۔

اس مرض کا علاج نہ انسان کے وضع کردہ کسی دستور کے ذریعہ ممکن ہے اور نہ انسان کی حاکمیت کے تصور پر مبنی کسی بھی نظام حکومت کی تبدیلی کے ذریعہ، اس سے نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ انسان سیدھی طرح خدا کے حقِ حاکمیت کو تسلیم کر کے اپنی حیثیت بندگی پر واپس آجائے نہ خود خدا بننے کی کوشش کرے اور نہ کسی دوسرے کو خدا بن کر اپنے اوپر مسلط ہونے کی اجازت دے۔

◎

بنیادی حقوق کا اسلامی تصوّر

گزشتہ باب میں اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ، انسان کے عہدِ بندگی، دنیا میں انسان کے منصبِ خلافت، خدا کے عطا کردہ ضابطہ حیات کی پابندی، آخرت میں اعمال کی جوابدہی اور ان اعمال کے مطابق دائمی جزا۔ وسزا کی بحث سے اسلام کے تصور بنیادی حقوق کی بڑی حد تک وضاحت ہو گئی ہے۔ تاہم اس کی مزید تشریح و توضیح کے لیے اب ہم اس کا تاریخی، قانونی اور اخلاقی پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہیں۔

تاریخی پہلو

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں بنیادی حقوق کا تصوّر اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود۔ انسان کے خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لیے ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسبابِ زندگی فراہم کیے ہیں اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ضابطۂ حیات بھی آغازِ زندگی کے ساتھ ہی عطا کر دیا تھا۔ قرآن اس حقیقت کی واضح شہادت مہیا کرتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں بھیجنے اور منصبِ خلافت پر فائز کرنے سے پہلے اسے حقوق و فرائض کا شعور عطا کر دیا گیا تھا اور اسبابِ زندگی کی فراہمی کے ساتھ ہی آدابِ زندگی بھی سکھا دیئے گئے تھے۔ اس دنیا میں آنے والے اوّلین انسان نے

اپنی زندگی کا آغاز جہل کی تاریکی میں نہیں علم کی روشنی میں کیا تھا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ۔ ۳۱) اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے

یہاں لفظ کُلَّهَا پر غور کیجئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علم ادھورا نہیں، کامل تھا، انسان کو اس دنیا میں جن چیزوں سے واسطہ پڑنا تھا ان سب کے نام اسے سکھا دیئے گئے تھے۔ نام سکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ محض اشیاء کو گنوا دیا گیا ہو بلکہ ان کے آثار و خواص، نافع اور مضر پہلو، ان کے استعمال کے طریقے اور اس کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کو پوری طرح واضح کر دیا گیا۔ زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان اپنے بنیادی علم اور تحقیق و تجسس کی جبلت کے ذریعہ اس علم الاشیاء کا دائرہ وسیع کرتا گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"انسان کے علم کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعہ سے اشیاء کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں حضرت آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھانا گویا ان تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۶۴)

اس علم میں یہ بات بھی لازماً شامل تھی کہ انسان کو مختلف اشیاء سے متعلق اپنے حقوق و فرائض کا بھی پورا شعور ہو چنانچہ حضرت آدمؑ کی زندگی ہی میں جب "حق" کا پہلا مسئلہ پیدا ہوا تو ساتھ ہی یہ حقیقت بھی عیاں ہو گئی کہ انسان محض اپنے قیاس و گمان یا وجدان کی بناء پر نہیں بلکہ خدا کے مقرر کردہ ضابطہ کی وجہ سے اس حق کے احترام کا شعور رکھتا تھا۔ قابیل نے جب خدا کے حضور اپنی نذر قبول نہ ہونے کے بعد ہابیل کو قتل کی دھمکی دی تو ادھر سے یہ جواب ملتا ہے:

"اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا میں اللہ ربّ العٰلمین سے ڈرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ

ہے۔" (المائدہ۔۲۹)

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ ہابیل کو انسانی جان کے احترام و تحفظ سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہدایات کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک گناہ کا کام ہے اور اس کا مرتکب جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس نے محض خوف خدا کی بنا پر اپنی جان دے دی مگر بھائی پر ہاتھ اٹھانا گوارا نہ کیا۔

حضرت آدمؑ کو خدا، بندگانِ خدا اور دوسری مخلوقات خدا کے سلسلہ میں حقوق و فرائض کا جو ضابطہ عطا کیا گیا تھا وہ انسانی زندگی کے مختلف ارتقائی مراحل میں وقت کے مسائل و تقاضوں کے مطابق نئی تشریحات، توضیحات اور اضافی احکام کے ساتھ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک مبعوث ہونے والے انبیاء کرام کے ذریعہ انسانیت کو اپنی ہدایت و رہنمائی کے لیے مسلسل ملتا رہا۔ انسانی تعلقات کے دائرے جوں جوں پھیلتے گئے ان کو منضبط کرنے والے احکام بھی نازل ہوتے رہے تا آنکہ نبی آخرالزمانؐ پر آکر انسانیت کی تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ مکمل ہو گیا اور اعلان کر دیا گیا:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (المائدہ۔۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

یہ دین جو حضرت محمدؐ پر آکر مکمل ہوا چلا کہاں سے تھا؟ اس کی تاریخ ملاحظہ ہو:

"اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمرانؑ کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک ہی سلسلہ کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوتے تھے" (آلِ عمران۔۳۴)

گویا حضرت آدمؑ سے انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے جس سلسلہ کا آغاز ہوا تھا وہ کسی تعطل کے بغیر یکے بعد دیگرے مختلف انبیاءؑ کے ذریعہ مسلسل قائم رہا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ بات صرف اتنی ہی نہیں کہ الہامی تعلیمات تسلسل کے ساتھ جاری رہیں۔ بلکہ اس سے بھی اہم ترحقیقت

یہ ہے کہ تمام انبیاء کرامؑ کسی فرق و اختلاف کے بغیر ایک ہی دین کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہے۔ اُن کا مشن ایک تھا وہ ایک ہی ضابطہ حیات کے علمبردار تھے اور یہ ضابطہ حیات ان کا مقرر کردہ نہیں بلکہ انہیں منصبِ رسالت پر مامور کرنے والے مقتدرِ اعلیٰ کا عطا کردہ تھا۔

"اللہ نے مقرر کر دیا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ) تمہاری طرف اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ (الشوریٰ۔۱۳)

یہ دین محض عقائد کی اصلاح تک محدود نہیں تھا بلکہ اصلاحِ عقائد سے لے کر زندگی کے تمام معاملات کی درستی تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق مفصل ہدایات موجود تھیں۔

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا (الاعراف۔۱۴۵)

اور ہم نے موسیٰؑ کو ہر شعبہ زندگی سے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دی اور اس سے کہا ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔

اب خالص حقوق و فرائض کی زبان میں سنیئے کہ یہ دین اور اس کی مفصل ہدایات کیا تھیں ؟۔

"یاد کرو! اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا ' ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھرے ہوتے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو

ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔" (البقرہ ۸۲-۸۴)

اسی سورۃ میں ایک فرد کے آسمان سے لے کر زمین تک پھیلے ہوتے تمام تعلقات سے متعلق الہامی احکام و ہدایات کی جانب اشارہ کرتے ہوتے فرمایا گیا:

"جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔"

حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔" (البقرہ۔ ۲۷)

یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرائی گئی ہے :

"جو لوگ ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں وہ سخت لعنت کے مستحق ہیں اور ان کیلئے آخرت میں برا ٹھکانا ہے۔" (الرعد۔ ۲۵)

ان روابط اور رشتوں کی تشریح کرتے ہوتے مولانا مودودی لکھتے ہیں :

"یعنی جن روابط کے قیام اور استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے اور جنہیں درست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ان پر یہ لوگ تیشہ چلاتے ہیں۔ اس مختصر سے جملہ میں اس قدر وسعت ہے کہ انسانی تمدن و اخلاق کی پوری دنیا پر، جو دو آدمیوں کے تعلقات سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات تک پھیلی ہوتی ہے، صرف یہی ایک جملہ حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کو کاٹنے سے مراد محض تعلقاتِ انسانی کا انقطاع ہی نہیں بلکہ تعلقات کی صحیح اور جائز صورتوں کے سوا جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی وہ سب اسی ذیل میں آجائیں گی کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطع روابط کا ہے یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظامِ اخلاق و تمدن کی بربادی۔" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ نمبر ۶۱)

قرآن کی پیش کردہ یہ تاریخ انسانی حقوق اس امر کا واضح ثبوت مہیا کر دیتی ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اولین انسان کی پیدائش کے دن سے موجود ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان حقوق کا ماخذ کیا ہے۔ یہ انسان اور اس کی خود ساختہ ریاست کے حکمرانوں کی باہمی نزاع و کش مکش اور ان کے درمیان ہونے والے معاہدوں سے وجود میں نہیں آئے۔ اور نہ کسی فلسفی، سیاسی مفکر یا ماہر قانون کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ یہ اپنی مخلوق کے لیے خالق اور اپنی رعایا کے لیے حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کا عطیہ ہیں۔ اور انسان کی ذات سے لازماً وابستہ ہیں ان کا تعین انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، ان کی آخری اور مفصل وضاحت حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت میں کر دی گئی ہے۔ یہ حقوق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ انسان اگر زمین سے پرواز کر کے چاند یا کسی اور سیارے پر جا بسے تو وہاں بھی ان کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ جس طرح تبدیلیٔ زمان و مکان سے انسان کی جسمانی ساخت اور اس کی فطری ضروریات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اسی طرح اس کے حقوق و فرائض کی دائمی حیثیت میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو گی۔ یہ حقوق ناقابلِ تغیر اور قطعی غیر منفک (Inalienable) ہیں۔ ریاست کا کام حقوق کا تعین نہیں بلکہ متعین حقوق کا نفاذ ہے۔

اہلِ مغرب کا دعویٰ ہے کہ بنیادی حقوق کی تاریخ صرف تین چار سو سال پرانی ہے۔ اور انہوں نے اس عرصے میں اپنے ہاں بڑی جد و جہد اور کاوشوں سے جو کچھ حاصل کیا ہے، آج پوری دنیا اس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ لیکن قرآن جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس دن اولین انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا بنیادی حقوق اسی دن سے اس کے احساس و شعور کا حصہ ہیں۔ اور ان کا حصول و تعین اس کا اپنا کارنامہ نہیں بلکہ خود مقتدرِ اعلیٰ نے اسے بتدریج یہ حقوق عطا کیے ہیں۔ آج جہاں کہیں ان حقوق کی بازگشت سنائی دے رہی ہے وہاں الہامی تعلیمات کے پرتو ہی سے بنیادی حقوق کا شعور بیدار ہوا ہے۔

نارمن کزنس (Norman Cousins) کی کتاب "ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں (In God

we Trust" مطبوعہ نیویارک ۱۹۵۰ء میں امریکہ کے بانیانِ دستور (Founding Fathers)
کے مذہبی عقائد پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ بنجامن فرینکلن (Benjamin
Franklin) جارج واشنگٹن (George Washington) جان ایڈمز (John Adams)
تھامس جیفرسن (Thomas Jefferson) جیمز میڈیسن (James Madison) الیگزنڈر
ہملٹن (Allexender Hamilton) سیموئل آدم (Samuel Adam) جان جے (John
Jay) اور تھامس پین (Thomas Paine) سب کے سب عیسائیت کی تعلیمات پر پختہ
یقین رکھتے تھے اور ان کے خیالات پر ان کے عقائد کا گہرا اثر تھا۔ جیمز میڈیسن "حق" کی تعریف
بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"یہاں ایک انسان کا جو بھی حق ہے وہ دراصل دوسرے انسانوں پر خدا کی طرف
سے عائد ہونے والا فرض ہے۔" ص ۱۷

اسی طرح برطانوی اور فرانسیسی دساتیر کا مطالعہ اگر مذہبی پس منظر کے ساتھ کیا جائے تو
وہاں بھی بنیادی حقوق کا اصل ماخذ مذہبی تعلیمات اور بالخصوص یورپ پر اسلام کے گہرے اثرات
میں ملے گا۔

قرآن کی پیش کردہ تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو فطری حقوق (Natural Rights)
اور پیدائشی حقوق (Birth Rights) کی اصطلاح استعمال کرنے کا حق صرف اسلام کو ہے کیونکہ ان
اصطلاحوں کے سلسلہ میں مغرب کے تصورِ حقوق میں جو ابہام پایا جاتا ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔
اسلام اس سوال کا واضح جواب دیتا ہے کہ ان حقوق کو متعین کس نے کیا ہے جبکہ نظریہ فطری حقوق
کے مغربی علمبردار بینتھم (Bentham) اور دوسرے معترضین کے اس سوال کا کوئی معقول جواب
نہیں دے سکے کہ فطرت سے ان کی کیا مراد ہے؟ اور ان حقوق کا تعین کرنے والی اتھارٹی کون
سی ہے؟ بہ الفاظِ دیگر ان کی پشت پر سندِ جواز (Sanction) کیا ہے؟ اسلام نے حقوق کے
فطری اور پیدائشی پہلو کو پوری وضاحت سے پیش کر کے اس طرح کے کسی اعتراض کی گنجائش

نہیں چھوڑی ہے۔

قانونی پہلو

اب ان حقوق کے قانونی پہلو کا جائزہ لیجیے۔ اس سلسلہ میں ایک عام غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ہم مغرب کے پیش کردہ تصورِ بنیادی حقوق کو بطور معیار اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اور پھر قرآن و سنت سے چن چن کر ایسے حقوق کی ایک فہرست مرتب کر لیتے ہیں جو اس معیار پر پورے اترتے ہوں۔ اور اس کے محدود دائرہ اطلاق سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس اندازِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا تصورِ حقوق مغرب کے تصورِ حقوق کا تابع ہو کر ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے حقیقی خدوخال پوری طرح اجاگر نہیں ہو پاتے۔

مغرب میں بنیادی حقوق کا دائرہ صرف فرد اور ریاست کے تعلقات تک محدود ہے۔ وہاں ان حقوق کو بنیادی قرار دیا جاتا ہے۔ جو ریاست کے وسیع اختیارات کے مقابلے میں ایک شہری کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت دفاعی (Defensive) اور حفاظتی (Protective) ہے اور ان کا بنیادی مقصد بے اختیار شہریوں کو با اختیار حکمرانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھنا ہے۔ جس دستور میں ان حقوق کو شامل کیا جاتا ہے اس میں فرد اور ریاست باہم فریق نظر آتے ہیں۔ اور دستور کی حیثیت ان کے درمیان ایک سمجھوتے کی سی ہوتی ہے جس میں ایک فریق کے لیے تسلیم شدہ اختیارات اور دوسرے کے لیے تسلیم شدہ حقوق کی حدود متعین کر دی جاتی ہیں۔

اس کے برعکس اسلام میں عام شہری اور ان کی ریاست کے حکمران باہم فریق نہیں ہیں نہ شہری کے حقوق حکمران کے تسلیم شدہ ہیں اور نہ حکمران کے اختیارات شہری کے منظور کردہ، ان کے درمیان آپس کی رضامندی اور اتفاق رائے سے مرتب ہونے والی کوئی ایسی آئینی دستاویز بھی نہیں جس میں حسبِ منشا حقوق و اختیارات کی حدود متعین کر لی گئی ہوں۔ یہ دونوں یکساں حیثیت میں اپنے رب اور حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کے ساتھ ایک عہدِ وفاداری میں بندھے

ہوتے ہیں۔ بحیثیت خلیفۃُ اللہ ان کا منصب بھی ایک ہے۔ کیونکہ خلافت کسی فرد یا گروہ کو نہیں بلکہ مِنْ حَیْثِ الْجَمَاعَتْ پوری امتِ مسلمہ کو سونپی گئی ہے۔

"اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیا ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں (مومنین وصالحین) کو خلیفہ بنایا تھا۔" (النور۔ ۵۵)

اس آیت سے واضح ہے کہ خلافت کا نیابتی اقتدار تمام مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ اسی بناء پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے "خلیفۃ اللہ کہلانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ خلافت تو دراصل پوری امت کو عطا کی گئی تھی نہ کہ ان کی ذات کو۔ ان کی خلافت کی اصل حیثیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اپنے اختیاراتِ خلافت ان کے سپرد کر دیئے تھے۔ خلافت کی اسی حقیقت کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے "امیر المومنین" کے خطاب پر اظہارِ پسندیدگی فرمایا اور پھر یہی اصطلاح بعد کے خلفائے راشدین کے لیے بھی مروج رہی۔

مسلمانوں کا امیر اور اس کی حدودِ امارت میں بسنے والے شہری اپنے اپنے دائرہ عمل میں حدود اللہ کے پابند ہیں۔ ان کے اختیارات اور حقوق باہمی طور پر تسلیم شدہ نہیں بلکہ حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کے طے کردہ ہیں۔ یہ دونوں قرآن و سنت کے ایک ایسے ناقابلِ ترمیم اور ناقابلِ تنسیخ (Irrevocable) دستور کے تحت زندگی بسر کرنے کے پابند ہیں جس کی کوئی ایک دفعہ بھی ان کے درمیان قابلِ گفت و شنید (Negotiable) نہیں۔ ان کے حقوق اور اختیارات میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ یہ دو ایسے متصل دائرے ہیں جن کے خطوط کہیں ایک دوسرے کو منقطع نہیں کرتے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اسلامی ریاست میں بنیادی حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دنیا کے عام دساتیر کی طرح یہ فرد اور ریاست کے باہمی تعلق تک محدود نہیں۔ قرآن کے دستور کا دائرہ اطلاق انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ قرآن نے فرد اور ریاست ہی کے

درمیان نہیں عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، صلح و جنگ اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں پھیلے ہوئے بے شمار تعلقات کو اس طرح منضبط کر دیا ہے کہ ریاست کے لیے قانون سازی کی گنجائش بہت محدود رہ گئی ہے۔ اور اس محدود گنجائش میں بھی آزادانہ قانون سازی کی اجازت نہیں بلکہ یہ شرط عائد ہے کہ ہر قانون قرآن و سنت کے احکام اور ان کی روح کے مطابق ہوگا۔

اب خدا کے قانون اور اس کے رسولؐ کی سنت نے ایک فرد کے لیے جو حقوق مقرر کر دیئے ہیں وہ جزوِ دستور ہونے، ریاست کے اختیاراتِ قانون سازی سے ماوراء ہونے اور عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول ہونے کی بناء پر بلا استثناء سب کے سب بنیادی حقوق ہیں۔ ان حقوق میں صرف تحفظِ جان، تحفظِ عزت، تحفظِ ملکیت، حصولِ انصاف، مساوات، آزادی اظہارِ رائے اور آزادیٔ عقیدہ جیسے حقوق ہی شامل نہیں بلکہ ایک نوزائیدہ بچے کی مدتِ رضاعت سے لے کر ایک عورت کے حقِ مہر تک کے وہ تمام حقوق شامل ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن میں اب کسی کو رد و بدل کا اختیار نہیں۔ قرآن نے انسان کے اختیارِ قانون سازی پر عائد کی جانے والی حدود کے لیے "حدود اللہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی اللہ کی قائم کردہ حدود۔ یہ حدود فرد اور ریاست دونوں پر یکساں عائد ہوتی ہیں۔ اللہ نے جس چیز کو حلال ٹھہرا کر انسان کو اس کا حقِ استفادہ عطا کر دیا ہے اسے اب نہ کوئی فرد حرام ٹھہرا سکتا ہے اور نہ اسلامی ریاست یا پوری قوم مل کر اسے حرام ٹھہرا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی فرد خود اپنی ذات کے لیے بھی اسے حرام قرار دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ ان حدود کی پابندی کے سلسلہ میں قرآن کی یہ ہدایات ملاحظہ ہوں۔

سورۃ بقرہ میں روزہ سے متعلق احکام دینے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا" (البقرہ - ۱۸۷)

اہلِ ایمان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے اس کی بندگی بجا لانے والے، اس کی تعریف کے گن گانے والے اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دیتے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے۔" (التوبہ۔ ۱۱۲)

قرآن نے واضح ترین الفاظ میں کہا ہے کہ انسان کو ان امور میں جن میں خدا کا قانون موجود ہو، قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں، نہ اسے حلال وحرام اور جائز و ناجائز ٹھہرانے کا کوئی حق ہے۔ اس کا کام بس خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کی بجا آوری ہے۔

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی پیروی نہ کرو۔" (الاعراف۔ ۳)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں ــــ وہی ظالم ہیں وہی فاسق ہیں (المائدہ ۴۴-۴۵-۴۷)

"اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کر لو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔" (المائدہ۔ ۸۷)

"اے نبیؐ! ان سے کہو تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا اس میں تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا۔ ان سے پوچھو" اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی"؟ (یونس۔ ۵۹)

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔" (النحل۔ ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں ہی کے اختیارِ قانون سازی پر پابندیاں عائد نہیں کیں بلکہ اپنے نبیؐ کو بھی یہ اختیار نہیں دیا کہ جس معاملہ میں خدا کا حکم موجود ہو وہ اپنی مرضی سے اس میں کوئی رد و بدل کر سکے۔

"اے محمدؐ! کہہ دو کہ میں اس کتاب کو اپنی طرف سے بدلنے کا حق نہیں رکھتا میں تو صرف اسی وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف اتاری جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے (یونس۔۱۵)

چنانچہ حضورؐ نے جب بعض ازواج مطہرات کی خوشنودی کی خاطر شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تو اللہ نے اس پر اعتساب فرمایا:

"اے نبیؐ! کیا تم اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ (کیا اس لیے) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو" (التحریم۔۱)

حضورؐ نے شہد کو عام مسلمانوں کے لیے حرام نہیں ٹھہرایا تھا کیونکہ یہ بات تو خدا کے رسول کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دے ڈالے۔ آپ نے اسے محض اپنی ذات کے لیے ممنوع ٹھہرا لیا تھا۔ لیکن آپ کا عمل چونکہ مسلمانوں کے لیے حجت بن سکتا تھا اس لیے آپ کو فوراً ٹوکا گیا اور بتایا گیا کہ جس چیز کو خدا نے حلال قرار دیا ہے اسے اب آپ خود اپنی ذات کے لیے بھی حرام یا ممنوع ٹھہرانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

ایک طرف تو خدا کے احکام کے معاملہ میں نبیؐ کے اختیارات کی یہ کیفیت ہے۔ لیکن دوسری طرف قرآن یہ بات بھی واضح کر دیتا ہے کہ جن امور میں خدا کا کوئی حکم موجود نہ ہو، یا خدا کے حکم کی تشریح و توضیح مطلوب ہو وہاں نبیؐ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہے اور اسے خدا ہی کے حکم کا درجہ حاصل ہے۔ خدا کا رسول چونکہ اس زمین پر خدا کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا مظہر ہے اس لیے اس کی تشریحی (Interpretative) اور تشریعی (Legisl-ative) حیثیت یہ کہہ کر متعین کر دی گئی۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۔۸۰)

جو رسولؐ کی اطاعت کرے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر۔ ۷)

اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے تم کو روک دیں اس سے رُک جاؤ۔

قرآن اور سنتِ رسولؐ کی اس حیثیت کو مدِّ نظر رکھ کر اسلامی ریاست میں قرآن و سنّت پر مبنی دستور کے تحت انسان کے بنیادی حقوق کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں وہ سارے حقوق شامل کیے جائیں گے جو خدا اور رسول کے مقرر کردہ ہیں خواہ ان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) اور قانونی حقوق (Legal Rights) میں آخر اس کے سوا اور کیا فرق ہے کہ بنیادی حقوق ناقابلِ ترمیم و تنسیخ ہیں۔ یہ ریاست کے عام اختیاراتِ قانون سازی سے ماوراء ہیں۔ انہیں خود دستور میں دیے گئے غیر معمولی طریقہ کار کے سوا اور کسی طریقے سے محدود یا معطل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ریاست کے اختیاراتِ قانون سازی پر پابندیاں عائد کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں شہریوں کو تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ انہیں عدلیہ کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس کی مدد سے انتظامیہ کو ظلم و ستم سے باز رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس قانونی حقوق عام قانون سازی (Legislation) کے دائرہ میں آتے ہیں اور ریاست جب چاہے اپنے اختیاراتِ قانون سازی کے ذریعہ ان میں ترمیم و تنسیخ اور کمی بیشی کر سکتی ہے۔

بنیادی اور قانونی حقوق کے اس فرق کو ذہن نشین رکھتے ہوئے غور کیجیے کہ قرآن و سنّت کے عطا کردہ ہر اس حق کو جو ریاست کے اختیاراتِ قانون سازی سے ماوراء ہے، جو عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول ہے اور جس کے بارے میں خود قرآن و سنت نے ریاست کو کوئی ایسا غیر معمولی اختیار نہیں بخشا جس کا سہارا لے کر وہ خصوصی حالات یا ہنگامی حالات کے بہانے اس حق کو سلب، محدود یا معطل کر سکتی ہو وہ کس بناء پر بنیادی حقوق کی فہرست سے باہر رکھا جاتے؟ محض اس لیے کہ اہلِ مغرب صرف فرد اور ریاست کے باہمی رشتے سے تعلق رکھنے والے

حقوق کو بنیادی حقوق مانتے ہیں! یہ دلیل مغرب کے اتباع پر آمادگی کے لیے تو دی جا سکتی ہے لیکن خود بنیادی حقوق کی معروف قانونی اصطلاح اور اس کے مفہوم کی روشنی میں اس کا وزن کیا ہے؟ جس حق کو اٹل اور دائمی حیثیت حاصل ہے، جسے ریاست بدلنے اور منسوخ کرنے پر قادر نہیں۔ جو عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول ہے۔ وہ قانون کی کسی بھی تعبیر کے مطابق لازماً ایک بنیادی حق قرار پائے گا۔

کسی عورت کو اگر ایسی صورت میں جب اس کی گود میں بچہ ہو طلاق دے دی جائے تو قرآن، بچے، مطلقہ عورت اور شوہر کے درمیان حقوق و فرائض کا یہ ضابطہ متعین کرتا ہے:۔

"جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈال دیا جائے کہ بچہ اس کا ہے، اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن فریقین اگر باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ اس کا کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کر دو۔" (البقرہ ۲۳۳)

اس آیت میں ایک نوزائیدہ بچے، اس کی ماں اور اس کے باپ کے لیے جو حقوق متعین کیے گئے ہیں وہ سب کے سب بنیادی حقوق کی ذیل میں آتے ہیں کیونکہ یہ مملکت کے دستور کا ایک حصہ ہیں۔ مقتدرِ اعلیٰ کے حکم سے متعین ہوتے ہیں، عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول ہیں اور ریاست ضابطہ سے ہٹ کر اس معاملہ میں کوئی دوسرا قانون وضع نہیں کر سکتی۔ قرآن نے ایک

بچے کے لیے جو مدتِ رضاعت مقرر کر دی ہے وہ اس میں ایک دن کی کمی بیشی تک کا اختیار نہیں رکھتی۔ اسلامی ریاست میں بچے کے اس حق کی حیثیت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک عورت غامدیہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر چار بار اقرار کرتی ہے کہ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوا ہے اور میں حاملہ ہوں مجھے سنگسار کر کے پاک کر دیجئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں "اچھا نہیں مانتی تو جا، وضعِ حمل کے بعد آئیو" وہ وضعِ حمل کے بعد بچے کو گود میں لے کر آتی ہے اور پھر درخواست کرتی ہے کہ مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ فرماتے ہیں "جا اور اس کو دودھ پلا، دودھ چھوٹنے کے بعد آئیو" وہ دودھ چھڑانے کے بعد آتی ہے تو ساتھ ہی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی لے آتی ہے۔ اس نے بچے کو روٹی کا ٹکڑا کھلا کر حضورؐ کو دکھایا اور عرض کیا "یا رسول اللہ اب اس کا دودھ چھوٹ گیا ہے اور دیکھئے یہ روٹی کھانے لگا ہے۔" تب آپؐ نے بچے کو پرورش کے لیے ایک شخص کے حوالے کیا اور اس کے رجم کا حکم دیا۔" (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۳۴۶)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے پہلے تحفظِ جان کی خاطر اور دوسری بار مدتِ رضاعت کی تکمیل کی خاطر حد جاری کرنے سے گریز فرمایا۔ اور جب بچے کو روٹی کھاتے دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ اب اسے زندہ رہنے کے لیے ماں کے دودھ کی ضرورت نہیں رہی تب حد جاری فرمائی۔ اس واقعہ میں دو بنیادی حقوق متاثر ہوتے تھے۔ ایک تحفظِ جان کا دوسرا مقررہ مدتِ رضاعت کی تکمیل کا۔ آپ نے ان دونوں حقوق کے نفاذ تک زنا جیسے فعل کی سزا کو ملتوی کر کے واضح کر دیا کہ اسلام میں عام شہری تو کجا شکمِ مادر میں پرورش پانے والے اور دودھ پیتے بچے تک کے حقوق کی کیا حیثیت ہے! حضورؐ کا یہ فیصلہ ایک قانونی نظیر ہے۔ اور اب اسی نوعیت کے کسی واقعہ میں اسلامی ریاست کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ گویا اس کا اختیارِ قانون سازی اس فیصلے کے اتباع کا پابند ہے اور یہی پابندی بچے کے حقِ ولادت اور حقِ رضاعت تک کو بنیادی حقوق کی ذیل میں لے آتی ہے۔

عدالت نبویؐ کے اس فیصلے سے ایک اور حق بھی متعین ہوتا ہے۔ ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ معصوم سمجھا جائے گا اور اسلامی ریاست جہاں اس کے والدین پر حد جاری کرے گی وہاں اس بچہ کی پرورش و نگہداشت کا اہتمام بھی کرے گی۔ گویا بچے کو حق ولادت اور حق رضاعت کے ساتھ ساتھ حق کفالت بھی حاصل ہوگا اور اسے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا بلکہ معاشرے میں دوسرے بچوں کے مساوی حیثیت دی جائے گی۔

اب ایک اور حق کو لیجئے جسے بالعموم اخلاقی حقوق کے دائرہ میں رکھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ بنیادی حق ہے، خدا اور خدا کے نبیؐ نے اسے یہی حیثیت دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔" (بنی اسرائیل ۲۴)

اس آیت کی بنیاد پر نبی اکرمؐ کی عدالت سے صادر ہونے والے دو فیصلوں کی نظیر ملاحظہ فرمائیے :

(۱) "ایک شخص نے اپنے والدین کے خلاف ـــ نبی اکرمؐ کے حضور دعویٰ کیا کہ میرا باپ میرا مال کھا رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو اور تیرا مال دونوں تیرے باپ کے ہیں، پھر اس کے باپ کو حکم دیا کہ تم اس کے مال سے فائدہ اٹھاؤ اور اگر یہ انکار کرے تو مجھے اطلاع دو میں اس کے مقابلے میں تمہاری مدد کروں گا۔" ع۱

(۲) "ایک شخص نے رسولؐ اللہ کی خدمت میں عرض کیا، یارسولؐ اللہ میرا باپ مجھ سے میرا مال مانگتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے دے دو۔ اس نے کہا، وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے دستبردار ہو جاؤں۔ فرمایا تو اس کے لیے دستبردار ہو جاؤ۔ راوی کہتا ہے کہ نبیؐ کریم نے اس شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی مت کرو۔ اور اگر وہ تم سے یہ تقاضا کریں کہ تم ہمارے لیے اس دنیا سے نکل جاؤ تو ان کے لیے اس سے بھی نکل جاؤ۔" ع۲

خدا کے حکم اور عدالت نبویؐ کے اس فیصلے کی روشنی میں فقہا نے والدین کے حقوق و اختیارات کا بالتفصیل تعین کیا ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ محض اخلاقی سفارش نہیں ہے بلکہ بنیادی حق ہے۔ جسے کوئی حکومت اپنے اختیاراتِ قانون سازی سے تبدیل نہیں کر سکتی۔ وہ اولاد کو والدین کی کفالت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کر سکتی۔

اب مہر کا معاملہ لیجیے۔ اپنے شوہر پر بیوی کا یہ حق ہے کہ وہ قرارداد نکاح کے مطابق اسے مہر ادا کرے۔ بیوی کا یہ حق خود قرآن نے متعین کیا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (النساء ۴)

اور عورتوں کے حقوق خوش دلی کیساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ (النساء ۲۴)

پھر جو ازدواجی زندگی کا لطف تم ان سے اٹھاؤ اس کے بدلے ان کے مہر بطورِ فرض ادا کرو۔

گویا قرآن نے مہر کو عورت کا ایک ایسا حق قرار دیا ہے جس کی ادائیگی شوہر پر لازم ہے الّا کہ خود بیوی کسی جبر کے بغیر اپنی مرضی سے اس حق کو چھوڑ دے۔ اسلامی ریاست

کو یہ اختیار بہرحال حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی قانون سازی کے ذریعہ عورت کے اس حق کو ساقط یا محدود کر دے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب اپنے دورِ خلافت میں عورتوں کے حقِ مہر پر پابندی لگا کر اسے محدود کرنا چاہا اور دورانِ خطبہ فرمایا:

"عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ چاندی سے نہ بڑھاؤ اگرچہ وہ کتنے ہی مالدار کی بیٹی کیوں نہ ہو۔ جو زیادہ مہر دے گا میں اس کے زیادہ مال کو بیت المال میں داخل کردوں گا۔"

تو عورتوں کی صف سے ایک دراز قد عورت اٹھی اور بلند آواز سے کہا "آپ کو یہ حق نہیں پہنچا" دریافت فرمایا "کیسے"؟

وہ بولی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (النساء ۲۰)

"خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟"

حضرت عمرؓ نے یہ جواب سن کر فرمایا "عورت نے سچ کہا اور مرد نے غلطی کی۔"[۳]

اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ آپ قانون کے ذریعہ جس حق کو محدود کرنا چاہتے تھے قرآن کا حکم سامنے آتے ہی اس سے رُک گئے۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اسلامی ریاست میں ایک عورت کا حقِ مہر بھی بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ ریاست اسے ساقط، محدود یا معطل کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتی۔

اسی طرح قصاص، خون بہا، نفقہ، وراثت، وصیت، نکاح و طلاق اور معاملات، تعزیرات و محاربت سے متعلق وہ تمام حقوق بنیادی قرار دیے جائیں گے جو خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سُنّت میں متعین کیے جا چکے ہیں۔ اسلامی ریاست صرف یہی نہیں کہ ان میں

رد و بدل کا اختیار نہیں رکھتی بلکہ وہ مقتدرِ اعلیٰ کے حکم کی بناء پر ان کے نفاذ کی پابند ہے۔
یہاں ان حقوق کی حیثیت صرف دفاعی (Defensive) اور حفاظتی (Protective) نہیں ہے۔ بلکہ مثبت (Positive) ہے اور ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام تر اختیارات و وسائل کو کام میں لا کر ان کے نفاذ کو یقینی بناتے۔

ریاست کو اب صرف ان امور میں قانون سازی کا حق ہوگا جن کے بارے میں شریعت نے کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا مثلاً آج کی جدید ریاست اسلام کے اصول قانون سازی کے مطابق انتخابات اسمبلیوں کی کارروائی، داخلی و بیرونی تجارت، لین دین، پبلک سروسوں مثلاً ریلوے، بجلی، ٹرانسپورٹ، گیس، آب رسانی، تعمیر مکان، تعلیم، صنعت، اجرت، ملازمین مزدوروں اور کسانوں کی بہبود اور اسی طرح کے دوسرے معاملات سے متعلق قوانین بنا سکتی ہے۔
ان قوانین سے متعین ہونے والے حقوق، قانونی (Legal Rights) کہلائیں گے۔ یہ قوانین زمان و مکان کے فرق اور حالات و وسائل کی نوعیت کے مطابق وضع کیے جائیں گے۔ یہ مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں مختلف ہوں گے اور ان سے مختلف حقوق متعین ہوں گے۔ مثلاً پاکستان اور ترکی میں حصولِ شہریت کے حقوق مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک قرآن و سنت کے مقرر کردہ حقوق کا تعلق ہے وہ ذاتی ہیں، آفاقی ہیں، عالمگیر ہیں، زمان و مکان کی قیود سے ماوراء ہیں، غیر منفک ہیں، ریاست کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ اور اسلامی ریاست دنیا کے جس حصے میں بھی قائم ہوگی وہ انہیں جوں کا توں نافذ کرنے پر مامور ہوگی اس لیے یہ حقوق "بنیادی حقوق" کی فہرست میں آئیں گے۔

یہاں ایک معقول سوال اٹھایا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ بنیادی حقوق کی یہ تعبیر صرف مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے، جو لوگ خدا، قرآن اور آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے وہ اسے کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ اس صورت میں ان کے بنیادی حقوق کیا ہوں گے؟ کیا اسلامی ریاست میں ان کے اور مسلمانوں کے بنیادی حقوق میں کوئی فرق ہوگا؟

اس معقول سوال کا جواب دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اسلامی ریاست دنیا کی عام ریاستوں کی طرح کوئی قومی (National) ریاست نہیں ہے۔ اس میں حکومت کسی خاص قوم، نسل یا لسانی اور علاقائی گروہ کی نہیں ہے حتیٰ کہ مطلق حقِ حاکمیت خود مسلمانوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔ یہ ایک اصولی (Ideological) ریاست ہے۔ اس کا حاکمِ اعلیٰ اور فرمانروا خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے قرآن میں واضح احکام اور ہدایات کے ذریعہ یہ بتا دیا ہے کہ اسے اس زمین پر کس طرح کا انسانی معاشرہ مطلوب ہے۔ اس نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ اپنی حاکمیت کا ایک عملی نمونہ بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت جسے اصطلاحاً "خلافت" کہتے ہیں ایک نیابتی حکومت ہے جو حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کے احکام اور اس کی مقرر کردہ حدود کے مطابق، ریاست کا انتظام چلانے پر مامور ہے۔ اس ریاست کے شہریوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیتِ انسان اور دوسری حیثیتِ مسلم و غیرِ مسلم۔ پہلی حیثیت ان کی تخلیق سے متعین ہوتی ہے اور دوسری ان کے اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان لانے اور نہ لانے کی بنیاد پر۔ پہلی حیثیت میں ان کے درمیان کامل مساوات ہے، رنگ، نسل، علاقے اور زبان کی ساری تفریقات بے اصل ہیں۔ خدا کے نزدیک ان کا کوئی وزن و مقام نہیں۔ اس کا ارشاد ہے:

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (الزمر۔٦)

"اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔"

سورہ النساء آیت نمبر ا میں فرمایا گیا:

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

" یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے۔ اور میں تمہارا رب
ہوں، پس تم میری عبادت کرو۔" (الانبیاء۔ ۹۲)

اللہ کی نظر میں پوری انسانی برادری ایک امتِ واحدہ ہے وہ چونکہ کافر مسلم سب کا خالق ہے، مالک اور رازق ہے اس لیے اس نے اپنی انسانی مخلوق کے لیے جو حقوق مقرر کیے ہیں۔ ان میں وہ سب مساوی الحیثیت ہیں اس نے غیر مسلموں کے جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کا ویسا ہی حکم دیا ہے جیسا خود مسلمانوں کے جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا خلقی حیثیت میں مساوات کے بعد اب اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے طرزِ عمل اور رویّہ کی بنیاد پر جس کے ذمہ دار خود انسان ہی ہیں، دو گروہوں میں منقسم قرار دیتا ہے:

" ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوتے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے (البقرہ ۲۱۳)

" ابتداءً سارے انسان ایک ہی امت تھے، بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنائے۔" (یونس۔ ۱۹)

گویا انسانی برادری کی تقسیم خود انسان کی سرکشی اور بغاوت سے ہوتی جس نے اللہ کا دین چھوڑ کر خود اپنے اپنے دین گھڑ لیے اور ان کی بنیاد پر جتھہ بندی کر کے ایک امت کو سینکڑوں امتوں میں تقسیم کر ڈالا، انسان کو پھر وحدت کے رشتے میں پرونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ذریعہ اپنا پیغامِ ہدایت بھیجا لیکن وہ خود اپنی بدبختی کی بناء پر متحد دیکھا نہ ہو سکے۔ اللہ کا یہ پیغام آج بھی قرآن کی صورت میں انسانیت کو اتحاد و یکجہتی اور اُمتِ واحدہ بننے کی دعوت دے رہا ہے۔ قرآن کسی خاص قوم اور علاقے کی ہدایت کے لیے نہیں پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے اُترا ہے۔ اور اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " رحمۃ للمسلمین" بنا کر نہیں بلکہ " رحمۃ للعالمین" بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ قرآن نے خدا اور رسول پر

ایمان لانے والوں کے لیے جو حقوق مقرر کیے ہیں وہ دراصل پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ ہر انسان خدا کا بندہ بن کر ان حقوق کا مستحق بن جائے اور ان سے استفادہ کر کے دنیا میں آبرومندانہ زندگی بسر کرے۔ مسلمان کسی نسل یا خاص قوم کا نام نہیں ایمان لانے والوں کا نام ہے۔ اس لیے دنیا کے کسی خطے میں رہنے والا اور کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والا کوئی انسان جوں ہی کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر پشتینی مسلمانوں کی طرح ان تمام حقوق کا مستحق بن جاتا ہے جو خدا نے اہل ایمان کے لیے مقرر کیے ہیں۔ اب یہ بات عقل اور منطق کے صریح منافی ہے کہ خدا کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ اور قرآن کو اپنا ضابطہ حیات اور دستورِ مملکت ماننے والوں کو اور اس کا انکار کرنے والوں کو بالکل یکساں حیثیت دے دی جائے۔ کیا امریکہ، برطانیہ، روس یا کسی اور ملک میں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے اور اس سے علانیہ انکار کرنے والوں کو یکساں پوزیشن حاصل ہو گی؟ اس طرح کا انکار کرنے والوں کو تو ان ملکوں میں رہنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی اور غدار قرار دے کر پھانسی پر لٹکا یا جائے گا۔ یا جلاوطن کر دیا جائے گا۔ پھر اسلامی ریاست سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ جو لوگ اس کے مقتدرِ اعلیٰ کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے اور اس کے دستور کو دستور نہیں مانتے انہیں ماننے والوں کی صف میں شامل کر کے مساوی حیثیت دے دی جائے؟ آخر دنیا کا کونسا قانونی یا اخلاقی ضابطہ اقراری اور انکاری کو مساوی الحیثیت قرار دیتا ہے؟ یہ الجھن دراصل اسلام کو ایک "مذہب" سمجھنے اور امورِ ریاست سے مذہب کا کوئی تعلق نہ ہونے کے سیکولر اندازِ فکر سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن خدا کو ریاست کا مقتدرِ اعلیٰ اور قرآن و سنت کو اس کا دستور تسلیم کر لینے کے بعد اس مہمل سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اسلامی ریاست میں مسلم اور غیر مسلم کو یکساں حیثیت کیوں حاصل نہیں؟ خدا کو ماننے والے اور اس کے وجود یا اقتدارِ اعلیٰ کا انکار کرنے والے برابر کیوں نہیں سمجھے جاتے؟

اسلام کا یہ پہلو تو مطعون کیے جانے کے بجائے سراہے جانے کے قابل ہے کہ وہ اپنی حدودِ ریاست میں اللہ کے باغیوں اور غداروں کو نہ صرف امن دسکون سے رہنے کی اجازت دیتا بلکہ انہیں انسانی حقوق کے معاملے میں مسلمانوں کے مساوی حیثیت بھی دیتا ہے۔ ان کے درمیان فرق ہے تو صرف اتنا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کرنے کی بنا پر اس کے نفاذ کے ذمہ دار بناتے گئے ہیں جب کہ غیر مسلم اس حاکمیت کو تسلیم نہ کر کے خود اپنے انکار کی بنا پر اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے گئے۔ وہ اگر اللہ پر ایمان لے آئیں تو خود بخود اس ذمہ داری کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہونے کے مستحق بن جائیں گے لیکن جب تک وہ اپنے انکار پر قائم ہیں انہیں مقتدرِ اعلیٰ اپنے احکام و ہدایات کے عملی نفاذ کی ذمہ داری میں کیسے شریک کر سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے :-

اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ (سجدہ ۴۔ ۱۸)

"بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہے یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔"

ایک اور آیت میں فرمایا گیا :-

"اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔" (آل عمران۔ ۱۱۸)

اس سے قبل اسی آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

"مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہمراز ہرگز نہ بنائیں جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔" (آلِ عمران۔ ۲۸)

یہی ہدایت سخت تنبیہ کے انداز میں پھر دہرائی جاتی ہے؟

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ

بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو لوگ ان کو رفیق بنائیں گے
وہی ظالم ہوں گے۔" (توبہ۔۲۳)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان یہ خطِ امتیاز خود مقتدرِ اعلیٰ نے کھینچا ہے۔ اس کا سبب مسلمانوں کا کوئی نسلی، علاقائی، قومی یا مذہبی تعصب نہیں ہے۔ ان کی تو عین خواہش ہے بلکہ وہ مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے دنیا میں اسی مشن پر مامور کیے گئے ہیں کہ اس کا پیغام اس کے ایک ایک بندے تک پہنچے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر ہر قسم کی غلامی سے نجات پائیں اور ان تمام حقوق میں شریک ہوں جو اہلِ ایمان کے لیے مقرر ہیں۔ اہلِ مغرب کی طرح ان کا اندازِ فکر یہ نہیں ہے کہ دنیا ان کا مذہب تو قبول کر لے لیکن ان کے سیاسی غلبہ و اقتدار میں شریک نہ ہو۔ غیر مسلموں کے بارے میں مسلمانوں کے اندازِ فکر کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے: ربعیہ بن عامرؓ جنگِ قادسیہ سے قبل رستم اور اس کے درباریوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:

"ہم کو اللہ نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں۔ اور دُنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں۔ اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں۔" [۶۷]

اس دعوت کے باوجود اگر کوئی فرد یا گروہ اپنے انکار پر قائم رہتا ہے تو وہ خود اسلامی ریاست میں ایک ذمی کی حیثیت سے رہنے کا آزادانہ فیصلہ کرتا ہے۔ اسلامی ریاست اسے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ۔۲۵۶) کی قرآنی ہدایت کے تحت جبر اور دباؤ کے ذریعہ اسلام قبول پر مجبور نہیں کر سکتی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن ہی کے متذکرہ صدر فیصلے کے تحت اسے مسلمانوں کے مساوی حیثیت بھی نہیں دے سکتی۔ قرآن اور سنت میں ان کے لیے بحیثیتِ انسان اور بحیثیتِ ذمی جو حقوق مقرر کر دیئے گئے ہیں وہ ان کے احترام و نفاذ کی

پابند ہے۔ اس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی پست تر یا ثانوی حیثیت دی گئی ہے معاملہ درحقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اوّل تو لفظ "ذمی" پر غور کیجئے اس کا مطلب ہے وہ لوگ جن کے جان و مال اور عزت و آبرو اور دوسرے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کی گئی ہو۔ اسلامی ریاست یوں تو ہر شہری کے تحفظ کی ذمہ دار ہے لیکن غیر مسلموں کے لیے ایک ایسی اصطلاح وضع کر کے جس میں ذمہ داری کا عنصر نمایاں ہے ان کے معاملہ میں تحفظ و نگہداشت کے فرض کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ یہ محض دنیا کے دکھاوے کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ ان کے لیے خدا اور رسولؐ کے احکام فی الحقیقت اسی نوعیت کے ہیں۔ ابھی وہ آیات آپ کی نگاہ سے گزری ہیں جن میں مسلمانوں کو کفار سے الگ رہنے اور انہیں اپنا رازدار و رفیق نہ بنانے کی سخت ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیئے۔ عدل کے معاملہ میں سب کے ساتھ مساوی سلوک کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔" (المائدہ ۔ ۸)

اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو "اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔" (النساء ۔ ۱۳۵)

انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طعمہ نے ایک انصاری کی زرہ چرائی، اور پھر سزا سے بچنے کے لیے اسے ایک یہودی کے ہاں بطور امانت رکھ کر اسی پر چوری

کا الزام عاید کر دیا۔ قبیلہ والوں نے بھی طعمہ کو بچانے کے لیے بیگ زبان یہودی پر ہی چوری کا الزام لگایا اور حضورؐ کے سامنے طعمہ کے صاحبِ ایمان اور یہودی کے مشرک ہونے کی بناء پر اصرار کیا کہ یہودی کی صفائی قبول نہ کی جائے اور اسے سزا دی جائے۔ قبل اس کے کہ حضورؐ رودادِ مقدمہ سے متاثر ہو کر یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرماتے وحی نازل ہوئی اور واقعہ کی اصل حقیقت آپ پر کھول دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بے گناہ یہودی پر جھوٹا الزام عائد کرنے والے مسلمان کو سخت وعید سناتے ہوئے فرمایا:

"اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورہ کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون ان کا وکیل ہوگا؟ اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو برائی کما لے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لیے وبال ہوگی۔ اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی پر تھوپ دیا اس نے

تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ اے نبیؐ! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ حالانکہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے۔ اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔" (النساء ۱۰۵۔ ۱۱۳)

یہ سلسلۂ کلام ابھی جاری ہے اور آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی کی بات نہیں ہوتی۔ ان آیات سے اندازہ کیجئے۔ ایک بے گناہ کو خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، موردِ الزام ٹھہرانا اور اسے ناکردہ گناہ کی سزا دینا اللہ کے نزدیک کتنا سنگین جرم ہے۔ اور اس نے وحی نازل کر کے کس طرح ایک مسلمان اور اس کے تمام حمایتیوں کے مقابلے میں ایک یہودی کی برآت کا اہتمام کیا۔

اب دیکھئے خدا کا رسولؐ ان ذمیوں کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

"خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا ان کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔" (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد)

یہ بات آپؐ نے خود مسلمان مظلوموں کے بارے میں بھی نہیں فرمائی کہ ان کی طرف سے میں ظالم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی عدالت میں استغاثہ پیش کروں گا لیکن ذمیوں کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ ان پر مسلمانوں کے ہاتھوں کوئی زیادتی ہوتی تو میں ان کا مستغیث بنوں گا۔ اب غور کیجئے جن کے وکیل نبی اکرمؐ ہوں کیا ان پر کوئی مسلمان ظلم ڈھانے کا تصوّر تک کر سکتا ہے؟

حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کی ہجو میں شعر پڑھنے والی ایک عورت کے دانت اکھڑوا دیئے گئے۔ آپؓ کے علم میں یہ بات آئی تو اپنے عامل، مہاجر بن اُمیّہ کو لکھا:

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ جو عورت مسلمانوں کی ھجو میں شعر گاتی پھرتی ہے تم نے اس کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیئے ہیں۔ ایسی عورت اگر مسلمان ہو تو اس کے لیے زجر و توبیخ کافی ہے اسے تادیب اور مثلہ سے کم سزا دینی چاہیئے اگر ذمیہ ہے تو جب اس کا شرک جیسا ظلمِ عظیم گوارا ہے تو اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی ہجو کونسی بات ہے۔ کاش! میں اس بارے میں تمہیں پہلے سے آگاہ کر سکتا تب تمہیں اس سزا کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔" ؏۵

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو عین عالمِ نزع میں بھی ذمیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی فکر تھی۔ آپ زخموں سے نڈھال ہیں اور وصیت فرماتے ہیں:

"میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ حاصل ہے ان سے کیے ہوتے عہد کی پابندی کرے ان کا دفاع کرے اور ان پر اُن کی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔" ؏۶

نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین ہی کے عہد میں نہیں بنو امیہ، بنو عباس اور بعد کے مسلمان حکمرانوں کے دور میں غیر مسلم اقلیتوں کو جان و مال اور عزت و آبرو کا جو تحفظ حاصل رہا ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور مستشرق منٹگمری واٹ لکھتا ہے:

"غیر مسلم اقلیتوں سے سلوک کے معاملہ میں اسلامی ریاستیں بحیثیت مجموعی بہترین ریکارڈ رکھتی ہیں انکے ساتھ حُسنِ سلوک مسلمانوں کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں ذمیوں کے تحفظ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ہر غیر مسلم اقلیت بیت المال کو مال یا نقدی کی صورت میں معاہدہ کے مطابق سالانہ جزیہ ادا کرتی۔ اسے تقریباً اتنا ہی فی کس محصول بھی ادا کرنا پڑتا۔ اس کے بدلے

اسے بیرونی دشمنوں سے تحفظ ملتا اور وہ ان داخلی جرائم سے بھی تحفظ کی مستحق بن جاتی جو خود مسلمانوں کو حاصل ہوتا تھا۔ ایسے صوبوں میں جہاں ذمی آباد ہوتے عامل کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ان سے جزیہ وصول کرے اور مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان تنازعات کا فیصلہ کرے۔ ہر اقلیت اپنے داخلی معاملات میں بالکل خود مختار تھی۔ اس کا مذہبی سربراہ جزیہ محصول کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا اور وہی اپنے مخصوص مذہبی قوانین کے نفاذ سمیت تمام داخلی امور کا نگراں ہوتا" ؎۔

یہی مصنّف آگے چل کر اپنے قارئین کو بتاتا ہے:

"رسول اللہ کے زمانہ میں جتنے معاہدات ہوئے ان سب میں واضح طور پر اس امر کی ضمانت دی گئی کہ ہر ذمی اقلیت کو اپنے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہو گی اور یہ آزادی بعد کے زمانوں میں بھی برقرار رہی۔ عیسائیوں کے چرچ اور یہودیوں کے صومعے محفوظ رہے۔ بعد میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ انہیں اپنی نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی جاتے لیکن ذمیوں کے بارے میں اسی طرح کے دوسرے نئے قواعد پر کبھی عمل نہیں کیا گیا" ؎۔

یہ ہے اسلامی ریاست میں ذمیوں کی حیثیت۔ ان کے حقوق سے متعلق احکام ونظائر کی تفصیلات آگے آ رہی ہیں یہاں صرف اتنی وضاحت مقصود تھی کہ ذمیوں کے بارے میں اسلامی ریاست کا اندازِ فکر کیا ہے۔

اب جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مساوی الحیثیت ہونے کا تعلق ہے اس بارے میں قرآن کا یہ فیصلہ ہمارے سامنے ہے کہ ایمان لانے والے اور اس سے انکار کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ اس لحاظ سے تو مساوی الحیثیت ہیں کہ ان کے درمیان انسانیت کا رشتہ مشترک ہے: بحیثیت انسان مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ انہیں بھی حاصل ہیں۔ پھر یہ

ان معنوں میں بھی مساوی ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے حقوق کا تعین خدا اور اس کے رسولؐ نے کیا ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے حقوق غیر منفک اور ناقابلِ مداخلت ہیں اسی طرح غیر مسلموں کے حقوق بھی غیر منفک اور ناقابلِ مداخلت ہیں۔ ریاست اگر مسلمانوں کے کسی حق میں کمی بیشی نہیں کر سکتی تو اسے غیر مسلموں کے حقوق میں بھی ترمیم و تنسیخ کا کوئی اختیار نہیں۔ مسلمان اگر قرآن و سنت کے احکام اور خلافتِ راشدہ کے نظائر پیش کر کے عدلیہ کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں تو غیر مسلموں کو بھی انہی ماخذوں کے حوالے سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی ضمانت حاصل ہے۔ فاطمیوں کے دور میں جب کچھ عاملوں نے سینائی کے عیسائی راہبوں اور یہودیوں کی املاک پر دست درازی کرنا چاہی اور کچھ نئے ٹیکس عائد کیے تو انہوں نے دربار میں حاضر ہو کر قدیم معاہدات کی دستاویزات پیش کیں اور عبدالمجید الحافظ کے وزیر بہرام اور الظفر کے وزیر العباس اور طلائی سے اپنے حق میں ڈگریاں حاصل کیں۔ جن میں عاملوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ قدیم معاہدات کا احترام کریں اور جو کچھ خلافت راشدہ میں طے ہو چکا ہے اس کی سختی سے پابندی کریں۔ اس کے ساتھ ہی حکم جاری ہوا کہ تمام نئے ٹیکس فی الفور ختم کر دیے جائیں اور عیسائیوں اور یہودیوں کی ہر طرح حفاظت و نگہداشت کی جاتے۔" ۹

اس طرح کی نظیریں خلافتِ بنو عباس اور بعد کے ادوار میں بھی ملتی ہیں جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ ریاست کے مقابلے میں مسلمانوں اور ذمیوں کو یکساں تحفظ حاصل ہے۔ اور یہ تحفظ اسی ہستی کا فراہم کردہ ہے جس کے وجود یا اقتدارِ اعلیٰ کو ذمی تسلیم نہیں کرتے۔

قانون کی نگاہ میں مساوی ہونے کے باوجود مسلمانوں اور غیر مسلموں کے بنیادی حقوق میں بہرحال ایک فرق بھی ہے اور یہ فرق ہے ان کے سیاسی حقوق کا۔ اس کا سبب کوئی امتیازی سلوک یا مذہبی تعصب نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کے ساتھ ان کے رشتہ وفاداری کی مختلف نوعیت ہے۔ غیر مسلم اسلام کے سیاسی نظام کو، جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور کتاب و سنت کے دستور کی بنیادوں پر قائم ہے، تسلیم نہیں کرتے اور اس کے ساتھ کامل وفاداری کا دم

حلف نہیں اٹھاتے جو مسلمان اٹھاتے ہیں۔ مسلمان چونکہ ایمان لاکر یہ عہد کرتا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی سیاسی حاکمیت کو قائم کرے گا اور اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں کرے گا بلکہ جان کی بازی لگا کر اسے مٹاتے گا اس لیے وہ خدا کے عطا کردہ نیابتی اقتدار (Delegated Powers) کا مستحق بن جاتا ہے۔ بنی نوع انسان میں سے جو فرد بھی اسی طرح کا حلف اٹھاتا ہے اور عہد کرتا ہے اسے از خود اس اقتدار میں شرکت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن جو اس ذمہ داری کے لیے تیار نہیں اور سرے سے خدا کی سیاسی حاکمیت ہی کا قائل نہیں اسے کس استحقاق کی بناء پر اس اقتدار میں شریک کر لیا جائے؟

کیا کوئی اتھارٹی کسی ایسے فرد یا گروہ کو اپنے اختیارات تفویض (Delegate) کر سکتی ہے جو اس کے وجود اور اتھارٹی کو مانتی ہی نہ ہو؟ مسلم و غیر مسلم کے درمیان اس اصولی فرق کے باوجود اسلام نے غیر مسلموں کو سیاسی حقوق سے یکسر محروم نہیں کیا۔ البتہ انہیں ایسے کلیدی عہدوں پر تقرر کے لیے نااہل قرار دیا ہے جن پر فائز ہونے کے لیے وہ دستور سے حلفِ وفاداری اور اس کے نفاذ کے لیے مطلوبہ اہلیت کی شرائط پر پورے نہیں اترتے۔ ان کی اسی حیثیت کے پیشِ نظر اسلامی ریاست میں بنیادی حقوق کو تین دائروں میں تقسیم کرنا ہوگا:

(۱) مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترکہ حقوق۔

(۲) مسلمانوں کے اضافی بنیادی حقوق

(۳) غیر مسلموں کے اضافی بنیادی حقوق

ان میں پہلی فہرست طویل ترین ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حقوق کے معاملہ میں انسان کی خلقی حیثیت ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ باقی دو فہرستیں چند ایسے حقوق پر مشتمل ہوں گی جو مسلم اور غیر مسلم کے فرق کی بناء پر قائم ہوتے ہیں۔

اخلاقی پہلو۔

اسلام میں بنیادی حقوق کی تاریخ اور ان کی قانونی حیثیت کا جائزہ لینے کے بعد اب

ان حقوق کی اخلاقی حیثیت کو لیجئے۔ ہم قانونی حقوق صرف اُن حقوق کو کہتے ہیں جو قانونِ مصنوعہ (Positive Law) کے تحت آتے ہیں۔ اور انتظامیہ کے ذریعہ قابلِ نفاذ اور عدلیہ کے ذریعہ قابلِ حصول ہوتے ہیں۔ مثلاً تحفظِ جان و مال اور آزادیٔ تنظیم و اجتماع وغیرہ۔ لیکن جو حقوق انتظامیہ اور عدلیہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں اور جن کا نفاذ انسان کے ضمیر و وجدان پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ سب کے سب اخلاقی حقوق ہیں مثلاً مریضوں کی عیادت، حاجت مندوں کی اعانت، مہمانوں کی تواضع اور پڑوسیوں سے حسنِ سلوک وغیرہ۔ گویا قانونی حقوق کی پشت پر ریاست کی قوتِ نافذہ موجود ہوتی ہے۔ لیکن اخلاقی حقوق کا نفاذ انسان کی باطنی کیفیت پر منحصر ہے۔ امام غزالیؒ اخلاق کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"خُلق، نفس کی باطنی صورت و ہیئت کا نام ہے"۔ ؏۱

انسان کی یہ باطنی صورت و ہیئت چونکہ مشاہدہ کی گرفت سے ماوراء ہے اور حواس کے محدود دائرہ علم و ادراک کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے قانون نے اسے اپنے دائرہ عمل میں شامل نہیں کیا۔ قانون سازی اور نفاذِ قانون کی حدود، انسان کے صرف ظاہری اور قابلِ مشاہدہ اعمال پر آکر ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان اعمال کے داخلی محرکات اور ایک فرد کی ذہنی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لینے والے افکار، عقائد اور رجحانات و میلانات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ امور اخلاق کا موضوعِ بحث ہیں۔ اور اس دائرہ میں آنے والے انسانی حقوق کا تعین بھی قانون سازوں کا نہیں معلمینِ اخلاق کا کام ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قانونی اور اخلاقی دائرہ اطلاق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"قانونِ وضعی کا حکم صرف "اعمالِ خارجیہ" پر جاری ہوتا ہے لیکن اخلاقی قانون، اعمال اور ان کے اسباب و علل دونوں پر نظر رکھتا ہے۔ اور اس کا حکم ہر دو پر نافذ ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض وہ اعمال جو اپنے ظاہر میں اچھے نتائج کے حامل ہوتے ہیں "حکمِ اخلاقی" میں ان پر اس لیے شر ہونے کا فتویٰ صادر کیا جاتا ہے کہ ان

کا باعث اور سبب بڑا ہے۔ قانونِ وضعی کا نفاذ خارجی قوت سے ہوتا ہے یعنی حکّام، لشکر، پولیس، آئینِ حکومت، جیلوں اور جدید اصلاحات کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مگر قانونِ اخلاقی کو داخلی قوتِ نفس "وجدان" نافذ کرتی ہے۔ قانونِ وضعی اشخاص کو صرف ان واجبات وفرائض ہی کا مکلف بناتا ہے جس پر بیشتر جماعتی بقاء کا انحصار ہوتا ہے۔ مثلاً جان ومال کی حفاظت وحرمت وغیرہ۔ لیکن قانونِ اخلاقی "فرائض" اور "فضائل" دونوں کا ایک ساتھ مکلف بناتا ہے۔ اور وہ انسانوں کو اس کا خوگر بناتا ہے کہ ان کی کوشش نیک ہونی چاہیئے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اس راہ سے ترقی کے معراجِ کمال تک پہنچنے کی سعی کرنی چاہیئے۔" [۱۱]

ہمارے فقہاء، قانون اور اخلاق کے اسی فرق کے پیشِ نظر اسلام میں بھی حقوق کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کے درمیان خطِ امتیاز قائم کرتے ہیں۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خالق اور مخلوق یا خدا اور بندے کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام "عقیدہ" ہے۔ اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم وجان اور مال وجائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام "عبادت" ہے۔ باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام "معاملہ" ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام "اخلاق" ہے۔" [۱۲]

قانونی اور اخلاقی حقوق کی یہی تقسیم ہمیں اپنی فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ لیکن اس کا ایک اہم پہلو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا اسے اصل سلسلہ سے کاٹ کر کسی دوسرے عنوان

کے تحت رکھ دیا جاتا ہے اور اس طرح اسلام میں قانونی اور اخلاقی حقوق کے درمیان جو باہمی ربط ہے اُس کی پُوری وضاحت نہیں ہو پاتی۔

دُنیا کے عام اصولِ قانون اور اصولِ اخلاق کے مطابق تو یہ تقسیم درست ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ اور انسان کی حیثیتِ خلافت کو مدِ نظر رکھا جائے تو اسلام میں اس تقسیم کی نوعیت یکسر بدل جاتی ہے۔ یہاں اخلاقی اور قانونی حقوق ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کے حکم سے متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان ایک قانون ساز اتھارٹی کے جاری کردہ قانون، اور ایک معلمِ اخلاق کے پیش کردہ اصولِ اخلاق والا فرق نہیں ہے۔ یہ اپنے قابلِ نفاذ اور ناقابلِ نفاذ ہونے کی بنا پر بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ ایک مسلمان اپنے رب سے کیے گئے عہد کے تحت خدا اور اس کے رسولؐ کی مکمل اطاعت کا پابند ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ (الانعام۔۱۶۲)

"کہو میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔"

ایک طرف بندہ کا یہ عہد وفاداری اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان بیع و شریٰ ہے،

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبہ۔۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے اُن کے نفس اور اُن کے مال، جنت کے بدلے خرید لیے۔"

اس قول و قرار کے بعد ایک مسلمان کے لیے یہ گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ حقوق میں سے بعض کو قانونی اور بعض کو اخلاقی سمجھ کر ان دونوں کے ساتھ مختلف رویہ اختیار کرے؟ اس کے نزدیک تو قرآن کا ایک ایک حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ خدا کے ہر حکم کی تعمیل یکساں احساس ذمہ داری کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے لیے صرف قانونی حقوق ہی واجب الادا (Due) اور واجب التعمیل (Binding) نہیں ہیں بلکہ اخلاق کی

ذیل میں آنے والے تمام حقوق اسی طرح واجب الادا اور واجب التعمیل ہیں۔ انسان کا وضع کردہ ضابطۂ اخلاق خیر و شر کا ایک معیار قائم کر دینے کی حد پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا نفاذ انسان کے ضمیر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ نفاذ رضاکارانہ (Voluntary) ہوتا ہے۔ اور کسی بھی درجے میں قابلِ احتساب (Accountable) نہیں ہوتا۔ اسے بڑی سے بڑی قوتِ نافذہ معاشرتی دباؤ (Social Pressure) کی صورت میں میسر آتی ہے لیکن اس سے انحراف عدالتوں میں قابلِ سماعت (Cognizable) اور قابلِ تعزیر (Punishable) بہرحال نہیں ہوتا۔ کیا اسلام میں بھی اخلاقی حقوق کی یہی صورت ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ مسلمان کو تو بلا امتیاز قانون و اخلاق ایک ایک ذرے کا حساب دینا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال ۷-۸)

"پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

جب صورت یہ ہے تو پھر فقہاء حقوق کو اخلاقی اور قانونی بنیادوں پر کیوں تقسیم کرتے ہیں؟ وہ یہ امتیاز آخر کس بناء پر قائم کرتے ہیں؟

اسلام میں اس فرق کی حقیقت بس اتنی ہے کہ انفرادی طور پر تو ہر مسلمان اپنے رب کے ایک ایک حکم پر عمل کرنے کا پابند ہے اور یہ پابندی بالکل قانونی نوعیت کی ہے۔ کیونکہ اسے مقتدرِ اعلیٰ کے سامنے اپنے تمام اعمال کی جوابدہی کرنی ہے اور اسی کی بنیاد پر اس کی عدالت میں جزا یا سزا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ وہاں یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ کم از کم اپنی ذات اور اپنے اختیارات کی حد تک وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین و حقوق کی ادائیگی سے قاصر تھا۔ البتہ ایک امیر یا امام کو اللہ تعالیٰ نے صرف انہی حقوق کے نفاذ کا مکلف بنایا ہے جنہیں وہ اپنے محدود علم اور حواس پر مبنی ادراک و مشاہدہ کی حد تک ہی نافذ کر سکتا ہے۔ یہی وہ حقوق ہیں جنہیں اسلام میں "قانونی" کہا جاتا ہے۔ گویا اخلاقی اور قانونی حقوق کی یہ تقسیم، اختیاراتِ حکومت کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے

نہ کہ کسی فرد کی ذمہ داری اور مسئولیت (Accountability) کے نقطۂ نظر سے۔ ایک فرد کے لیے تو تمام حقوق کی حیثیت قانونی ہے۔ لیکن ایک امیر یا امام کے اختیارات اور اس کی ذمہ داریوں کی حدود کے لحاظ سے یہ قانونی اور اخلاقی میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جن کم از کم حقوق کو اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کو متوازن، منصفانہ، پُرامن اور خوشحال و پاکیزہ بنانے کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے انہیں اس نے اپنے نیابتی اقتدار کے ذریعہ قابلِ نفاذ بنا دیا اور اس سلسلہ میں اسے ضروری احکام و اختیارات بھی دے دیئے۔ جن حقوق کو اس نے معاشرے کی اعلیٰ ترین اخلاقی بنیادوں پر تعمیر اور اس مقصد کے لیے افرادِ معاشرہ کی سیرت و کردار کی بہترین تشکیل کے لیے ضروری سمجھا ان کے مکمل نفاذ کا ذمہ دار خود ایک ایک فرد کو قرار دیا اور اس کے احتساب کا معاملہ براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اب قانونی حقوق کے نفاذ کی حد تک تو فرد اور ریاست دونوں مشترکہ طور پر مقتدرِ اعلیٰ کی اعلیٰ ترین عدالت میں قابلِ مواخذہ ہوں گے۔ لیکن جو حقوق ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر رکھے گئے ہیں فرد کو ان کے سلسلہ میں بھی یکساں جوابدہی کرنی ہوگی اور اس کے لیے قانونی اور اخلاقی حقوق میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

گویا ایک فرد اور نیابتی اقتدار کے باہمی تعلق کے دائرہ میں تو حقوق اپنے خارجی اظہار و نفاذ کی بنیاد پر قانونی اور اخلاقی حدود میں منقسم ہو جائیں گے، لیکن خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے دائرہ میں یہ تقسیم ختم ہو جاتی ہے اور سارے حقوق قانونی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قانونی حقوق کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے انہیں ریاست کے دائرہ اختیار میں دے دیا ہے۔ تاکہ کوئی فرد خود اپنی ذمہ داری پر ان حقوق کو ادا نہ کرے تو ریاست، عدلیہ اور انتظامیہ کی قوت سے انہیں بزور نافذ کرے اور کسی مستحق کا حق غصب یا مجروح نہ ہونے دے۔ لیکن ریاست چونکہ اس ذمہ داری کو صرف ظاہری کردار ہی کی حد تک پورا کر سکتی ہے اس لیے اسے اخلاقی حقوق کے عملی نفاذ کی قانونی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ مگر فرد پر یہ ذمہ داری قائم ہے۔ اسے کسی ایک معمولی سے معمولی اخلاقی حق کے نفاذ کی ذمہ داری سے

سبکدوش نہیں کیا گیا۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ کسی تنازعہ میں قیامِ انصاف کے لیے اپنے کسی براہِ راست علم کی بجائے مدعی، مدعا علیہ اور گواہوں کے بیانات اور پولیس کی رپورٹ پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے تمام ذرائع معلومات صرف خارجی کردار ہی کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ انسان کے باطن تک اس کی کوئی رسائی نہیں۔ چنانچہ ان بشری کمزوریوں کے پیشِ نظر انسانی حکومت کو صرف خارجی کردار سے تعلق رکھنے والے قانونی حقوق کے نفاذ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور ان حقوق کے سلسلہ میں بھی قطعی اور آخری انصاف اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی عدالت کے لیے مخصوص رکھا ہے۔ کیونکہ اس امر کا قطعی امکان ہے کہ حقائق تک رسائی نہ ہونے کی بناء پر کسی معاملہ میں پوری دیانت اور نیک نیتی کے باوجود صاحبِ امر سے انصاف نہ ہو سکا ہو۔ خود خدا کا رسولؐ جو بنی نوعِ انسان میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا فرماتا ہے:

"مَیں تو ایک بشر ہوں، میرے سامنے جو لوگ قضیہ لے کر آتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ باتیں بنانے والا ہو اور مَیں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اور سمجھوں کہ یہی سچا ہے۔ پس جس کسی ایسے شخص کے لیے مَیں اس کے بھائی کے حصّے میں فیصلہ کر دوں تو اُسے چاہیئے کہ وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔ کیونکہ وہ سمجھ لے کہ مَیں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں" ع۱۲

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (الروم - ۷)

"لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں"۔

حضرت عمرؓ انسانی حکومت کے دائرہ عمل کی وضاحت کرتے ہوتے فرماتے ہیں:

"تم لوگوں کی عہدِ رسالت میں وحی کے ذریعہ گرفت ہوتی تھی جو شخص کچھ چھپاتا اس پر گرفت کی جاتی اور جو شخص کچھ اور ظاہر کرتا وہ بھی پکڑا جاتا۔ نہیں چاہیئے کہ

اچھے اخلاق کا اظہار کرو۔ اللہ دلوں کا حال جانتا ہے جو کوئی بُرائی کا اظہار کرے گا اور اس امر کا مدعی ہوگا کہ میرا باطن درست ہے، ہم اس کی تصدیق نہیں کریں گے اور جو شخص اچھائی کا اظہار کرے گا ہم اسے اچھا ہی سمجھیں گے۔" ۱۴

ایک اور خطبہ میں وہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"سنو! قرآن پڑھو تو صرف اجر خداوندی کے متلاشی بنو اور اپنے اعمال سے اسی کا ارادہ کرو جب وحی نازل ہوتی تھی تو ہم تمہیں اس کے ذریعہ پہچان لیتے تھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود تھے۔ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور رسول اللہ تشریف لے جا چکے ہیں تو اب میں تمہیں ان باتوں ہی سے پہچان سکوں گا جو میں نے بتائی ہیں۔ سنو جو کوئی بھلائی کا اظہار کرے گا ہم اسے بھلا سمجھیں گے اور اس کی تعریف کریں گے اور جو کوئی برائی کا اظہار کرے گا ہم اس کے ساتھ بُرا گمان رکھیں گے اور اس سے کراہت کریں گے۔" ۱۵

گویا جنہیں ہم قانونی حق کہتے ہیں وہ بھی بقدرِ علم و ادراک ہی نافذ ہو سکتے ہیں۔ ان کا آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہی میں ہوگا۔ اسی لیے ایسے تمام حقوق جن کے نفاذ کے لیے حواس سے ماوراء علم اور مشاہدۂ باطن کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کے محدود اختیار و اقتدار سے خود ہی باہر رکھے ہیں۔ اور انسان کو انفرادی طور پر ان کا مکلف بنا کر فیصلہ خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ کیونکہ جس باطن تک انسان کی نگاہ نہیں جا سکتی وہ اللہ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس کا کوئی بھید اس سے چھپا ہوا نہیں۔ وہ اپنے کامل اور بے خطا علم کے ذریعہ تمام حقوق کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا۔ اور وہاں اخلاقی اور قانونی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اس کا ارشاد ہے:

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ (البقرہ ۷۷)

"اور کیا جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں، اللہ کو

سب باتوں کی خبر ہے۔

وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا۔ (النساء - ۴۲)

" اور یہ اپنی کوئی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔"

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔ (الحج - ۱۷)

" ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔"

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ (آل عمران - ۱۱۹)

" اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔"

اللہ سے چونکہ انسان کی نیتیں، خواہشیں، ارادے، افکار، عقائد غرض کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ انسان کا ظاہر و باطن اس کے سامنے بالکل عیاں ہے، اس لیے اس کی عدالت میں کوئی حق محض " اخلاقی حق " نہ رہے گا بلکہ تمام حقوق قانونی حقوق ہوں گے۔ اور وہاں ان کا فیصلہ قانونی چارہ جوئی کے تمام معروف طریقوں کے مطابق ہو گا۔ وہ متاثرین کی فریاد سنے گا۔

" اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔" (تکویر ۸ - ۹)

کراماً کاتبین کی مرتب کردہ رپورٹوں کا جائزہ لے گا۔

" تم پر نگراں مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب، جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔" (الانفطار ۱۱)

جس زمین پر یہ اعمال سرزد ہوتے ہیں اس سے گواہی لے گا۔

" اُس روز وہ (زمین) اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔" (الزلزال ۴)

مجرم کی اپنی زبان اور اس کے ہاتھ پاؤں کی شہادت سُنے گا۔

" وہ اُس دن کو نہ بھول جائیں جب کہ انکی اپنی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔" (النور - ۲۴)

انبیاء اور دوسرے گواہوں کے بیانات لے کر ثابت کردے گا کہ حق ان تک پہنچ گیا تھا

" انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیئے جائیں گے۔" (الزمر-۶۹)

اور آخر میں خود مجرم اعتراف کرے گا، ہاں مجھ سے حقیقتاً یہ جرم سرزد ہوا تھا۔

" ہاں! خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا، مگر ہم نے اسے جھٹلایا اور کہا کہ اللہ نے تو کچھ بھی نازل نہیں کیا۔" (الملک-۹)

تب وہ اتمامِ حجت کے بعد اپنا فیصلہ سنائے گا۔

" لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور اُن پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے کیا تھا اس کا پورا پورا بدلہ دیا دیا جائے گا۔" (الزمر: ۶۰-۷۰)

اب بتائیے جن حقوق کا معاملہ اُس عظیم ترین اور آخری عدالت میں قانون کی تمام معروف شرائط کے مطابق اس انداز سے زیرِ سماعت آئے گا، انہیں ہم کس بنیاد پر "اخلاقی حقوق" کہہ سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ وہاں کیسے کیسے خالص اخلاقی حقوق زیرِ سماعت آئیں گے! قرآن کا حکم ہے:۔

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا (النساء۸۶)

" اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقے کے ساتھ جواب دو۔ یا کم از کم اسی طرح، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔"

اس آیت کا آخری حصہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ محض کوئی اخلاقی تلقین نہیں ہے۔ ایک حکم ہے، ایک قانونی ضابطہ ہے اور خود مقتدرِ اعلیٰ کی عدالت میں اس پر بازپرس ہو گی۔ دنیا کی کسی عدالت کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ سلام کا جواب مناسب انداز میں دیا گیا یا نہیں، اس لیے انہیں اس "اخلاقی حق" کے نفاذ سے سبکدوش کر دیا گیا لیکن مقتدرِ اعلیٰ کی عدالت میں خود زبان اور ہاتھ اس امر کی واضح شہادت پیش کر دیں گے کہ یہ طریقہ مناسب تھا یا نہیں۔ اور دل بھی یہ گواہی دے گا کہ اُس وقت جذبۂ اخلاص موجود تھا یا دل میں طنز اور بغض و عناد کی

کدورت بھری ہوتی تھی۔

اب حقوق کی ایک قدرے تفصیلی فہرست ملاحظہ کیجئے :

" اے محمدؐ! اُن سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں، تمہارے رب نے تم پہ کیا پابندیاں عائد کی ہیں !

(۱) اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

(۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

(۳) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔

(۴) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔

(۵) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اُس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

(۶) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن رُشد کو پہنچ جائے۔

(۷) اور ناپ تول میں پُورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پہ ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں۔ جتنا اُس کے امکان میں ہے۔

(۸) اور جب بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

(۹) اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔

ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

(۱۰) نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔ (الانعام ۱۵۳-۱۵۱)

یہ سارے عقائد و اعمال ایسے ہیں جن کے بارے میں خدا کی عدالت میں پوری پوری باز پرس ہو گی۔ اس عدالت کے دائرہ اختیار اور وسعتِ سماعت کو سورہ الزلزال میں بالکل واضح کر دیا گیا ہے۔

"پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔" (الزلزال۔ ۷۔۸)

ان آیات میں دیکھیے کہ شرک، والدین کے ساتھ سلوک، قتل اولاد، بے حیائی، تحفظِ جان مالِ یتیم، ناپ تول میں دیانت داری، راست گوئی، اللہ سے عہدِ بندگی اور اس کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم پر چلنے سے متعلق ساری ہدایات ایک ہی سلسلہ کلام میں اور یکساں زورِ کلام کے ساتھ دی جا رہی ہیں۔

یہاں سب سے پہلا حق اللہ کا بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ شرک ایک ایسا جرم ہے جو قطعی ناقابلِ معافی ہے۔ اس کے بارے میں خود قرآن کا فیصلہ ہے،

"اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا اور دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔" (النساء۔ ۴۸)

اس عظیم ترین حق کے نفاذ میں دنیا کی عدالت اور حکومت صرف ظاہری کردار ہی تک اپنی قوت استعمال کر سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ لوگ اس درخت کے نیچے آکر نماز پڑھتے ہیں جس کے سایہ میں حضورؐ نے بیعتِ رضوان لی تھی تو آپ کو اس طرزِ عمل میں شرک کا پہلو نظر آیا، آپ نے درخت جڑ سے کٹوا دیا اور فرمایا:

"اے لوگو! میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم عزیٰ کی پرستش کرنے لگے ہو سنو! آج کے بعد میں نہ سنوں کہ کوئی شخص ادھر آکر مصروفِ نماز ہوا۔ اگر مجھے کسی کے بارے

میں ایسی بات پہنچی تو میں اُسے قتل کرا دوں گا۔ جیسے مرتد کو قتل کرا دیا جاتا ہے"۱۶

لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو اور عزمی ولات و منات دلوں میں چھپے بیٹھے ہوں وہاں شرک کا سدِ باب کون کرے گا؟ اور اگر یہ سدِ باب کسی حکومت کے لیے ممکن نہیں تو کیا اللہ کا یہ حق محض ایک "اخلاقی حق" قرار پا کر کسی "قانونی حق" کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کر لے گا؟ ہر گز نہیں! یہ تو انسان اور خدا کے درمیان ہونے والے عہد و میثاق کی رُو سے اوّلین حق ہے جو ہر انسان پر عائد ہوتا ہے۔ اور باقی تمام قانونی و اخلاقی حقوق کا انحصار اسی ایک حق کو ماننے اور نہ ماننے پر ہے۔ یہی تو وہ حق ہے جس کے ادا نہ کرنے کے جرم میں اللہ تعالیٰ نے سزا کے نفاذ کے لیے روزِ آخرت کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ اسی دُنیا میں قوموں کو ایسی سخت سزا دی جو دوسروں کے لیے درسِ عبرت بن گئی۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ (الروم ۴۲)

"(اے نبی!) اُن سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو، پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ اُن میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔"

یعنی جب قوموں نے بحیثیتِ مجموعی شرک پر کمر باندھ لی اور ان انبیاء کرام کی بات مان کر نہ دی جو خدا کی طرف سے انہیں شرک سے روکنے اور ان پر خدا کے احکام نافذ کرنے پر مامور تھے تو اللہ تعالیٰ نے معاملہ براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنا عذاب نازل کر کے ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اِس حق کا مکمل نفاذ چونکہ انسان اور اس کے قائم کردہ بڑے سے بڑے انتظامی یا عدالتی ادارے کے دائرہ اختیار و امکان سے باہر ہے اس لیے یہ اپنے خارجی مظاہر کی حد تک تو قانونی حق شمار ہو گا، لیکن عقیدہ و ایمان کی باطنی کیفیت کے لحاظ سے انسانی معاشرہ میں ایک اخلاقی حق ہی قرار پائے گا۔ البتہ خدا کے ہاں یہ سب سے پہلا قانونی حق ہو گا جس کی باز پرس ہو

گی ہو۔ ایک مسلمان کے لیے اِس کو محض "اخلاقی حق" سمجھنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

یہ تو شرک کا معاملہ تھا، خدا کا رسولؐ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام میں ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے حق کی یہی حیثیت ہے ارشادِ نبویؐ ہے:

"اے عائشہ! اپنے کو اُن گناہوں سے بچانے کی خاص طور سے کوشش اور فکر کرو جن کو حقیر اور معمولی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بھی باز پرس ہونے والی ہے۔" (سنن ابنِ ماجہ۔ مسند دارمی۔ شعب الایمان بیہقی، روایت حضرت عائشہؓ)

انسان جن چیزوں کو معمولی سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دیتا ان کی ایک مثال خود قرآن سے لیجیے:

"تم نے دیکھا اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔" (الماعون ۱۔۷)

یتیم سے بدسلوکی، مسکین کو کھانا نہ دینا، یہ سب اخلاقی نوعیت کے جرائم ہیں۔ لیکن دیکھیے ان کا ارتکاب کرنے والوں کو آخرت میں تباہی کی وعید سنا کر بتایا جا رہا ہے کہ اِن چیزوں کو ہلکا نہ سمجھو۔ ان پر تمہاری ہلاکت و تباہی اور نجات اور راحت کا دار و مدار ہے۔ ایک اور مثال لیجیے:

"ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں احسان کا معاملہ رکھو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور

اپنی بڑائی پر فخر کرے اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں، جو کنجوسی کرتے اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کیلئے ہم نے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھلانے کیلئے خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہوا، اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسر آئی۔ آخر ان لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے، اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھپا نہ رہتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے۔ اور اُن لوگوں پر تمہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اُس وقت وہ سب لوگ، جنھوں نے رسولؐ کی بات نہ مانی اور اُس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔" (النساء ۳۶ - ۴۲)

یہ پوری آیات "اخلاقی حقوق" سے متعلق ہیں لیکن "اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا" سے لے کر آخری آیت تک کے مضمون پر غور کیجئے یہ ایسے حقوق ہیں جن کی باقاعدہ بازپرس ہو گی۔ جن پر جزا اور سزا دی جائے گی۔ ان پر گواہی لی جائے گی اور جب کوئی بات ڈھکی چھپی نہ رہے گی تو فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔

اس آیت میں خطاب براہِ راست بندے سے ہے۔ اور اس میں جن حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے کسی کو قانونی اور کسی کو اخلاقی قرار دینے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ کی ظاہر کردہ منشا (Expressed will) ہونے کی بناء پر ان سب کی حیثیت قانونی

ہے۔ہم آخر کس بنیاد پر یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ مقتدرِ اعلیٰ کا عطا کردہ فلاں حق تو قانونی ہے
اور فلاں اخلاقی ؟ اس درجہ بندی کے لیے ہمارے پاس وجہ جواز کیا ہے ؟ زیادہ سے زیادہ
ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقوق ریاست کی گرفت سے ماوراء ہیں، لیکن کیا یہ خود مقتدرِ اعلیٰ کی
گرفت سے بھی ماوراء ہیں ؟ اگر نہیں تو پھر ہم ان پر عمل کرتے نہ کرنے کے معاملہ میں آزاد
کب ہیں ؟ اور جب یہ آزادی باقی نہیں رہی اور معاملہ ضمیر و وجدان سے آگے بڑھ کر ان
کی لازمی پابندی تک جا پہنچا تو پھر یہ اخلاقی حق کیسے قرار پائیں گے ؟ یہ تو سارے کے سارے
قانونی حقوق ہیں۔ محض یہ بات کہ ریاست کے اختیاراتِ نفاذِ قانون کا ان میں عمل دخل
نہیں، ان کی اس حیثیت میں تو کوئی فرق پیدا نہیں کرتی کہ یہ مقتدرِ اعلیٰ کا حکم ہیں۔ہم اس
دنیا میں اگر انسانی عدالت اور انتظامیہ کی گرفت سے بچ بھی گئے تو مقتدرِ اعلیٰ کی عدالت
میں اُن کی جوابدہی سے کیسے بچیں گے۔

انسانوں میں بھی جن برگزیدہ ہستیوں کو اللہ تعالیٰ نبوت کے عظیم منصب پر فائز کرتا ہے۔
وہ چونکہ محدود علم و اختیار کی حامل انسانی حاکمیت کے تابع نہیں ہوتے بلکہ براہِ راست علیم و
خبیر مقتدرِ اعلیٰ کی اپنی حاکمیت کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔اس لیے ان کے ساتھ اس دنیا ہی
میں اخلاقی حقوق کے لیے بھی قانونی حقوق والا طریقِ نفاذ اختیار کیا جاتا ہے۔چنانچہ نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے رب کی نگاہ میں اخلاق کے عظیم ترین مرتبہ پر فائز تھے (وَاِنَّكَ لَعَلٰی
خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ القلم-۴) جب ایک ایسی مجلس میں، جہاں آپ بڑے بڑے سرداروں کو دعوت
دے رہے تھے، ایک نابینا صحابی حضرت ابن اُمِ مکتومؓ کی آمد اور ان کے تخاطب پر ناگواری
کا اظہار کیا تو آپ کو فوراً متوجہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ تنبیہ کے انداز میں ارشاد فرماتا ہے:

"ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی، اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔
تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا
اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پرواٸی برتتا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے

ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر کیا ذمہ داری ؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو ؟" (عبس ۱-۱۰)

اپنے رسولؐ سے چونکہ وحی کے ذریعے خدا کا براہِ راست رابطہ تھا اس لیے ایک اخلاقی حق کے مکمل نفاذ کے لیے اسی دنیا میں احتساب کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ لیکن عام لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ یہاں تو نیابتی اقتدار کے تابع ہیں، جو محدود علم و خبر کی بناء پر صرف قانونی حقوق کے نفاذ کا مکلف بنایا گیا ہے۔ لیکن جب سب لوگ کسی درمیانی رابطے کے بغیر براہِ راست اپنے رب کے حضور حاضر ہوں گے تو وہاں اخلاقی اور قانونی حقوق کا امتیاز ختم ہو جائے گا اور ہر حق کے بارے میں یکساں باز پرس ہو گی۔

اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اخلاق کی کیا اہمیت ہے، اور جن حقوق کو ہم "اخلاقی" کہتے ہیں وہ اخلاقی حقوق (Moral Rights) کی عام اصطلاح سے کتنا مختلف مفہوم اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور آخری عدالتِ انصاف میں جا کر کس طرح قانونی اور اخلاقی حقوق باہم مربوط ہو کر ایک ہی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

آخرت میں حقوق کی اس حیثیت کو ذہن میں رکھا جائے تو انسان کے اندر اعلیٰ ترین اخلاقی کردار نشو و نما پاتا ہے اور وہ کسی خارجی دباؤ یا قوت کے استعمال کی بناء پر نہیں، بلکہ اپنے نفس کے داخلی دباؤ اور احساس ذمہ داری کے تحت خدا کے ایک ایک حکم کی اطاعت بلا چون و چرا پوری ذہنی آمادگی اور خشیتِ قلب کے ساتھ کرتا ہے۔ اور ان احکام کو اخلاقی اور قانونی دائروں میں تقسیم نہیں کرتا۔ یہ تقسیم تو دراصل ریاست کے اختیارات کی حدود متعین کرنے کی غرض سے ہوتی ہے نہ کہ اس غرض سے کہ فرد کو کن امور میں خدا کی مکمل اطاعت کرنی ہے اور کن میں اُسے اس مکمل اطاعت سے کچھ رخصت یا رعایت ملی ہوتی ہے۔ قرآن کے احکام میں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق جملہ ہدایات اکثر ایک ہی سلسلۂ کلام میں اس طرح مربوط ملتی ہیں کہ اُن میں کردار کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے درمیان کوئی امتیاز قائم

کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ قرآن انسان کو "خارجی انسان" اور "باطنی انسان" میں تقسیم کر کے نہیں بلکہ اسے ایک ایسے "مکمل انسان" کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے جس کی ذہنی، جسمانی، جذباتی اور روحانی زندگی ایک مربوط وحدت و کلیت ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ۔ ۲۰۸)

"اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔"

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:۔

"یعنی کسی استثناء اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے علوم، تمہارے طور طریقے، تمہارے معاملات اور تمہاری سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ۔ ۱۶۰)

اللہ کو پورے انسان کی پوری اطاعت مطلوب ہے۔ یہ اطاعت جس حد تک انفرادی و اجتماعی زندگی کی فلاح و خیر اور انسانی معاشرہ میں انتشار و افراتفری کی روک تھام کے لیے ضروری تھی اس کا اہتمام قوانین اور ریاست کی قوتِ نافذہ کے ذریعہ کر دیا گیا۔ لیکن آخرت میں انسان کی نجات اور ابدی راحت کا فیصلہ جس قانون کی بنیاد پر ہو گا وہ "اخلاقی قانون" ہی ہے۔ کیونکہ عقائد و عبادات اور فضائلِ اعمال سب اسی کے تحت آتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اسلام میں اخلاقی قوانین و حقوق کو "قانونی حقوق" پر برتری حاصل ہے۔ کیونکہ خدا کی عدالت کا ضابطۂ قانون فی الحقیقت وہ ہو گا جس میں اخلاقی پہلو کو اولیت اور اہمیت حاصل ہو گی۔ وہاں "اخلاقی قانون" ہی کے ذریعہ ہمارے ایمان و عقائد اور ہماری عبادات کی کیفیت اور ہمارے ظاہری اعمال کی داخلی صورت متعین ہو گی۔ یہاں یہ قطعی ممکن ہے کہ ایک شخص منافق ہوتے

کے باوجود اپنے ظاہری کردار کی بناء پر مسلمان شمار ہوتا ہو اور مسلمانوں سے اسلام کے عطا کردہ حقوق بھی وصول کرتا ہو، لیکن خدا کے ہاں اُس کا فیصلہ ظاہر پر نہیں باطن پر ہوگا۔ اور قرآن کے اس واضح فیصلے کے مطابق ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا ۙ (النسآء۔ ۱۴۰)

"یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔

اور جہنم میں بھی ان کا ٹھکانا سب سے نچلے درجے میں ہوگا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۙ (النسآء۔ ۱۴۵)

"یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔"

یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو دنیا میں نماز بھی پڑھتے تھے روزہ بھی رکھتے تھے حج اور جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے اور ذکر الٰہی میں بھی مشغول نظر آتے تھے مگر ان کے دل کا حال کیا تھا؟

"یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ یہ جب نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوتے، محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں۔ نہ پورے اِس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف۔" (النساء ۱۴۳)

یہ منافقین اپنی اسی باطنی کیفیت کی بناء پر جو سراسر اخلاقی نوعیت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت سے سخت ترین سزا پائیں گے اور ان کے ظاہری اعمال جنہوں نے اس دنیا میں انہیں تمام حقوق کا مستحق بنا رکھا تھا، وہاں ان کے کسی کام نہ آسکیں گے۔ حالانکہ یہاں ان ظاہری اعمال ہی کی وجہ سے خدا کا رسول تک انہیں کافر قرار دینے کا فیصلہ نہیں کر

سکا تھا۔ اور عبداللہ بن ابی جیسے سردارِ منافقین کو محض اس کے زبانی اقرار اور ظاہری اعمال ہی کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہونے سے نہیں روکتا تھا۔

پورے قرآن اور بالخصوص قیامت و آخرت سے متعلق آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی داخلی اور باطنی زندگی کو اپنے فیصلے کی اصل بنیاد قرار دیا ہے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جسے ہم یہاں "اخلاق" کہتے ہیں اسی پر ہماری نجات کا انحصار ہے یہاں صرف اعمال نہیں بلکہ "اعمالِ صالح" ہماری اصل پونجی ہوں گے۔ اور یہ شرطِ "صالحیت" جو یہاں "خالصتاً" ایک اخلاقی معاملہ ہے وہاں سراسر قانونی معاملہ ہو گی۔

قانون پر اخلاق کی برتری کا اندازہ اس حدیث سے کیجئے جس میں خدا کا رسولؐ اپنی بعثت کا مقصد اور اپنی ساری دعوت و تبلیغ کا اصل مشن ہی اخلاق کی تکمیل بتا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (مسند احمد، بیہقی، ابن سعد)

"میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

اور یہ وہ اخلاق ہے جس کی پشت پر احتسابِ آخرت کے احساسِ ذمہ داری کی مضبوط قوتِ نافذہ موجود ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع اسلام میں قانون اور اخلاق کے اسی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں۔ اس لیے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔ جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ عقیدۂ آخرت ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی

اور اخلاقی حکم کے ساتھ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کے مضامین لگے ہوتے ہیں" عتا

تمام حقوق اللہ تعالیٰ کے ہیں

قانونی اور اخلاقی حقوق کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم حقوق کے اخلاقی پہلو کا ایک دوسرے زاویہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ ہمارے فقہا حقوق کی ایک اور تقسیم "حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کے زیرِ عنوان کرتے ہیں۔ اس تقسیم کے مطابق عقائد اور عبادات مثلاً نماز، روزہ اور حج وغیرہ حقوق اللہ ہیں اور وہ سارے حقوق جو بندوں پر بندوں کے لیے عائد ہوتے ہیں حقوق العباد ہیں۔ مثلاً جان و مال کا تحفظ اور حقوقِ وراثت، مہر و نفقہ وغیرہ۔ کچھ حقوق مشترک ہیں، مثلاً زکوٰۃ کہ وہ مالی عبادت ہونے کی حیثیت سے حق اللہ بھی ہے اور جن بندوں کو اس کا مستحق قرار دیا گیا ہے ان کے تعلق سے حق العباد بھی، اسی طرح قربانی کہ وہ اللہ کے نام پر دیئے جانے والے جانی نذرانہ کی حیثیت سے حق اللہ ہے اور کھال اور گوشت کے مستحقین کے تعلق سے حق العباد بھی۔

لیکن جس طرح ایک مسلمان کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی عدالت میں قانونی اور اخلاقی کا فرق مٹ جاتا ہے اور تمام حقوق قانونی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق بھی تمھیں آخری تجزیہ میں آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اور حقوق سارے کے سارے اللہ کے بن جاتے ہیں۔ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل کر لیتے ہیں جو انہیں دنیا کے کسی بھی نظامِ قانون یا ضابطۂ اخلاق میں حاصل نہیں ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی یہ تقسیم دراصل صرف ان حقوق کی ادائیگی کا رُخ متعین کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ یعنی جن حقوق کا وصول کنندہ (Recipient) اللہ تعالیٰ ہے وہ تو حقوق اللہ کی ذیل میں آجاتے ہیں۔ اور جن حقوق کا وصول کنندہ خود انسان ہے وہ حقوق العباد کی فہرست میں شامل ہیں۔ لیکن یہاں اس بنیادی سوال پر غور کیجیے کہ آخر حقوق العباد کی قانونی

اور اخلاقی حیثیت اور اِن کا جواز کیا ہے؟ کیا انسان اپنے کسی ذاتی استحقاق کی بناء پر ان حقوق کا مستحق بنا ہے یا اسے اپنی کسی دعوے (Claim) کسی جدوجہد (Struggle) یا اپنے منظور شدہ مطالبات (Accepted Demands) کی وجہ سے یہ استحقاق حاصل ہوا ہے؟ اس کے حقوق کسی معاہدہ عمرانی سے، حکومت اور عوام کے درمیان بالاتفاق ہونے والے کسی معاہدے سے، انسان کے وضع کردہ کسی دستور سے یا انسان اور انسان کے درمیان ہونے والے کسی سمجھوتے (Agreement) سے متعین ہوتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کے حقوق کی بنیاد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بنیاد صرف مقتدرِ اعلیٰ کا حکم ہے۔ اسی نے ہر مستحق کے حقوق کا تعین کیا ہے اور ان مستحقین کے درمیان ترجیحات (Priorities) طے کی ہیں۔ زکوٰۃ کے بارے میں حکم ہوتا ہے:

"یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردن چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا دانا و بینا ہے۔" (التوبہ ۶۰)

یہاں مستحقینِ زکوٰۃ کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان ترجیح بھی قائم کر دی گئی اور پھر آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ یہ حقوق، اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ اور ان کی ادائیگی اللہ کی طرف سے فرض کی گئی ہے۔ کسی نے اس فرض میں کوتاہی کی تو وہ یہ جان لے کہ اللہ سے اس کی کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اسی طرح ترکہ میں مختلف ورثاء کے حقوق کی وضاحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا" (النساء ۱۱)

"یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا

جاننے والا ہے۔"

اس آیت کے بعد مزید حصہ داروں کے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے اور اس سلسلہ کا اختتام بھی اس آیت پر ہوتا ہے:

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (النساء-۱۲)

"یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔"

نکاح کن عورتوں سے جائز ہے اور کن سے نہیں، اس کے بارے میں تفصیلی احکام دے کر فرمایا جاتا ہے:

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (النساء-۲۴)

"یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔"

طلاق کے سلسلہ میں عورتوں اور مردوں کے حقوق مقرر کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ-۲۲۹)

"یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

امانت اور عدل کے بارے میں حکم ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۵۸)

"مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

مال داروں کے مال میں سائل اور محروم کا حق متعین ہوتا ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذّٰرِيٰت-۱۹)

"اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم کے لیے۔"

غرض حقوق اللہ اور حقوق العباد میں سے کوئی ایک حق لے لیجئے اور اس کے بارے میں متعلقہ آیات اور احادیث کا مطالعہ کیجیے تو صاف محسوس ہوگا، ہر حق محض خدا کے حکم کی بناء پر حق قرار پایا ہے۔ اور اس کی ادائیگی کا فرض اسی کی طرف سے عائد کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حقوق کا صرف تعین ہی نہیں کیا بلکہ ہر حقدار کی جگہ خود اپنی ذات کو رکھا ہے تاکہ جس شخص پر متعلقہ فرض عائد ہوتا ہے اسے یہ احساس رہے کہ وہ یہ حق کسی فرد کو نہیں بلکہ خود قادرِ مطلق ہستی کے حضور پیش کر رہا ہے۔ سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام-۱۴۱)

"کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔"

یہاں دیکھیے فصل میں اپنے مستحق بندوں کا حصہ ادا کرنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس حق کو اپنی ذات سے منسوب کر کے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ جو کچھ تم میرے بندوں کو دو گے وہ دراصل خود میرا حق ہوگا جسے تم ادا کرو گے۔ وہ اس ادائیگی حق کا بدلہ بھی اپنے ذمہ لیتا ہے اور فرماتا ہے:۔

فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الروم - ۳۸)

"پس (اے مومن!) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق) یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

یعنی آپ حقوق اللہ ادا کر رہے ہوں یا حقوق العباد ان کا محرک ایک ہی ہے اور وہ ہے اطاعت الٰہی اور خوشنودی باری تعالیٰ اور آخرت میں اس کے اجر و انعام کے ذریعہ دائمی فلاح و راحت۔ ایک مسلمان اگر کسی دوسرے مسلمان بھائی کو اخلاص و محبت سے سلام بھی کرتا ہے تو اس کا محرک اس سے کوئی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کی بجا آوری کے

ذریعہ خود اس کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔ وہ جب اپنے مال سے زکوٰۃ یا صدقہ دیتا ہے۔ تب بھی اس کے پیشِ نظر یہی مقصد ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کے اجتماعی نظام میں تو اسے یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ میری رقم سے اللہ کے کس بندے کی مدد ہوگی۔ اور کسے نفع پہنچے گا۔ وہ تو اسے اللہ کا حق جان کر اسلامی حکومت کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ اللہ کے مستحق بندوں پر اسے صرف کر دیتی ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے درمیان یہی وہ رشتہ تھا جو منکرین زکوٰۃ کیخلاف حضرت ابوبکرؓ کے اعلانِ جہاد کا سبب بنا۔ جن قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا وہ بقیہ معاملات میں اسلام پر قائم تھے۔ نماز پڑھتے تھے۔ خدا کی وحدانیت اور اس کے نبیؐ کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے، بس انھوں نے اپنے مال سے اللہ کے بندوں کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس موقع پر بیشتر صحابہ کرامؓ اور خود حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر، صاحبِ عزیمت اور مزاجِ دین کے رمز آشنا کی رائے یہ تھی کہ "اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والے لوگوں سے ہرگز نہ لڑنا چاہیے بلکہ انہیں ساتھ ملا کر مرتدین کے خلاف مصروفِ پیکار ہونا چاہیے۔"

یہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے وہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک حق اللہ اور حق العباد میں کوئی فرق نہ تھا جب کہ حضرت عمرؓ اس میں فرق کر رہے تھے۔ اور بالآخر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب صحابہؓ سے مشورے کے بعد پُرزور الفاظ میں فرمایا:

"واللہ اگر منکرین زکوٰۃ مجھے ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں ادا کیا کرتے تھے تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ ـــــ جن کی رائے میں اس موقع پر منکرینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھا، قدرے تیزی میں آگئے اور کہا:

"ہم ان لوگوں سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں جب رسول اللہؐ نے صاف فرمایا ہے کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ زبان سے

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہہ دیں۔ جو شخص یہ کلمہ زبان سے ادا کر دے گا اس کی حفاظتِ جان و مال مسلمانوں کے ذمہ ہو گی، البتہ جو حقوق اس کے ذمہ واجب ہوں گے ان کی ادائی کا مطالبہ اس سے ضرور کیا جائے گا، ہاں اس کی نیت کا حساب اللہ اس سے خود لے گا۔"

لیکن حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ کے دلائل سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے فرمایا:

"واللہ میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے ذمہ جو حقوق ہوں گے ان کی ادائی کا مطالبہ ان سے ہر حال میں کیا جائے گا۔"

حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے:

"یہ جواب سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ نے منکرینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے لیے ابو بکرؓ کو شرحِ صدر عطا کیا ہے۔ اور حق وہی ہے جو ابو بکرؓ کہتے ہیں۔" [۱]

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بندوں کا جو حق اللہ کے حکم سے مقرر ہوا ہے، اسلام میں اسے کیا حیثیت حاصل ہے اور کس طرح وہ حقوق اللہ کی طرح واجب الادا ہے۔ اور اس کی ادائیگی سے انکار براہِ راست خدا کی اطاعت سے انکار کے مترادف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:-

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۝ (النساء-۱)

"اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

اس آیت کے فوراً بعد یتیموں، عورتوں، مردوں، مساکین، ورثاء اور دیگر بندگانِ خدا کے حقوق کا طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن آغاز ہی میں بتایا جا رہا ہے کہ ہر ایک کا حق اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے سے ہے، ان حقوق کے معاملہ میں وہی تم پر نگراں ہے، اس سے ڈرو اور حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرو ورنہ آخرت میں تمہاری سخت گرفت ہو گی۔

قرضِ حسنہ دینا کسی ضرورت مند محتاج کی مدد کرنا ہے لیکن یہ قرض اللہ نے اپنے اس بندے کے بجائے خود اپنے ذمہ لگایا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ وعدہ فرمایا ہے کہ میں اسے کئی گنا بڑھا کر واپس لوٹاؤں گا اور اس کے صلے میں تمہارے گناہ بھی معاف کر دوں گا۔

إِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (التغابن۔۱۷)

"تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا۔ اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا" ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَأَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۔ (المزمل۔۲۰)

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو"

اسی طرح انفاق کا معاملہ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کسی بھی حاجت مند بندے کی مالی اعانت کو "فی سبیل اللہ" قرار دے کر اس کا وصول کنندہ (Recipient) خود بن جاتا ہے۔ اور اس کے بہترین صلے کا وعدہ فرماتا ہے :

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں" (البقرہ۔۲۶۲)

یہی بات سورہ الحدید آیت ۱۰ اور ۱۸، سورہ البقرہ آیت ۲۷۲ اور دوسری متعدد آیات میں دہرائی گئی ہے۔ آدمی کسی کے ساتھ اللہ کو گواہ بنا کر زبانی یا تحریری معاہدہ کرے تو وہ معاہدہ خود اللہ سے ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہر فریقِ معاہدہ کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان کے اعمال کا نگراں بن جاتا ہے۔

وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ (النحل۔۹۱)

"اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے

ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔

اسی طرح نبیؐ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ پر بیعت قرار دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح۔۱۰)

"اے نبیؐ! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔"

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"جب بھی کوئی شخص صدقہ دیتا ہے تو وہ سائل کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے اور وہ اسے سائل کے ہاتھ پر رکھتا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (التوبہ۔۱۰۴)

"کیا انہیں معلوم نہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور صدقات لیتا ہے۔" (ابن کثیر۔ درمنثور)

ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، اللہ نے ہر حق کو اپنی ذات سے وابستہ کر کے اسے اتنی بلند اخلاقی اور قانونی حیثیت عطا کر دی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ان میں فرضیت و اہمیت کے لحاظ سے کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ جہاں بھی کوئی حق ہم پر واجب الادا ہے وہاں اس کے وصول کرنے والے کے ساتھ ہستی باری تعالیٰ خود موجود ہے۔ اس سلسلہ میں احادیث ملاحظہ کیجئے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن کہے گا اے آدمؑ کے بیٹے! میں بیمار ہوا تھا تو تُو نے میری عیادت نہیں کی، وہ کہے گا۔ اے میرے رب! میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ تُو تو رب العالمین ہے۔ تو اللہ فرمائے گا کیا تجھے علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا تو تُو نے اس کی عیادت نہیں کی۔

کیا تجھے خبر نہ تھی کہ اگر تو اُس کی عیادت کو جاتا تو اس کے پاس مجھے پاتا۔" (مسلم روایت ابوہریرہؓ)

دوسری حدیث میں اسی نوعیت کا مضمون ان الفاظ میں ملتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ عزوجل قیامت کے دن کہے گا اے آدمؑ کے بیٹے! مَیں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے نہیں کھلایا۔ تو وہ کہے گا کہ اے میرے رب! مَیں تجھے کیونکر کھانا کھلاتا۔ جب کہ تو سب لوگوں کی پرورش کرنے والا ہے۔ اللہ کہے گا، کیا تجھے خبر نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا لیکن تُو نے اسے نہیں کھلایا۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اگر تُو اُس کو کھانا کھلاتا تو اپنے کھلائے ہوئے کھانے کو میرے ہاں پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! مَیں نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تُو نے مجھے نہیں پلایا۔ تو وہ کہے گا کہ اے میرے رب! مَیں تجھے کیسے پلاتا، جب کہ تو خود رب العٰلمین ہے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا۔ لیکن تُو نے اسے پانی نہیں دیا۔ اگر تُو اس کو پانی پلا دیتا تو تُو وہ پانی میرے ہاں پاتا۔" (مسلم۔ روایت ابوہریرہؓ)

زکوٰۃ، صدقہ اور قرض دینا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسوں کو پانی پلانا اور کسی کے ساتھ معاہدہ کرنا یہ سب حقوق العباد ہیں۔ لیکن دیکھئے ہر حقدار کے ساتھ اپنی ذات کو وابستہ کر کے اللہ تعالیٰ نے انہیں کس طرح حقوق اللہ کی سطح پر پہنچایا ہے۔ مشہور فقیہہ شاطبی فرماتے ہیں:

"حقوق کی دو قسمیں ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ جو حقوق العباد ہیں دراصل ان میں اللہ کا حق بھی پایا جاتا ہے۔ اور جن کو ہم حقوق اللہ سے موسوم کرتے ہیں ان کے تمام فوائد بندوں ہی کو پہنچتے ہیں۔" ۱۹

ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقوق تو سارے اللہ ہی کے ہیں اور یہ سب حق بندگی کے تحت آجاتے ہیں البتہ ان حقوق کے تمام فوائد (Benifits) بندوں کو پہنچتے ہیں۔ بندہ حقوق اللہ ادا کرتا ہے تو اس کا تمام تر فائدہ خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ

اللہ اس سے بہت بلند و بالا اور بے نیاز ہے کہ بندہ اسے کوئی فائدہ پہنچا سکے۔ وہ عبادت کرتا ہے تو تزکیہ نفس، تشکیلِ کردار اور تکمیلِ انسانیت کی صورت میں خود ہی مستفید ہوتا ہے اور جب حقوق العباد ادا کرتا ہے تو یہ فائدہ دو طرفہ ہو جاتا ہے۔ حق ادا کرنے والا اس دنیا میں بہترین سیرت و کردار کا حامل ہونے کی وجہ سے عزت و احترام، ضمیر کے سکون، قلب کی راحت اور پھر آخرت کی سرخروئی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اور حق وصول کرنے والا اپنا حق پاکر اطمینان و مسرت کی زندگی بسر کرتا ہے، معاشرے میں باہمی خلوص و محبت اور ایثار و ہمدردی کے مستحکم رشتے استوار ہوتے ہیں اور یوں پورا انسانی معاشرہ امن و سکون اور فلاح و سلامتی کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

اب آخر میں یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں حقوق کی ترجیحات مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اُخروی عدالت میں ان حقوق کی کیا ترجیحات رکھی ہیں۔ حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی۔ ایک وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا، دوسری وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا۔

جس فردِ جرم کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے۔ اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہو گی' وہ ظلم ہے۔ جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے۔ اور جس کا معاملہ خود اس بندے اور اس کے خدا کے درمیان ہے (جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو) تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کی اس فردِ جرم کے گناہ معاف کر دے گا، اور اسے بخش دے گا لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے۔ جو ایک بندے نے دوسرے بندے پر کیا ہے۔ الاّ یہ کہ صاحبِ حق اسے معاف کر دے۔" (جمع الفوائد، محمد بن سلیمان المغربی ج نمبر ۲ ص نمبر ۵۲۷ مطبوعہ لائلپور۔ بحوالہ مسند بزاز)

یہی روایت مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فقہ حنفی کی مشہور کتاب الھدایہ میں مسائلِ حج کے زیرِ عنوان لکھا ہے :

"حج اس وقت فرض ہوگا جب کہ اہل وعیال کے لیے اتنا نفقہ بھی چھوڑ کر جائے کہ وہ اس کے واپس آنے تک اپنی گزر بسر کر سکیں۔ کیونکہ وَحَقُّ الْعَبْدِ مُقَدَّمٌ عَلٰی حَقِّ الشَّرْعِ بِاَمْرِہٖ بندوں کے حقوق مقدم ہیں خود خدا کے حقوق سے، اور یہ تقدیم خود حکمِ الٰہی کی بنا پر ہے۔"[۲۰]

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق پر اپنے بندوں کے حقوق کو کیوں مقدم فرمایا ہے! اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ خدا کے حقوق ادا نہ کر کے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم کرتا اور نقصان اٹھاتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی بندے کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کے ایک مفاد (Interest) کو مجروح کرتا ہے۔ اسے حقیقتاً نقصان پہنچاتا ہے اور یہی وہ ظلم ہے جو خدا کے نزدیک ناقابلِ معافی ہے اِلّا یہ کہ خود صاحبِ حق اسے معاف کر دینے پر رضامند ہو جائے۔ یہ ہے اسلام میں حقوق کی تاریخ ان کی قانونی حیثیت اور ان کا اخلاقی مقام۔ بدقسمتی سے یہ تصورِ حقوق خود مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اور انھوں نے خدا کے مقرر کردہ حقوق کو قانونی، اخلاقی اور حقوق اللہ و حقوق العباد میں تقسیم کر کے بعض کو اہم اور بعض کو نسبتاً کم اہم قرار دے کر خود ہی ایسی درجہ بندی کر لی ہے جس کی قرونِ اولیٰ میں کوئی جھلک نہیں ملتی۔ اطاعت کے معاملہ میں کردار کی وحدت و یک رنگی صحابہ کرامؓ کی سیرت کا جوہر تھی وہ جتنی فکر، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں کرتے تھے اتنی ہی فکر انہیں ناپ تول میں دیانت داری، قول و قرار کی پاسداری، ضرورت مند بھائیوں کی مدد اور دوسرے معاملاتِ زندگی سے متعلق خدا اور رسولؐ کے ایک ایک حکم کی بجا آوری کے بارے میں رہتی تھی۔ ان کی شخصیت خانوں میں بٹی ہوتی نہیں تھی بلکہ مکمل خود سپردگی (Total Submission) کا نمونہ تھی۔ شاطبی اسی روحِ اطاعت کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہتے ہیں :

"مستحب، مندوب، فرض اور مکروہ و حرام کی جو تقسیمات ہیں، تقرب الی اللہ اور تزکیہ نفس کے سلسلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیونکہ اصل مقصود تزکیہ نفس ہے، جو اس میں مدد دے وہی اہم ہے۔ چاہے وہ مستحب ہو یا فرض۔ اور جو برائی کی طرف لے جاتے وہ ممنوع ہے۔ خواہ وہ مکروہ ہو یا حرام۔" [۲۱]

عقیدۂ توحید کی رُوح یہ ہے کہ ہر کام اللہ کے حکم سے، اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے اور اللہ ہی کی رضا کے لیے کیا جاتے۔ یہی اصول حقوق کے معاملہ میں کارفرما ہے۔ اور اس کے مطابق ہر حق اپنے تعین، اپنے نفاذ اور اپنے نتائج کے ہر مرحلے میں خدا کی ذات سے وابستہ ہے۔

کتبِ حوالہ

۱۔ عدالتِ نبویؐ کے فیصلے : عبداللہ القرطبی۔ مطبوعہ ادبستان لاہور۔ ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۹۰

۲۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۹۰

۳۔ عمرؓ بن خطاب : طنطاوی، مترجم عبدالصمد صارم۔ مطبوعہ البیان لاہور۔ ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۳۱

۴۔ جادہ و منزل : سیّد قطب شہید۔ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۷۲ء صفحہ ۳۹۷

۵۔ سیاسی وثیقہ جات : ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۷

۶۔ کتاب الخراج : قاضی ابویوسف، مترجم محمد نجات اللہ صدیقی۔ مطبوعہ مکتبہ چراغ راہ کراچی

۷۔ Montgomery watt. W. "The Majesty that was Islam".
Sidwick & Jackson, London. (1974) p. 47

۸۔

۹۔ Stern, S M. "Fatimid Decrees". Faber and Faber,
London (1964)

۱۰۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق : مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۴ء
صفحہ ۴۴ بحوالہ احیاء العلوم۔ جلد نمبر ۳ صفحہ ۵۶۔

۱۱۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۱۶

۱۲۔ سیرت النبیؐ : جلد چہارم۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی۔ مطبوعہ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۱۶

۱۳۔ عدالتِ نبویؐ کے فیصلے : عبداللہ القرطبی۔ مطبوعہ ادبستان لاہور۔ ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۱۷

۱۴۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۲۸۴

۱۵۔ ایضاً : صفحہ ۲۸۶

۱۶۔ ایضاً : صفحہ ۴۰۷

۱۷۔ اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت : مولانا مفتی محمد شفیع مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم۔ کراچی صفحہ ۴۲

۱۸۔ ابوبکرؓ : محمد حسین ہیکل۔ مترجم شیخ محمد احمد پانی پتی۔ مطبوعہ میری لائبریری لاہور۔ ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۳۵۔

۱۹۔ الموافقات : شاطبی۔ مطبوعہ التجاریہ الکبریٰ۔ قاہرہ مصر جلد نمبر ۳ صفحہ ۲۴۷

۲۰۔ الہدایہ : مرغینانی۔ مطبوعہ کلام کمپنی۔ کراچی۔ جلد اوّل کتاب الحج صفحہ ۲۳۳

۲۱۔ الموافقات : صفحہ ۲۴۱

اسلام میں بنیادی حقوق کے تحفظات

اسلام نے بنیادی حقوق کے عملی نفاذ اور ان کے حصول کی یقینی ضمانت کے لیے جو تحفظات فراہم کیے ہیں گزشتہ ابواب میں ان پر ضمناً گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن مناسب ہو گا کہ اس علیحدہ عنوان کے تحت نہ صرف ان کا مختصراً اعادہ کر لیا جائے بلکہ اس سلسلہ میں دوسرے تمام عوامل کو بھی یکجا کر کے یہ دیکھا جائے کہ اسلامی ریاست میں انسان کے بنیادی حقوق حکمرانوں کی دستبرد اور ان کی سلسلہ مداخلت سے کس طرح محفوظ رہتے ہیں۔

آج عالم انسانیت کا اہم مسئلہ ان حقوق کا تعین، ان کی خوشنما فہرستوں کی تیاری، مملکت کے دستور میں ان کی شمولیت، بین الاقوامی منشور و اعلانات کا اجراء اور "یوم انسانی حقوق" کا انعقاد نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن حقوق کو انسانی حقوق گنوایا اور تسلیم کیا جا رہا ہے انہیں حاکمانِ وقت کے ہاتھوں غصب ہونے اور پیروں تلے روندے جانے سے کیسے بچایا جائے؟

اسلام نے اپنے نظامِ حکومت میں اس عملی پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اور انسانی حقوق کو ایسے مؤثر و مستحکم تحفظات مہیا کیے ہیں جو ایک طرف حکمرانوں کے اندر آمریت و فسطائیت کے جراثیم کی پرورش کے امکان اور انہیں ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی راہ پر لے جانے والے اسباب و محرکات کی جڑ کاٹ دیتے ہیں اور دوسری طرف عام شہریوں کو انسانی اقتدار سے مرعوبیت و خوفزدگی اور اس کے مقابلے میں اپنی بے بسی و بیچارگی کے منفی احساسات سے نجات دلا کر اُن کے اندر خود اعتمادی، بلند حوصلگی

اور جرأت و بیباکی کے جوہر اُبھار کر ایک ایسی زبردست قوتِ مزاحمت پیدا کر دیتے ہیں کہ کسی شخص کے لیے ان پر اپنی حاکمیت مسلّط کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

قرآن نے آمریت کی حقیقت کو ایک چھوٹی سی آیت میں سمو کر ہم پر واضح کر دیا ہے کہ اس کا اصل سبب کیا ہے اور وہ اپنا تسلط جمانے میں کامیاب کیونکر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو بدترین نمونہ آمریت کے طور پر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے کردار کی جو خرابیاں ایک ایک کر کے گنوائی ہیں ان میں سے ایک، بلکہ ان سب کی جڑ یہ ہے۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ۔ (الزخرف ۵۴)

"وہ اپنی قوم کو ہلکا سمجھتا تھا۔"

یعنی فرعون اپنے مقابلے میں اپنی قوم کے افراد کو پست و ذلیل اور کمزور سمجھتا تھا اور اس کا یہی اندازِ فکر خدائی کے دعوے اور آمریت و سطایّت کی اصل جڑ تھا۔ اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے

فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۝ (الزخرف۔۵۴)

"اور اس نے (قوم نے) اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔"

یہ وہ سبب تھا جس کی بنیاد پر فرعون کی آمریت کا سکہ چل رہا تھا۔ اس کا جرم تو یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو ہلکا اور بودا سمجھ کر اس پر ہر طرح کے مظالم ڈھا رہا تھا۔ اور انہیں اپنے سامنے پستی و ذلّت میں مبتلا دیکھ کر اس کی انانیت تسکین پاتی تھی۔

يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (القصص۔۴)

"ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل و خوار کرتا تھا۔"

لیکن خدا کے نزدیک وہ قوم بھی کچھ کم قابلِ مذمت نہ تھی جو اس کی خدائی کے سامنے سر جھکا رہی تھی اور اس پستی و ذلت پر رضامند ہو گئی تھی۔ قرآن نے اس جرم کی مرتکب قوم کو فاسق قرار دیا ہے یعنی اللہ کی حدوں کو توڑنے والی۔ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں سے پہلی اور سب سے اہم حد یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کو اپنا معبود و فرماں روا نہ بناؤ۔ جو قوم اس جرم کا ارتکاب کرے

گی اُسے قومِ فرعون کے سے حشر کا سامنا کرنا ہوگا۔

اپنے بندوں کو ذلت و خواری کے اس عذاب سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ضابطہ حیات میں ایک طرف آمریت کے انسداد کا پورا پورا اہتمام کیا ہے اور دوسری طرف عام لوگوں کو آمریت کے لیے ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کے نظامِ حکمرانی میں جو تحفظات مہیا کیے گئے ہیں انہیں ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(ا) تطہیرِ تصورِ حاکمیت

(ب) تطہیرِ قیادت

(ج) تحدیدِ اختیارات

(د) احتسابِ امارت

اب ان میں سے ہر ایک کا مختصراً جائزہ لیجئے:۔

(ا) تطہیرِ تصوّرِ حاکمیت

ا۔ نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ

اسلام نے اپنی اصلاحی اسکیم کا آغاز تصورِ حاکمیت کی تبدیلی سے کیا ہے۔ قرآن کے اس اعلان کے بعد کہ اللہ تعالیٰ تمہارا خالق و مالک اور رازق و رب ہی نہیں ہے حاکم و فرمانروا بھی ہے اسلامی ریاست میں انسانی حاکمیت کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مقتدرِ اعلیٰ مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں حاکم و محکوم کی تقسیم ختم ہوتی۔ ادنیٰ شہری سے لے کر اعلیٰ ترین عہدیدار تک سب مساوی الحیثیت قرار پاتے، انسان اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہوا اور جو لوگ ان کے امورِ ریاست کے نگران بنے وہ احکم الحاکمین کے سامنے جواب دہی اور آخرت کی سزا کے خوف سے مغلوب ہو کر اپنی اطاعت کرانے کی بجائے خود اتباعِ قرآن و سنت کی راہ پر گامزن ہوتے۔ اس تصورِ حاکمیت کے تحت نہ کسی انسان کے لیے آمریت کی راہ پر قدم بڑھانے کا

کوئی امکان باقی رہتا ہے اور نہ شہریوں کی گردن میں اتنی لچک اور نرمی پیدا ہو پاتی ہے کہ وہ کسی آمر کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیں۔ نہ کوئی امیر یا امام غصبِ حقوق کا تصوّر کر سکتا ہے اور نہ قوم کسی کو ان حقوق پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت دے سکتی ہے جو مقتدرِ اعلیٰ نے اسے عطا کیے ہیں۔
یہ تصوّرِ حاکمیت انسانی حقوق کے بارے میں حکومت کا رویّہ یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ اسی تصوّرِ حاکمیت کا کرشمہ ہے کہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ بیعتِ خلافت کے بعد اپنے اوّلین خطبے میں فرماتے ہیں:۔

"تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے، جب تک میں اسے اُس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تمہارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے، جب تک اس کے ذمے جو حق ہے وہ اس سے نہ لے لوں"۔ ع۱

یہ تو انسانی حقوق کا معاملہ تھا۔ اور ان کے نفاذ و احترام کی ذمہ داری نے انہیں اپنے سوا دو سالہ عہدِ خلافت میں اقتدار کی "لذتوں اور راحتوں" سے کتنا "لطف اندوز" ہونے کا موقع دیا! اس کے بارے میں وفات سے قبل بڑے غمگین لہجے میں فرماتے ہیں:۔

"کاش میں سقیفہ بنی ساعدہ والے دن خلافت کا بار عمرؓ اور ابو عبیدہؓ میں سے کسی پر ڈال دیتا۔ ان میں سے کوئی امیر ہوتا اور میں اُس کا وزیر"۔ ع۲

آخری وصیّت میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ ہدایت بھی شامل تھی:۔

"میں نے دورانِ خلافت بیت المال سے جو رقم لی تھی اُسے واپس کر دیا جائے اور اس غرض سے میری فلاں زمین بیچ کر اس سے حاصل شدہ رقم بیت المال میں جمع کرا دی جائے"۔ ع۳

چنانچہ حضرت عمرؓ نے آپ کی وصیّت پر عمل کرتے ہوئے زمین بیچ کر یہ رقم بیت المال میں جمع کرا دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں وصیّت فرمائی کہ انہیں دو کپڑوں میں کفن دیا جائے جو وہ بالعموم پہنا کرتے تھے۔ کیونکہ "نئے کپڑے

پہننے کا زیادہ حقدار زندہ شخص ہے۔" ع۴

جہاں لوگوں کے حقوق کے سلسلہ میں یہ عزم و احساسِ ذمہ داری اور خود اپنے نفس کے حقوق کے معاملہ میں ایثار و قربانی کا یہ جذبہ کارفرما ہو وہاں آمریت کے تسلط کا کیا امکان باقی رہ جاتا ہے؟

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ منصبِ خلافت پر مامور کیے جانے کے بعد اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس بوجھ کو اٹھانے والا کوئی شخص مجھ سے زیادہ طاقت والا ہے تو اس ولایت کو قبول کرنے کی نسبت مجھے یہ زیادہ پسند ہوتا کہ کوئی میری گردن اڑا دیتا۔" ع۵

یہ تو "خواہشِ اقتدار" کی بات تھی اب نفاذِ حقوق کا عزم دیکھئے:۔

"لوگو! تمہارے معاملات کا میں والی وارث بنایا گیا ہوں۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میری سختی اب کم ہو گئی ہے، البتہ ظلم اور دست درازی کرنے والوں کے لیے بدستور رہے گی۔ لیکن جو صاحبِ دین و تقویٰ ہیں، مَیں ان کے لیے بہت ہی نرم ہوں۔ مَیں کسی کو کسی پر ظلم نہیں کرنے دوں گا جب تک کہ اس کے ایک رخسار کو زمین پر نہ رگڑ دوں اور اس کے دوسرے رخسار پر اپنا قدم نہ رکھ دوں۔ حتیٰ کہ وہ حق کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ اس سختی کے باوجود مَیں اپنا رخسار اہلِ عفت و صواب کے لیے زمین پر رگڑتا ہوں۔" ع۶

اور آخر میں "فیضِ اقتدار" کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ شہادت کے وقت بیٹے سے دریافت فرمایا:

"اے عبداللہ بن عمر! دیکھ میرے اوپر کتنا قرض ہے۔"

حساب لگایا گیا تو چھیاسی ہزار درہم کے لگ بھگ نکلا۔ فرمایا:۔

"اگر آلِ عمر کا مال اسے پورا کر سکے تو اس سے ادا کر دینا ورنہ بنو عدی سے درخواست کرنا۔ اگر پھر بھی پورا نہ ہو تو قریش سے سوال کرنا ان کے علاوہ اور کسی سے نہ مانگنا۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا:۔

"بیت المال سے قرض لے کر کیوں ادا نہیں کر دیتے ؟"

فرمایا "معاذ اللہ میرے مرنے کے بعد تم اور تمہارے دوست یہ نہ کہیں کہ ہم نے اپنا حصہ عمرؓ کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح تم لوگ مجھے زیرِ بار کر دو گے اور ایک مشکل میں پھنسا دو گے کہ خدا ہی نکالے گا تو نکل سکوں گا۔" ع۷

اس کردار کا جوہر کیا تھا ؟ وہی عقیدۂ آخرت اور مقتدرِ اعلیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس۔ دمِ آخر سخت گھبراہٹ کا عالم تھا اور خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے حضرت ابنِ عباسؓ نے تسلی دی تو فرمایا :-

"خدا کی قسم اگر میرے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو عذابِ الہٰی کے دیکھنے سے پہلے پہلے اسے قربان کر دیتا۔" ع۸

حضرت ابنِ عباسؓ نے آپ کے عہدِ خلافت کی تعریف کی تو کہا :

"کیا خلافت و امارت کے بارے میں میری تعریف و تزکیہ کرتے ہو؟ میں رسولؐ اللہ کے ساتھ رہا تو وہ مجھ سے خوش رہے۔ اور ابوبکرؓ کے ساتھ رہا تو دمِ وفات تک فرمانبرداری کرتا رہا۔ مجھے تو تمہاری اس امارت و خلافت سے خطرہ ہے۔" ع۹

یہ ہے وہ کردار جو اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ پر ایمان کی اساس سے اُبھرتا اور حکمرانوں کو انسانیت کے لیے ایک عذاب کی بجائے رحمت بنا کر آمریت کا مکمل سدباب کر دیتا ہے۔

۲۔ تصوّرِ امانت

اسلامی ریاست میں انسانی حقوق کا دوسرا بڑا محافظ حکومت کا یہ تصور ہے کہ وہ ایک امانت ہے اور اس کے نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت ایک امین کی سی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان اس قول و قرار کے بعد کہ :

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ (الانعام۔ ۱۶۲)

کہو میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ۔ ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔"

مسلمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی سونپی ہوئی ایک مقدس امانت بن گئی ہے اور وہ اپنا حقِ تصرف خود اپنی آزادانہ مرضی اور اپنے بے لگام اختیار و ارادے سے نہیں بلکہ اصل مالک کی مرضی اور اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق استعمال کرنے کا پابند ہو گیا ہے۔ یہ اسی تصورِ امانت کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ساتھ ظلم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے "خیانتِ نفس" کا مجرم ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ بنی ظفر کے طعمہ بن اُبیرق نے جب ایک یہودی پر زرہ کی چوری کا جھوٹا الزام لگایا تو حضورؐ سے ارشاد ہوا:

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ (النساء۔ ۱۰۷)

"جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت میں نہ جھگڑو۔"

گویا جس نفس کو بندہ اپنے رب کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہو اگر وہ اسے بے جا تصرف میں لاتا ہے تو امانت میں خیانت کرتا ہے۔ امانتِ نفس کا تقاضا ہے کہ بندہ ہمیشہ حق گوئی اور دیانت داری کا راستہ اختیار کرے۔ جھوٹ اور دغا بازی سے کسی اور کا نہیں خود اس کے مرتکب کا سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ خائن بن کر اصل مالک کی نظروں میں گرتا اور اس کی عدالت سے سخت سزا پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔ ظلم کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (الطلاق۔ ۱)

"اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا۔"

یعنی ظالم کے ظلم کا اوّلین نشانہ خود اس کی اپنی ذات بنتی ہے۔ اس کے ظلم سے کسی اور کا کچھ بگڑتا ہو یا نہ بگڑتا ہو اس کی اپنی ہلاکت و بربادی کا سامان ضرور ہو جاتا ہے۔

اس تصورِ امانت کی رُو سے ہر شخص پر احتساب و ذمہ داری کا بار بقدرِ امانت ہے۔ جس کے پاس اسباب و وسائل اور اختیارات و اقتدار کی جتنی امانت موجود ہے وہ اسی تناسب سے اپنے مالک کے حضور اپنے اعمال و افعال کا جوابدہ ہے۔ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کو اس تصورِ امانت کا پورا پورا شعور و احساس تھا۔ اسی لیے وہ ذمہ داری کا کوئی منصب سنبھالنے سے دُور بھاگتے تھے اور جب قوم کے مطالبہ یا امیر کے حکم سے وہ کوئی منصب سنبھال لیتے تھے تو اس کا حق ادا کر دیتے تھے۔ اُن پر جواب دہی کا خوف اس درجہ غالب رہتا تھا کہ معاشرہ میں ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں :۔

"جو شخص حکمران ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہو گا۔ اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مبتلا ہو گا۔ اور جو حکمران نہ ہو اس کو ہلکا حساب دینا ہو گا۔ اور اس کے لیے ہلکے حساب کا خطرہ ہے۔ کیونکہ حکام کے لیے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو۔ اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے وہ خدا سے غداری کرتا ہے۔" [۱۰]

حضرت عمرؓ کے خوفِ آخرت کا یہ عالم تھا :

"دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی گر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا۔" [۱۱]

حضرت عمرؓ پر بارِ امانت کی ذمہ داری کا احساس شدت سے طاری ہوتا تو زمین سے مٹی اٹھا لیتے اور اسے مٹھی میں بھینچ کر فرماتے :

"اے کاش میں مٹی ہوتا، بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اے کاش میری ماں مجھ کو نہ جنتی"۔ ع۱۲

یہی حال حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز ایک مرتبہ ساری رات مُصلّے پر بیٹھے روتے رہے۔ صبح کو بیوی نے اس غیر معمولی رنج و غم کا سبب دریافت کیا تو فرمایا:

"میں نے اپنے آپ کو اس پوری امت کے سیاہ و سفید کا ذمہ دار پایا۔ مجھے زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے غریب الوطن، خستہ حال بھکاری، محتاج غرباء مجبور و مظلوم قیدی اور اسی قبیل کے دوسرے لوگ یاد آئے۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ اللہ ان سب کے بارے میں مجھ سے محاسبہ کرے گا۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاملہ میں میرے خلاف مقدمہ لڑیں گے۔ میں ڈرا کہ خدا کے آگے میرا کوئی زور نہ چلے گا اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں کسی بھی دلیل سے مطمئن نہ کر سکوں گا۔ اس پر میری جان لرز اٹھی اور مجھے اپنے بارے میں بڑا ڈر لگنے لگا"۔ ع۱۳

ایک مسلمان کے لیے یوں تو جان و مال اور اس کے زیر تصرف ہر چیز خدا کی امانت ہے۔ لیکن خلافت و امارت کے لیے تو بالخصوص لفظ "امانت" ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک بار یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی کسی جگہ کا امیر مقرر کر دیا جائے تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"تم کمزور ہو اور امارت ایک امانت ہے۔ قیامت کے دن یہ رسوائی اور پشیمانی کا باعث بن جائے گی۔ بجز اُس شخص کے جو اس کا حق رکھتا ہو اور اسے اختیار کر کے اس سلسلہ میں عائد ہونے والی ساری ذمہ داریاں ادا کرے"۔ ع۱۴

اسی طرح آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا:

"جس نے مسلمانوں کی کسی چیز پر بھی کسی ایسے شخص کو والی و حاکم بنا دیا کہ اس سے بہتر اور اصلح المسلمین موجود ہے تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے خیانت کی"۔ ع۱۵

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے :

"جب امانت ضائع کی جانے لگے تو ساعت (قیامت) کا انتظار کرو۔ کہا گیا یا رسول اللہؐ امانت ضائع کرنا کسے کہتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا جب امر و حکومت اور سرداری، نااہلوں کو سپرد کی جائے۔ تو تم ساعت (قیامت) کا انتظار کرو"۔ (بخاری۔ روایت ابو ہریرہؓ)

امانت کا یہ تصور انسانی حقوق کی حفاظت اور ان کے احترام کا ایک اہم ذریعہ اور غصب حقوق کی راہ میں بہت بڑا مانع (Deterent) ہے۔

۳۔ فرض کی اولیت

اسلام نے اپنے نظامِ فکر و عمل میں حقوق کے حصول کی بجائے فرائض کی ادائیگی پر زیادہ زور دیا ہے۔ حق کا مسئلہ فی الحقیقت فرض کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر فرض ٹھیک ٹھیک ادا ہوتا رہے تو حق کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جوں ہی فرض کی ادائیگی معطل ہوتی ہے حق کا سوال اُبھر آتا ہے۔ جس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے اس کی حیثیت دینے والے (GIVER) کی ہے اور جس کا حق بنتا ہے اس کی حیثیت وصول کنندہ (Recipient) کی ہے۔ اب اگر فرض باقاعدگی سے ادا ہو رہا ہو تو وصول کنندہ کو دعویٰ حق (Claim) کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

مغرب کے سیکولر سیاسی نظام میں چونکہ ریاست خود مقتدرِ اعلیٰ ہے اس لیے اسے مختارِ کُل کی حیثیت حاصل ہے۔ سارے کے سارے اختیارات اس سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ یہ کہیں کمیونسٹ ریاستوں کی صورت میں ایک مرکز پر جمع ہیں، اور کہیں نظریہ تقسیمِ اختیارات (Division of Powers) کے تحت امریکہ جیسے ملکوں میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں تقسیم ہو گئے ہیں لیکن آخری اختیار (Final Authority) بہرحال ریاست ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شہریوں کی حیثیت مدافعانہ ہو گئی ہے۔ ان کے تحفظ کی فکر نے وہاں حقوق کو غیر معمولی اہمیت دے دی ہے۔ اور فرض پر اس لیے زور نہیں دیا گیا کہ اسے ادا کون کرائے گا؟ کون

سی بالاتر قوت ہے جو ریاست کو ادائیگیٔ فرض پر مجبور کر سکے؟ ریاست اگر کوئی حق غصب کر لے تو متاثرہ فرد ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اسے زیادہ سے زیادہ عدلیہ کے ذریعہ بحال کرا لے گا۔ لیکن ضروری نہیں کہ عدلیہ اسے ہمیشہ بحالیٔ حق میں یہ مدد دے سکے۔ ریاست اپنے اس ادارے کے اختیارات محدود کر کے فرد کو اس کی پشت پناہی سے محروم کر سکتی ہے اور پھر وہی حق دوبارہ غصب کر کے فرد کو اس سے بآسانی محروم کر سکتی ہے۔

اسلام میں چونکہ حقوق دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں، ریاست، عدلیہ کے اختیارات کم یا محدود کرنے کی قوت سے محروم ہے اور اپنے تمام اختیارات مقتدرِ اعلیٰ کے احکام اور اس کی مقرر کردہ حدود کے مطابق استعمال کرنے کی پابند ہے۔ اس لیے یہاں سارا زور فرض کی ادائیگی پر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے بنی نوعِ انسان کو، مختلف اُمتوں کو، انبیاء کرامؑ کو، افراد کو، کفار اور مشرکین کو اور اہلِ ایمان کو جہاں جہاں خطاب کیا، انہیں ان کا فرض یاد دلایا ہے۔ اور فرض کی ادائیگی پر ہی دنیا و آخرت میں سرخروئی اور سربلندی کا وعدہ کیا ہے۔ پورا قرآن اپنی اوّلین آیت سے لے کر آخری آیت تک کہیں بھی مستحقین سے خطاب کر کے انہیں یہ مشورہ اور ترغیب نہیں دیتا کہ اُٹھو متحد ہو جاؤ، جتھہ بندی کرو، تنظیم سازی کرو اور بزور اپنا حق حاصل کر لو۔ اس ترغیب کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والوں کو زمامِ اقتدار سے ہٹا دینے، ان پر تباہی و ہلاکت کا عذاب نازل کرنے، انہیں اس دنیا میں ذلیل و خوار کرنے، ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دینے اور آخرت میں انہیں جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کے الاؤ میں پھینک دینے کا کام مقتدرِ اعلیٰ نے خود اپنے ذمے لکھا ہے۔ پھر اس ترغیب کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ خدا کی نیابتی حکومت دراصل حقداروں ہی کی سرپرست حکومت ہے۔ اس کا اصل کام ہی یہ ہے کہ اقتدار کی قوت فرض کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے کام میں لائے اور حقداروں کو ان کا حق پہنچائے۔ حضرت ابوبکرؓ کا مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف اعلانِ جنگ اسلامی ریاست کے اسی مزاج و کردار کا آئینہ دار ہے۔ ان پر مستحقینِ زکوٰۃ نے نہ تو کوئی دباؤ ڈالا تھا کہ ہمارا

حق دلواتے اور نہ اس سلسلہ میں کوئی انفرادی یا اجتماعی شکایت ان کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے مامور ہی اس کام پر تھے کہ جس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے اسے ادائیگی فرض پر مجبور کریں اور جس کا کوئی حق اللہ نے مقرر کر دیا ہے وہ اس تک پہنچائیں۔

آج بھی زکوٰۃ کے آٹھوں مستحقین میں سے کسی کو یہ قانونی حق حاصل نہیں کہ وہ عدلیہ میں کسی صاحب نصاب پر دعویٰ دائر کر کے اس کے مال میں سے اپنا حصہ وصول کر لے۔ مستحقین اپنا دعویٰ صرف حکومت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیت المال کی مد زکوٰۃ سے ان کا حق ادا کرے یا مالدار لوگوں سے رقم زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین کو پہنچاتے۔ گویا حکومت حقداروں کی قانونی کفیل و سرپرست اور ان کی وکیل و ایجنٹ ہے۔ وہی حقداروں کی طرف سے اصل مدعی ہے۔ اور اس کی ساری قوتیں فرض کی ادائیگی یا حق کی وصولیابی کا ذریعہ ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ فرائض حکومت کی تشریح کرتے ہوتے فرماتے ہیں :

"ولایات و امارات کا اصل مقصود مخلوق خدا کی خدمت و اصلاح ہے۔ اور جب دین کو لوگ چھوڑ دیں گے تو سخت ترین گھاٹا اٹھائیں گے۔ اور جو دنیوی نعمتیں ان کو دی گئی ہیں وہ قطعاً مفید و نفع بخش ثابت نہ ہوں گی۔ اور دنیا سے ان کو جو دینی اصلاح حاصل ہوتی ہے وہ دو قسم کی ہے۔ ایک یہ کہ مال کو مستحق لوگوں میں تقسیم کیا جائے، دوسری یہ کہ زیادتی کرنے اور ناحق لینے والوں کو عقوبت و سزا دی جائے۔" ۱۶

اندازہ کیجئے جس معاشرے میں عبادات، وعظ و تلقین، تعلیم و تربیت، ذرائع نشر و اشاعت اور حکومت کی مختلف ایجنسیوں، اداروں اور اس کے مجموعی اختیارات و وسائل کی ساری قوتیں مل کر فرض کی ادائیگی پر داخلی اور خارجی دباؤ ڈال رہی ہوں وہاں انسان کے بنیادی حقوق کا مسئلہ کس حد تک ابھر سکے گا؟

۴۔ نصب العین کی ہم آہنگی۔

قرآن میں اسلامی ریاست کا مقصد وجود یہ بتایا گیا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ
وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج۔ ۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔"

اور عین یہی مقصدِ وجود اُمتِ مسلمہ کا بھی ہے۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ
عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (اٰلِ عمران۔ ۱۱۰)

"تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔"

گویا مُسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور انکی حکومت و ریاست کا مقصد ایک ہے۔ نیکی پر خود چلنا، دوسروں کو چلانا اور بدی سے خود رکنا اور دوسروں کو روکنا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں مقصد کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ ایک عام مسلمان ہو یا ان کا حکمران، سب ایک ہی راہ کے راہی اور ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ سب کی سمتِ سفر ایک ہے۔ سب اپنی اپنی حیثیت اور اپنے اپنے وسائل و اختیارات کے مطابق ایک ہی کام کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ کسی کو اقتدار کی قوتیں ملی ہیں تو وہ انہیں اسی نصبُ العین کے حصول میں کھپا رہا ہے۔ اور کسی کو جان و تن کے سوا کچھ میسر نہیں آیا تو وہ اسی متاع کو لیے ہوئے اپنے مقصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہے۔

جہاں مقصد کی یہ ہم آہنگی موجود ہو وہاں فرد اور ریاست میں ٹکراؤ کس بات پر ہوگا؟ اسلام میں امیرِ ریاست کی حیثیت حاکم کی نہیں نگران اور سرپرست کی ہے۔ اور امیر و رعایا کا رشتہ حاکم و محکوم کا نہیں معاونین کا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس

کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔" (التوبہ - ۷۱)

اب اگر کسی حکمران کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار نے نزاع و تصادم کی کوئی صورت پیدا کی بھی تو شہریوں کے لیے خود مقتدرِ اعلیٰ کا یہ حکم موجود ہے۔

"نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔" (المایدہ - ۲)

امیر، گناہ اور زیادتی کی طرف قدم بڑھاتے ہی امت کو عدمِ تعاون (-Non-Co operation) کا جواز مہیا کر دے گا۔ اور حقِ اطاعت کھو بیٹھے گا۔

نصب العین کی یہ ہم آہنگی تصورِ حاکمیت کو تصورِ اخوت میں بدل دیتی ہے۔ اور اس سے انحراف کی یہ سزا کہ امیر، حقِ اطاعت ہی کھو بیٹھے، بنیادی حقوق کے تحفظ کا ایک بہت موثر ذریعہ بن جاتی ہے۔

۵۔ فرد کا احترام

انسان کے بنیادی حقوق کا مسئلہ درحقیقت احترامِ آدمیت کا مسئلہ ہے۔ مسندِ اقتدار پر بیٹھنے والے اکثر ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے اختیارات و وسائل کی کرشمہ سازیوں کے مظاہر دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ کوئی مافوق البشر ہستی ہیں۔ اور کچھ ایسی اعلیٰ صفات کے حامل ہیں جن کی بناء پر وہ حاکمیت و فرماں روائی کے مستحق بن گئے ہیں۔ اور باقی لوگوں کا کام بس ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے۔ اس طرزِ فکر نے باقاعدہ نظریوں اور فلسفوں کی صورت اختیار کی ہے۔ اسی فکر نے انسانی ریاست کے آغاز کے لیے نظریۂ تخلیق ربانی (Theory of Devine origin) گھڑا، اسی سے بادشاہوں کے اختیارات کے لیے "حقوقِ ربانی" (Divine Rights of Kings) کی اصطلاح وضع ہوئی۔ اسی گمراہ کن فکر نے بادشاہوں کے لیے "عالم پناہ" اور "ظلّ اللہ" جیسے خطابات ایجاد کر لئے۔ اور انہیں خدا کا فرستادہ بنا کر عام انسانوں کی ذلت و رسوائی کا سامان کیا۔ یہی حقوقِ ربانی اور ظلِّ الٰہی انسان

کے لیے وجہ مصیبت بنی اور اس مصیبت سے بچنے کے لیے اسے بنیادی حقوق کی تحریک چلانا پڑی۔

اسلام نے احترامِ آدمیت پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اور خدا کے بعد اسے اس کائنات کی سب سے محترم اور مکرم ہستی قرار دیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے واقعہ میں بتایا گیا کہ خدا نے اس خاک کے پتلے میں اپنی روح پھونکی اور اُسے مسجودِ ملائک بنایا۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (الحجر۔ ۲۹)

"جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا" اس آیت سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ انسان "کُن" کے امرِ ربی سے وجود میں آنے والی کائنات کے تخلیقی عمل سے بالکل جدا، قادرِ مطلق کی ایک علیحدہ اور خصوصی تخلیق ہے۔ اسے تمام دیگر مخلوقات کے مقابلے میں بہترین نقشہ پر بنایا گیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین۔ ۴)

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا"

یہی نہیں بلکہ اسے بزرگی اور فضیلت عطا کی گئی اور کائنات کی ساری نعمتیں اور قوتیں مسخر کر کے اس کی خدمت پر لگا دی گئیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل۔ ۷۰)

"ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی"

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (لقمان۔ ۲۰)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں!"

یہ شرف و فضیلت اور عظمت، انسان کو محض انسان ہونے کی بناء پر حاصل ہے۔ اس میں کالے اور گورے، عربی اور عجمی، شرقی اور غربی اور اونچے نیچے کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ

سب نفسِ واحدہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ نبیؐ اکرم نے انسان کی اسی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوتے ایک بار طواف کے دوران خانہ کعبہ کو مخاطب کرکے فرمایا :

"کتنا پاکیزہ ہے تُو، اور کیسی خوشگوار ہے تیری فضا، کتنا عظیم ہے تُو اور کتنا محترم ہے تیرا مقام، مگر اُس خدا کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے ایک مُسلمان کے جان و مال اور خون کا احترام اللہ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے۔"

(ابن ماجہ۔ حدیث نمبر ۳۹۳۲)

یہ تو انسان کی حیثیت کا ایک پہلو تھا۔ اب دیکھئے کہ قرآن نے انسان کے اندر غرور و تکبر کا زور توڑنے اور بالخصوص اختیارات و وسائل کے حامل افراد کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے انہیں اپنی اصل حقیقت کس انداز میں سمجھائی ہے :

" انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے ؟ ایک اُچھلتے ہوتے پانی سے جو پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے کھینچ کر آتا ہے۔" (الطارق ۵ تا ۷)

" ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔" (الحج۔ ۵)

" اے انسان ! کس چیز نے تجھے اپنے ربِ کریم سے مغرور کر دیا ؟ اُس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا تیرے اعضاء درست کیے، تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترتیب دیا۔" (الانفطار۔ ۶ تا ۸)

انسان کی اس حقیقت کو آشکار کرنے کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتایا گیا کہ :

" ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔" (العنکبوت۔ ۵۷)

" رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی۔ خواہ تم کیسی ہی مضبوط

عمارتوں میں رہو" (النساء۔۷۸)

یعنی اپنی تمام تر عظمت و فضیلت کے باوجود اس انسان کو نہ اپنی زندگی پر اختیار ہے نہ موت پر۔ پھر غرور و تکبر کیسا؟

قرآن کریم اور احادیث نبویؐ میں بکثرت آیات و ارشادات کے ذریعہ انسان کے ذہن میں یہ دونوں حقیقتیں اس حکمت کے ساتھ بٹھائی گئی ہیں کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے احترام پر مائل ہو، ان کے حقوق بخوشی ادا کرے، ظلم و زیادتی سے اجتناب کرے اور خود اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

یہ وہ بنیادی تصورات تھے جو اسلام نے تطہیر تصورِ حکومت کے لیے انسان کے ذہن نشین کرائے اور ان کے ذریعہ اسے کسی کو اپنا غلام بنانے کی رغبت یا کسی کا غلام بننے پر آمادگی کے مریضانہ رجحانات سے نجات دلا کر خدا کی عالمگیر حاکمیت کے سایۂ رحمت میں مساوات و اخوت کے رشتوں کے ساتھ آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کی راہ دکھائی۔ اب تشکیلِ حکومت کے عملی مسئلہ سے متعلق اسلام کی ہدایات و تدابیر کا جائزہ لیجئے۔

(ب) تطہیرِ قیادت

اسلامی ریاست میں آمریت و فسطائیت کے مکمل سدِ باب کے لیے مسلمانوں کو تشکیلِ حکومت کے اولین مرحلے میں حد درجہ محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور انتخابِ امیر کے سلسلہ میں دو بنیادی ضابطے مقرر کر کے غلط آدمی کے منصبِ امارت تک پہنچنے کی راہ روک دی گئی۔ ان میں سے پہلا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص عہدہ کا امیدوار و طلب گار ہو وہ اپنی تمام تر اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود اس کے لیے نااہل ہے۔ کیونکہ خواہشِ اقتدار اس کے فتورِ نیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا (القصص ۸۳)

وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب ہو یا حریص ہو۔" (بخاری مسلم)

"تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے۔" (ابوداؤد)

آپ نے ایک بار امارت کے بارے میں ایک استفسار پر حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا:

"اے ابوبکرؓ! وہ اُس کے لیے ہے جو اس سے بے رغبت ہو، نہ کہ اُس کے لیے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو۔ وہ اُس کے لیے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے، نہ کہ اُس کے لیے جو اس پر جھپٹے۔ وہ اُس کے لیے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے۔ نہ کہ اُس کے لیے جو خود کہے کہ یہ میرا حق ہے۔" ۱۷؎

اس ضابطۂ نااہلی کے بعد دوسرا ضابطہ یہ مقرر کیا گیا کہ اپنے میں سے بہترین کا انتخاب کرو اور اس "بہترین" کے معیار کی بھی واضح تشریح کر دی گئی، تاکہ اس میں ذاتی پسند و ناپسند قرابت داری علاقائی، گروہی، لسانی اور نسلی تعصبات یا منتخب کیے جانے والے کے ظاہری اوصافِ شخصیت مثلاً اس کے چہرے کے حُسن وجمال، لباس کی وضع قطع، بالوں کی تراش خراش، تقریر و تحریر کی سحرانگیزی یا اسی طرح کی دوسری صفات کی بجائے اس کے کردار کی جانچ پرکھ کی جائے۔ یہی وہ معیارِ انتخاب ہے جسے پیشِ نظر رکھ کر حضورِ اکرمؐ نے فرمایا:

"سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمہارے اوپر ایک چھوٹے سر والے حبشی غلام کو امیر مقرر کر دیا جائے۔ جب تک وہ تمہارے اندر اللہ کی کتاب قائم کرے۔" (بخاری روایت حضرت انسؓ)

یہی معیار اپنے جانشین کی تلاش کے وقت حضرت عمرؓ کے سامنے تھا۔ انھوں نے منصب

خلافت کا مسئلہ شوریٰ میں پیش کرتے ہوتے فرمایا :

"اگر ابو حذیفہؓ کے غلام سالمؓ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلافت کے لیے نامزد کر دیتا۔ اگر پروردگار، سالمؓ کے بارے میں سوال کرتا تو میں کہہ دیتا میں نے آپ کے رسولؐ سے سنا تھا کہ سالمؓ اللہ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔" ۱۸

اس موقع پر جب حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے تجویز پیش کی کہ عبداللہؓ بن عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیجئے تو آپ نے ڈانٹ کر کہا :

"تجھے خدا سمجھے! واللہ میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا، ہمیں تمہارے معاملات سے دلچسپی نہیں ہے۔ نہ میں نے حکومت کو کوئی قابلِ تعریف چیز پایا کہ اپنے گھر والوں کے لیے رغبت کروں۔ اگر یہ حکومت بہتر تھی تو ہمیں مل گئی۔ اور اگر بری تھی تو آلِ عمر کے لیے بھی کافی ہے کہ ان میں کے ایک فرد سے امتِ محمدیہ کے بارے میں حساب کتاب اور پوچھ گچھ کی جائے گی۔ میں نے اپنی ذات کو بڑی تکلیف پہنچائی۔ اور اپنے گھر والوں کو بالکل محروم رکھا۔ اگر اس پر بھی میں بغیر کسی ثواب و عذاب کے چھوٹ جاؤں تو بڑا سعید ہوں گا۔" ۱۹

حضورؐ کی حدیث اور حضرت عمرؓ کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ امت کے لیے بہترین امیر وہ ہے جو اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے احکام کو نافذ کرنے کی علمی، ذہنی اور انتظامی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کا کردار اللہ سے محبت کا آئینہ دار ہو۔ جس کی سیرت میں خدا اور اس کے رسولؐ کی مطلوبہ صفات بدرجہ اتم موجود ہوں۔

اولی الامر کے انتخاب میں اسلام نے مسلمان، مرد، عاقل اور بالغ کی عام شرائط کے ساتھ جن خصوصیات (Qualifications) کو لازمی قرار دیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں :

(۱) تقویٰ ـــــ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات۔۱۳)

"تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہیں۔"

اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ (ص۔ ۲۸)

کیا ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح کر دیں؟

(۲) اہلیت ــــــ جس منصب کے لیے کسی کا انتخاب کیا جا رہا ہو وہ اسے سنبھالنے کی پوری اہلیت رکھتا ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (النساء۔ ۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہلِ امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔"

اس سلسلہ میں وہ احادیث نظر سے گزر چکی ہیں جن میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ امانت نااہلوں کے سپرد نہ کرو۔ اور یہ کہ بہتر اور اصلح المسلمین کی موجودگی میں کمتر و نااہل کو والی یا حاکم بنانا اللہ اور اس کے رسولؐ سے خیانت کرنا ہے۔

(۳) عدل ــــــ اس اہلیت میں اولین مطلوبہ صفت عدل ہے۔ سورہ النساء کی مندرجہ بالا آیت کا اگلا حصہ اسی عدل سے متعلق ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء۔ ۵۸)

"اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص۔ ۲۶)

"اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر۔ اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر۔ کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔"

حضورؐ کا ارشاد ہے:

"قیامت کے دن لوگوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور ان سب

سے زیادہ قریب میرے پاس بیٹھنے والا شخص امام عادل ہوگا۔ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے سخت عذاب میں مبتلا کیے جانے والا شخص امام ظالم ہوگا۔" ع۲۰

حضرت عمرؓ اپنے عاملوں کو رخصت کرتے وقت انہیں یہ ہدایت کیا کرتے :

"میں نہیں جابر و قاہر بنا کر نہیں بلکہ امام اور رہنما بنا کر بھیجتا ہوں مسلمانوں کو مار پیٹ کر انہیں ذلیل نہ کرنا، نہ ان کی تعریف کرکے انہیں آزمائش میں ڈالنا۔ ان کے حقوق چھین کر ان پر ظلم نہ کرنا۔ اور مسلمانوں کی سہولت اور خوشحالی کے لیے ہر طرح کا اہتمام کرتے رہنا" ع۲۱

(۴) حکمت و تدبر ــــ اولی الامر ایسے لوگ ہوں جو حکمت و تدبر اور علم و فہم کی صلاحیتوں سے متصف ہوں۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر۔ ۹)

"کہو کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں" ؟

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء۔ ۵)

"اپنے اموال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے ذریعہ قیام بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو"۔

مسلمانوں کے اولی الامر کو بحیثیت مجموعی کیا ہونا چاہیے یہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے سنیئے۔ حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرتے ہوتے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نصیحت فرمائی :

"عمرؓ! پہلی چیز جس کی طرف سے میں تمہیں ہوشیار رہنے کی نصیحت کرتا ہوں وہ خود تمہارا نفس ہے۔ ہر نفس کی کچھ خواہش ہوتی ہے اور جب تم اس کی یہ خواہش پوری کر دو گے تو نفس آگے بڑھ کر دوسری خواہش کے لیے مچلنے لگے گا۔ اور دیکھو! اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اُس گروہ سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ پھول گئے ہیں، نگاہوں میں ہوس بس گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک

کو صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے، اُن میں سے کسی ایک کے پاؤں پھسلیں گے تو ان سب کو حیرانی ہوگی۔ خبردار! یہ ایک تم نہ ہونا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے یہ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے، جب تک تمہاری روش درست رہے گی یہ لوگ بھی تمہارے لیے سیدھے رہیں گے۔ یہ ہے میری وصیت اور میں تم پر سلام بھیجتا ہوں۔“ ۲۲

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کے لیے جو طویل وصیت تحریر کرائی اس میں حسب ذیل ہدایات درج ہیں:

(۱) تقویٰ (۲) نیکوں پر التفات، بُرے سے درگزر (۳) ذمیوں کے صرف زائد از ضرورت مال پر ٹیکس اور اُن سے حُسنِ سلوک (۴) بدّوؤں کے امیروں کے مال سے رقم وصول کر کے ان کے غریبوں کو دینا (۵) رعایا کے ساتھ عدل اور ان کی ضروریات کی کفالت (۶) سرحدوں کا دفاع (۷) امیروں کو غریبوں پر ترجیح نہ دینا (۸) اوامر و حدودِ الٰہی کے نفاذ میں سختی۔ حکمِ الٰہی کی بے عزتی کرنے والے کی بے عزتی (۹) لوگوں کو اپنے برابر درجہ دینا (۱۰) حق وصول کرنے میں کسی کی شخصیت اور ملامت کی پروا نہ کرنا (۱۱) مالِ غنیمت میں سب کو یکساں دینا اور خود کو محروم رکھنا (۱۲) اہلِ ذمہ پر نہ خود ظلم کرنا اور نہ کسی کو اسکی اجازت دینا (۱۳) آخرت کی طلب اور دنیا سے بے رغبتی (۱۴) نفس کے غلبہ سے محفوظ رہنا (۱۵) حق کی خاطر ہر طوفان سے ٹکرا جانا (۱۶) امتِ مسلمہ پر رحم کرنا (۱۷) بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں کی عزت، عالموں کا احترام کرنا۔ (۱۸) کسی کو مارنا اور نہ ذلیل کرنا (۱۹) مسلمانوں کو عطیات سے محروم نہ کرنا (۲۰) فوج کو سرحدوں پر نہ ڈالے رکھنا مبادا نسل ہی منقطع ہو جائے۔ (۲۱) مال کو امیر طبقے میں محصور نہ رہنے دینا۔ (۲۲) اپنا دروازہ غریبوں پر بند نہ کرنا۔ مبادا، قوی ضعیف کو کھا جاتے۔“ ۲۳

حضرت عمرؓ نے منصبِ خلافت سنبھالا تو حضرت علیؓ نے انہیں یہ مشورہ دیا:

”اگر تم اپنے رفیق (حضرت ابوبکرؓ) تک پہنچنا چاہتے ہو تو اپنی قمیص میں پیوند لگایا کرو،

تہبند اونچا رکھو، اپنی جوتی خود گانٹھ لیا کرو، موزے میں جوڑ لگا لیا کرو۔ امیدیں کم کرو اور کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا کرو۔" ۲۴؎

اور حضرت عمرؓ اپنے پورے عہدِ خلافت میں اس مشورے پر عمل کرتے رہے۔

یہ ہے اسلام میں اولی الامر کا معیارِ انتخاب اور ان کے ضروری اوصاف۔ اگر امت اس معیار کے مطابق اپنے امراء کا انتخاب کرے اور وہ بھی اس معیار پر پورے اتریں تو فرد اور ریاست کے درمیان تصادم کی بجائے باہمی خیر خواہی اور تعاون کی فضا پیدا ہوگی۔ اور بنیادی حقوق کے تحفظ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔

(ج) تحدیدِ اختیارات

اولی الامر کے انتخاب کی کڑی شرطیں عائد کرنے کے بعد اسلام نے اسے منصبِ امارت پر فائز ہوتے ہی تحدیدِ اختیارات کی ایسی بندشوں میں جکڑ دیا ہے کہ وہ نہ حاکمانہ انداز و اطوار اختیار کر سکتا ہے اور نہ شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ جمانے کے اسباب و وسائل اسے میسر آسکتے ہیں۔ اس کے اختیارات کی حدود و قیود ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) نیابتی اقتدار

اسلامی ریاست کا سربراہ اپنے منصب کے لحاظ سے دوہری نیابت کے فرائض ادا کرتا ہے۔ وہ ایک طرف ریاست کے حقیقی مقتدرِ اعلیٰ کے احکام و ہدایات کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری کی بناء پر زمین پر اس کا نائب ہے۔ اور دوسری طرف وہ مقتدرِ اعلیٰ کے حقیقی نائبین یا خلفاء کا منتخب نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اُن کا بھی نائب ہے۔ خلافت چونکہ فرداً فرداً ہر مسلمان کو دی گئی ہے اور وہ اسے اپنی مرضی کے آزادانہ اظہار کے ذریعہ ایک فرد کو منتقل کر کے اسے اپنی جانب سے فرضِ کفایہ کا ذمہ دار بنا دیتے ہیں، اس لیے وہ ان سب کا نائب ہے۔ اس دوہری نیابت کے معنی یہ ہیں کہ سربراہِ حکومت ایک طرف خدا کے سامنے اور دوسری طرف خدا کے بندوں کے سامنے

جوابدہ ہے۔ اس کی یہ حیثیت اس کے اپنے ارادہ و اختیار کا دائرہ بہت محدود کر دیتی ہے۔ یہ پہلی اور سب سے بڑی پابندی ہے جو اولی الامر کے اختیارات پر اسلام نے عائد کی ہے۔

(۲) دائمی دستور

اسلامی ریاست میں بنیادی حقوق کا سب سے بڑا محافظ وہ دائمی دستور و قانون ہے جو قرآن و سنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اور جس نے حقوق و فرائض کا ایک ناقابلِ ترمیم و تنسیخ ضابطہ مقرر کر دیا ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ نے اولی الامر کے اختیاراتِ قانون سازی پر پابندی اور عام لوگوں کے لیے شرطِ اطاعت کا تعین کرتے ہوئے حکم دیا ہے:

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف۔۳)

"جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (خود ساختہ) کی پیروی نہ کرو۔"

جو لوگ اس حکم سے سرمو تجاوز کریں گے ان کے بارے میں یہ واضح فیصلہ بھی کر دیا گیا،

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (المائدہ ۴۴، ۴۵، ۴۷)

"اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں۔"

یہ قانون جس کی پیروی کا حکم دیا جا رہا ہے، چونکہ حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا بلکہ ہر حکمران کو ایک مقدس امانت کے طور پر منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کے عطا کردہ حقوق کبھی محدود، معطل یا منسوخ نہیں ہوتے۔ یہ اٹل ہیں اور حکومت کی مداخلت سے قطعی محفوظ۔

(۳) دائمی نمونۂ حاکمیت

یہ دستور محض الفاظ کی تحریری صورت اور ان کے مجموعہ پر مشتمل کتاب ہی کی شکل میں محفوظ نہیں ہے بلکہ اپنی تعبیر و تشریح اور عملی نفاذ میں رہنمائی کے لیے ایک مستقل نمونۂ تقلید بھی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ذاتِ نبویؐ میں مجسم ہو کر اپنی منشاء کا ایک ایسا ٹھوس اور واضح اظہار کر دیتا ہے کہ کسی

کو الفاظ سے کھیلنے، اپنی خواہش نفس کے مطابق انہیں معنی پہنانے اور تاویل و تحریف کے ذریعہ نت نئے راستے نکال لینے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ وہی مقتدرِ اعلیٰ جو اپنے حکم کے سوا کسی اور کی پیروی نہ کرنے کی سخت تاکید کرتا ہے اپنے رسولؐ کے بارے میں یہ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النسآء۔۶۴)

"اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے"

اور یہ اطاعت بھی کسی احساس جبر و اکراہ کے ساتھ نہ ہو بلکہ پوری ذہنی آمادگی اور قلبی لگاؤ کے ساتھ ہو

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النسآء ۶۵)

"پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے اختلافات میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ تُو کرے اُس پر اپنے دل میں کوئی بھی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کریں۔"

اس حکم کی روشنی میں اسلامی ریاست کے ایک عام شہری سے لے کر سربراہِ حکومت تک سب کے لیے قیادت و رہنمائی اور ہدایت و حکمرانی کا اصل سرچشمہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس ہوگی۔ زندگی کے ہر معاملہ میں اُن کا طرزِ عمل قرآن کی اس ہدایت کا مظہر ہوگا۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر۔۷)

"جو کچھ رسولؐ تمہیں دے اسے لے لو۔ اور جس چیز سے روک دے اس سے رُک جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔۲۱)

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔"

رسولؐ کے عملی نمونہ حاکمیت کے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی بھی اسلامی ریاست، خواہ وہ کسی

بھی خطے میں موجود ہو، اس امر سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی کہ کسی معاملہ میں خدا کے رسولؐ کا قول یا ان کا عمل کیا تھا۔ اور قرآن کے کسی حکم کے بارے میں آپؐ نے کیا تشریح و تعبیر فرمائی تھی۔ یہ دائمی نمونۂ حاکمیت اسلامی ریاست کے ہر سربراہ کو حضورؐ اکرم کی پیروی کا پابند کر دیتا ہے۔ اور یہ پابندی حدود و اختیارات سے تجاوز کا راستہ روک کر ظلم و زیادتی کے ہر امکان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

۴۔ عدلیہ کی بالادستی

قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی دائمی حیثیت کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں عدلیہ کو انتظامیہ اور مقننہ دونوں پر بالادستی حاصل ہے۔ انتظامیہ قرآن و سنت کے منافی کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ اور مقننہ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی جو قرآن و سنت کے مطابق نہ ہو۔ عدلیہ ایک شہری کے حقوق کی محافظ ہے۔ وہ ان حقوق سے متصادم قوانین کو کالعدم قرار دے کر انہیں نافذ ہونے سے روک سکتی ہے۔ اور انتظامیہ کے جاری کردہ احکامات کو غیر مؤثر قرار دے کر شہریوں کا مضبوط دفاع کر سکتی ہے۔

۵۔ حدودِ اطاعت

اسلام میں اطاعت امر مشروط ہے اور اس سلسلہ میں خود مقتدرِ اعلیٰ نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر دیا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء۔ ۵۹)

"اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع ہو تو اس کو اللہ کی طرف پھیر دو۔" اس آیت سے اسلامی ریاست میں اطاعت کی جو شرائط و حدود متعین ہوتی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اصل اطاعت، اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہ اس کے رسولؐ سمیت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔

(۲) دوسری اطاعت، رسولؐ کی ہے اور درحقیقت یہ کوئی علیحدہ اطاعت نہیں ہے بلکہ

اطاعتِ خدا ہی کی واحد عملی صورت ہے۔ ہمارے لیے خدا کی اطاعت کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم رسولؐ کی اطاعت کریں۔ اسی لیے ایک دوسری جگہ فرمایا گیا :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۔ ۸۰)

"اور جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔"

پہلی اطاعت کی طرح یہ دوسری اطاعت بھی تمام مسلمانوں پر جن میں ان کے شہری اور حکمران سب شامل ہیں فرض ہے۔

(۳) تیسری اطاعت، صاحبِ امر کی ہے، مگر یہ پہلی دو اطاعتوں کی طرح غیر مشروط نہیں، بلکہ اس بنیادی شرط کے ساتھ ہے کہ خود صاحبِ امر بھی دو اطاعتوں میں ان کے ساتھ یکساں طور پر شریک ہو۔

(۴) صاحبِ امر اور عام مسلمانوں کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو فیصلہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت پر ہوگا۔

اسلامی ریاست کے دستور کی اس بنیادی دفعہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ واضح ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ کسی بندہ نفس، مفسد، ظالم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے منافی عمل کرنے والے کی ہرگز اطاعت نہ کریں۔ قرآن مجید کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کرلی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔" (الکہف۔ ۲۸)

"ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔" (الشعراء ۱۵۱، ۱۵۲)

"اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو۔" (الدھر۔ ۲۴)

"اور ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے۔ طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔ بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی

میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بد اعمال ہے، جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے اس بناء پر کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں" (القلم ۱۰۔۱۵)

اس سلسلہ میں احادیث نبوی نے اصول اطاعت کو مزید شرح و بسط سے بیان کر کے اس کے تمام پہلوؤں کو اتنا واضح کر دیا ہے کہ کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"مسلمان پر سمع وطاعت لازم ہے۔ خواہ اُسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سمع ہے نہ طاعت"۔ (بخاری و مسلم)

گویا امیر جوں ہی پہلی دو اطاعتوں سے آزاد ہو کر اپنی من مانی کرے گا۔ اس کا حق اطاعت وہیں ساقط ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں پر اب اطاعت کی بجائے یہ فرض عائد ہوگا کہ وہ اس کی اطاعت سے علی الاعلان انکار کر دیں۔ حضورؐ کا واضح فرمان ہے:

"معصیت میں کوئی اطاعت نہیں، اطاعت تو صرف معروف میں ہے"۔ (بخاری و مسلم)

"اُس شخص کے لیے کوئی اطاعت نہیں جو اللہ کا نافرمان ہو" (مسلم، ابوداؤد، نسائی)۔

"خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں"۔ (بخاری و مسلم)

حق اطاعت ساقط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امیر اب صاحب امر نہیں رہا، اس کے اختیارات سلب ہو گئے۔ اس کے کسی حکم کی اب کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی۔ اور مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اسے معزول کر کے کسی دوسرے امیر کا انتخاب کریں۔ اگر وہ سرکشی اور عدم اطاعت میں اتنا آگے نکل جائے کہ نماز تک ترک کر بیٹھے تو پھر اُس کے خلاف تلوار اٹھا لینے کی بھی اجازت ہے۔

"تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا

وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو اُن پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہو گا۔ صحابہؓ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دَور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا۔ نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں" (مسلم)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالا تو اپنے خطبہ میں انہی حدودِ اطاعت کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرمایا:

"میری اطاعت کرو جب تک مَیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں لیکن مجھ سے اگر کوئی ایسا کام سرزد ہو جس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔" ۲۵

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

"حاکم کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں جو اللہ نے ان پر عائد کیے ہیں۔ ہم تو تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ حکم الٰہی قریب اور دُور ہر جگہ قائم کیا جائے۔ ۲۶

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں عراق کی فتح کے بعد اکثر لوگوں نے قرآن میں اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کی اجازت کے تحت عیسائی عورتوں سے شادی کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے حذیفہؓ بن الیمان کو لکھا کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں انہوں نے جواب میں لکھا کہ یہ حکم آپ کی ذاتی رائے ہے یا کوئی شرعی حکم ہے؟ حضرت عمرؓ نے لکھا میری ذاتی رائے ہے۔ حذیفہؓ نے لکھ بھیجا کہ آپ کی ذاتی رائے کی پابندی، ہم لوگوں پر ضروری نہیں۔" ۲۷

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:

"مَیں اللہ کی فرماں برداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت تم پر

فرض ہے۔ خواہ وہ حکم تمہیں پسند ہو یا ناپسند۔ اور جو حکم ہیں تمہیں اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دول تو معصیت ہیں کسی کیلئے اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف معروف میں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے"۔ ؏۴۷

اولی الامر کی اس مشروط اطاعت نے حکمرانوں کے لیے اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی کہ وہ خدا اور رسولؐ کے مقرر کردہ حقوق پر دست درازی کر سکیں۔ وہ اسی وقت تک واجب الاطاعت ہیں جب تک ان حقوق کا احترام کریں اور ان کے منافی کوئی اقدام نہ کریں۔ اگر وہ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو قوم ان کی اطاعت سے بری الذمہ ہے۔ اور وہ جواباً انہیں منصب امارت سے ہٹانے کی جدوجہد میں حق بجانب ہوگی۔ یہ حدود و شرائط اطاعت حکمرانوں کے مقابلے میں شہریوں کو اپنے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ایک نہایت مستحکم ضمانت مہیا کرتی ہیں۔

۶۔ پابندیٔ مشاورت

اولی الامر پر ایک اور پابندی یہ ہے کہ وہ امت کے اہلُ الرائے سے مشورہ کیے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ وہ جس طرح مسلمانوں کے باہمی مشورے اور رضامندی سے منتخب ہوتا ہے اسی طرح قرآن مجید کے اس حکم کے تحت نظام حکومت بھی مشورے سے چلانے کا پابند ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشورٰی۔ ۳۸)

"اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں"۔

اس مشاورت سے اللہ کا رسولؐ بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ حضورؐ کو ہدایت کی جاتی ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران۔ ۱۵۹)

"اور اے نبیؐ! ان سے معاملات میں مشاورت کرو"۔

رسولؐ اللہ خود صاحب امر تھے۔ انہیں براہِ راست خدا کی رہنمائی حاصل تھی اس لیے وہ کسی سے مشورہ کرنے کے حاجت مند نہ تھے۔ لیکن انہیں چونکہ بعد کے صاحبانِ امر کے لیے نمونہ بننا تھا اس لیے ان سے مشاورت کی سنت قائم کرائی گئی۔ آپ اکثر صحابہ کرامؓ سے چھوٹے بڑے معاملات

میں مشورہ کیا کرتے۔ یہ سنت خود اللہ تعالیٰ کو اتنی محبوب تھی کہ وہ بعض معاملات میں آپ کو ہدایت دینے سے قبل اصحاب رسول اللہ کی رائے کا انتظار کرتا اور جب اُن میں سے کسی کی رائے پسند آجاتی تو نزول وحی کے ذریعہ اسے شرفِ سند و قبولیت عطا کر کے رائے دینے والے بندے کی حوصلہ افزائی فرماتا۔ چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں، منافق کی نمازِ جنازہ، پردہ، حرمتِ شراب، مقامِ ابراہیمؑ کو مصلی بنانے اور آرام واستراحت کے اوقات میں بلا اجازت گھروں میں داخلہ کی ممانعت سے متعلق حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آیات نازل ہوئیں۔ حضورؐ نے ایک بار حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اگر تم دونوں کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں اس میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا۔" (مسند احمد)

حضرت علیؓ سے منقول ہے:

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اُترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سُنی گئی ہو؟ فرمایا میری اُمت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو۔ اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔" ۲۹

اس مشورہ کی اہمیت اور اس کی اصل روح کے بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے۔

"جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ صحیح بات دوسری ہے۔ تو اس نے دراصل اس کے ساتھ خیانت کی۔" (ابوداؤد)

قرآن کے واضح حکم اور رسول اللہ کی سنت کے بعد اب مسلمانوں کا کوئی امیر مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ پابندیٔ مشاورت آمریت کی راہ روکتی اور سیاسی زندگی میں جمہوریت کی روح پھونکتی ہے۔ یہاں ایک اور بنیادی نکتہ ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ اسلام میں شوریٰ کا اصول کثرتِ رائے پر نہیں اصابتِ رائے پر ہے۔ یعنی جو رائے قرآن و سنت سے قریب تر ہو گی صرف

وہی قابلِ قبول ہوگی۔ اور پھر اس پر اجماع یا اکثریت کی منظوری کے بعد عمل کیا جائے گا۔ قرآن و سنت کی تائید کے بغیر اکثریت کی رائے کوئی وزن و اہمیت نہیں رکھتی۔

حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں اکابر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ اکثریت کی رائے جہاد کے حق میں نہ تھی۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا کیونکہ آپ کے فہمِ قرآن کے مطابق جہاد ہی کا فیصلہ درست تھا۔ بعد میں سب نے آپ کے فیصلے کو درست تسلیم کیا اور جہاد میں شرکت کی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دینے کے اکثریتی مطالبے سے اختلاف کیا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف جیسے جلیل القدر صحابہ کا اصرار تھا کہ زمین تقسیم کی جائے۔ اس مسئلہ پر مشورے کے لیے اجتماع ہوا اور بالآخر حضرت عمرؓ نے سورۃ الحشر سے اپنی رائے کے حق میں استدلال پیش کر کے اپنے موقف کو تسلیم کرالیا۔

ان نظائر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امیر اپنی اعلیٰ فہم و بصیرت کے باوجود محض ذاتی اطلاع و اطمینان (Satisfaction) کی بنیاد پر اہم امور میں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ اپنی اصابتِ رائے پر سب کا یا اکثریت کا اطمینان حاصل نہ کرلے۔

اولی الامر اور شوریٰ کے باہمی تعلق کو حضرت عمرؓ نے اسی تقسیمِ اراضی کے مسئلہ پر طلب کردہ اجلاس میں ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

> "میں نے آپ حضرات کو صرف اس لیئے تکلیف دی ہے کہ میرے کاندھوں پر آپ کے معاملات کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات کو حق متعین کرنا ہوگا، بعض لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا ہے اور بعض نے اتفاق۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ حضرات بہر حال وہی رائے قبول کریں جو میں نے اختیار کی ہے۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر میں نے کوئی بات کہی ہے جس پر میں عمل کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سے میرا ارادہ سوائے اتباعِ حق کے کچھ اور نہیں۔" [۳۰]

انہی حضرت عمرؓ کا قول ہے :

"مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں۔" ع ۳۱

وہ مشاورت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہاں تک فرماتے ہیں،

"جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اپنی یا کسی اور کی امارت کے لیے دعوت دے

تو تمہارے لیے حلال نہیں کہ اسے قتل نہ کرو۔" ع ۳۲

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے فرمایا:

"تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کے کرنے کا کام

ہے۔ جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے وہی خلیفہ ہو گا۔ پس ہم

جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔" ع ۳۳

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، خلافت اور بادشاہت کا فرق اسی شورہ کو قرار دیتے ہیں۔

"امارت (یعنی خلافت) وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ

ہے جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو۔" ع ۳۴

اس اصولِ مشاورت نے ان تمام متعلقہ لوگوں کو جن کے حقوق و مفادات کا مسئلہ زیرِ بحث ہو۔ اظہارِ رائے کی مکمل ضمانت مہیا کر دی ہے۔ اس مشاورت کو صرف منتخب ارکانِ شوریٰ تک محدود نہیں رکھا گیا۔ ایک عام شہری بھی قرآن و سنت سے استدلال پیش کر کے پوری شوریٰ اور امیر کی رائے تبدیل کر سکتا ہے۔ ایک بوڑھی خاتون نے اپنا یہی حق استعمال کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو مہر کی مقدار محدود کرنے کے فیصلے کی غلطی کا احساس دلایا اور انہوں نے اپنا حکم فوراً واپس لے لیا۔

۷۔ پابندیٔ مقاصد و ترجیحات

اولی الامر پر ایک اور اہم پابندی یہ ہے کہ وہ مقاصدِ ریاست اور ترجیحات حقوق میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تبدیلی تصورِ امانت کے منافی ہے۔ وہ بیت المال کو انہی مداتِ اخراجات کے مطابق استعمال کرنے کا پابند ہے جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں یا شوریٰ کے فیصلے سے متعین ہوتی ہیں

اس میں اس کا ذاتی حصہ کتنا ہے؟ یہ بھی شوریٰ ہی طے کرے گی۔ خلیفہ اوّلؓ کے انتخاب کے بعد ان کی گزربسر کا سوال پیدا ہوا تو حضرت عمرؓ انہیں بازار سے، جہاں وہ کپڑا فروخت کرنے کے لیے کندھوں پر تھان رکھے کھڑے تھے، ناظم بیت المال حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس لے گئے۔ انہوں نے تنخواہ کے تعین کا اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم آپ کے لیے مہاجرین میں سے ایک عام آدمی کی آمدنی کا معیار سامنے رکھ کر ایک وظیفہ مقرر کیے دیتے ہیں۔ جو نہ ان کے سب سے زیادہ دولت مند کے برابر ہوگا اور نہ سب سے غریب کے برابر۔" [۲۵]

یہ وظیفہ ۴ ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا اور آپ نے وصیت کر کے ساری وصول شدہ رقم بھی بیت المال کو واپس لوٹا دی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال میں خلیفہ کے حصے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

"میرے لیے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کے لیے، اور ایک جاڑے کے لیے۔ اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لیے۔ پھر بس میں ایک عام آدمی ہوں مسلمانوں میں سے۔" [۲۶]

وہ بیت المال کی ذمہ داری کے سلسلہ میں یہ بنیادی اصول متعین کرتے ہیں:

"میں اس مال کے معاملہ میں تین باتوں کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا۔ حق کے ساتھ لیا جائے، حق کے مطابق دیا جائے اور باطل سے اس کو روکا جائے۔ میرا تعلق تمہارے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے پر کھاؤں گا۔" [۲۷]

حضرت علیؓ نے بھی اپنی تنخواہ شیخینؓ کی تنخواہوں کے مساوی رکھی۔ اور نہایت سادہ زندگی بسر کی۔

اسلامی ریاست کے مقصدِ وجود پر ہم پہلے ہی روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس کا واحد مقصد

اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ۔ ۱۳)

"دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔"

اسلامی ریاست کی اجتماعی قوت اور اس کے ایک ایک شہری کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ

يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال۔ ۳۹)

دین پورا کا پورا صرف اللہ کے لیے ہو جاتے۔

اولی الامر اس مقصد کے سوا کوئی دوسرا مقصد اپنے سامنے نہیں رکھ سکتا۔ نبی اکرمؐ نے اپنے جانشینوں اور تمام مسلمانوں کو سختی سے تنبیہ فرمایا ہے کہ:

"جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی اصل سے نہ ہو تو اس کی بات مردود ہے۔" (مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

"جس نے کسی بدعت نکالنے والے کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔" (مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنّۃ)

یہ ہیں وہ پابندیاں جو اسلامی ریاست میں اولی الامر کے اختیارات پر عائد کی گئی ہیں۔ نیابتی اقتدار اور اس کے ساتھ پابندیٔ قرآن، پابندیٔ سنت، پابندیٔ مشاورت، مشروط اطاعت اور پابندیٔ مقاصد و ترجیحات کے مضبوط شکنجے میں کسا ہوا اولی الامر بنیادی حقوق غصب کرنے کا مشکل ہی کوئی تصور کر سکتا ہے۔

(د) احتسابِ امارت

تصورِ حکومت اور قیادت کی تطہیر اور اختیارات کی تحدید کے ساتھ ساتھ اسلام نے اولی الامر کے احتساب کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں احتساب کے ذرائع پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس سلسلہ میں ترتیبِ احتساب کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اسلام نے

کس طرح حکومت پر عوام کی بالادستی قائم کی ہے۔ اور اسے حقیقی معنی میں "اسلامی جمہوریہ" بنایا ہے۔

(۱) احتسابِ آخرت

اولی الامر پر مقرر کیا جانے والا سب سے پہلا محتسب خوفِ آخرت ہے۔ جو ہر وقت اس کے ذہن و اعصاب پر قبضہ جمائے رکھتا ہے۔ وہ علیم و خبیر اور حاضر و ناظر ہستی جو آخرت میں اس سے ایک ایک عمل کا حساب لینے والی ہے اور یہاں اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہے اس کو بتا چکی ہے کہ:

"جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔ اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔" (البقرہ ۳۸-۳۹)

"زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں سب اُس کے حضور، بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔" (مریم-۹۳)

حضورؐ کا ارشاد ہے:

"تم میں سے ہر شخص محافظ اور نگراں ہے۔ اور اُس سے اُن لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی جو اس کی نگرانی میں دیئے گئے ہیں۔ پس امیر جو لوگوں کا نگراں ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ اور مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے پس اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ اور بیوی اپنے شوہر کے گھر اور شوہر کی اولاد کی نگران ہے پس اس سے اولاد کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔"
(بخاری و مسلم روایت عبداللہؓ بن عمرؓ)

"جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو اور وہ ان کے ساتھ خیانت کرے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا۔" (متفق علیہ)

"جب کسی نے مسلمانوں کے اجتماعی معاملہ کی ذمہ داری قبول کی پھر اس نے ان کے ساتھ خیر خواہی نہیں کی اور ان کے کام کی انجام دہی میں اپنے آپ کو اس طرح

نہیں تھکایا جس طرح وہ اپنی ذات کے لیے اپنے آپ کو تھکاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو منہ کے بل جہنم میں گرا دے گا۔" (طبرانی۔ کتاب الخراج)

آخرت کی جوابدہی کا یہ احساس ایک ایسا داخلی محتسب ہے جو انسان کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ وہ خلوت و جلوت میں کہیں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اس کی ذات کے اندر ہر لحہ خود احتسابی کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اس داخلی محتسب کے ہوتے ہوتے کوئی خارجی احتساب نہ بھی ہو تو انسان کے گمراہ ہونے اور ظلم و بدی کے راستے پر چلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ اسی احساسِ جوابدہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عمرؓ پورے دو سال عہدہ قضاء پر مامور رہے مگر ان کی عدالت میں ایک بھی مقدمہ پیش نہیں ہوا۔ کیونکہ معاشرہ کا ہر فرد، جن میں ان کا سربراہِ حکومت بھی شامل تھا، اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے ادا کر رہا تھا کہ حق کا کہیں کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوا۔

(۲) احتساب بذریعہ عدالت

اسلامی ریاست کے سربراہ کو عدلیہ کے مقابلہ میں کوئی تحفظ (Immunity) حاصل نہیں ہے اسے عام شہریوں کی طرح عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے اور ایک عام شہری اس کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔

خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے درمیان کسی معاملہ میں تنازعہ ہوا۔ حضرت ابیؓ نے قاضی مدینہ زید بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت سے حضرت عمرؓ کو حاضر ہونے کا حکم جاری ہوا۔ وہ حاضر ہوتے مگر گواہ نہ ان کے پاس تھا نہ مدعی کے پاس۔ قاعدہ کے مطابق حضرت عمرؓ کو قسم کھانی تھی۔ حضرت ابیؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ اس کے لیے تیار ہیں تو انہوں نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔" ۳۸

حضرت علیؓ نے ایک نصرانی کو بازار میں اپنی زرہ فروخت کرتے دیکھا تو اس سے کہا زرہ میری ہے۔ اس کے انکار پر مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہوا۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے

شہادت طلب کی وہ پیش نہ کرسکے چنانچہ فیصلہ نصرانی کے حق میں سنا دیا گیا اور خود حضرت علیؓ نے اسے قبول کرتے ہوئے فرمایا" شریح تم نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ فیصلہ سن کر نصرانی حیرت زدہ رہ گیا اور بولا " یہ تو پیغمبرانہ عدل ہے کہ امیرالمومنین کو بھی عدالت میں آنا پڑتا ہے اور انہیں اپنے خلاف فیصلہ بھی سننا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زرہ امیرالمومنین ہی کی ہے۔ یہ ان کے اونٹ سے گر گئی تھی میں نے اٹھالی۔"۳۹

عدلیہ کی یہ حیثیت دورِ بنی امیہ میں بھی باقی رہی عینی کہتے ہیں کہ میں قاضی مدینہ محمد بن عمران کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے محافظ دستہ کا سربراہ اپنے ساتھ ابراہیم بن محمد کو لے کر آیا۔ اور کہا کہ امیرالمومنین نے ایک تنازعہ میں جو ان کے اور ابراہیم کے درمیان ہے مجھے اپنا وکیل مقرر کر کے آپ کی عدالت میں بھیجا ہے۔ قاضی صاحب نے کہا ثبوت پیش کرو کہ خلیفہ نے تمہیں اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ اس نے کہا آپ سمجھتے ہیں میں نے غلط بیانی کی ہے؟ قاضی نے نرمی سے کہا یہ بات نہیں بات قانون کی ہے۔ جب تک شہادت نہیں ہوگی فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس نے جاکر خلیفہ ہشام کو اطلاع دی۔ جو خود حاضرِ عدالت ہوا اور قاضی نے روداد مقدمہ سن کر فیصلہ خلیفہ کے خلاف دیا۔"۴۰

قاضی محمد بن عمران ہی کی عدالت سے ایک اور مقدمہ میں خلیفہ منصور کے نام سمن جاری ہوا۔ دعویٰ کچھ اونٹ والوں نے اپنے حق کے سلسلہ میں دائر کیا تھا۔ قاضی صاحب نے سمن میں لکھا کہ یا تو ان لوگوں کا حق انہیں دے دو ورنہ عدالت میں حاضر ہوجاؤ۔ خلیفہ مسجدِ نبوی میں لگی ہوئی کھلی عدالت کے سامنے حاضر ہوا۔ اور قاضی نے اونٹ والوں کے حق میں اور خلیفہ منصور کے خلاف فیصلہ دیا۔"۴۱

ان نظائر سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں ایک عام آدمی عدالت میں مقدمہ دائر کر کے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدیدار کو ملزموں کے کٹہرے میں لاسکتا اور اپنا حق وصول کرسکتا ہے۔ عدالت کا یہ اختیار کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی کو طلب کرسکتی ہے انتظامیہ پر اس کی گرفت اتنی مضبوط کر دیتا

ہے کہ محض عدالت میں طلبی کا خوف ہی ایک موثر محتسب کا کام دیتا ہے اور لوگوں کے حقوق معرضِ خطر میں نہیں پڑتے۔

(۳) احتساب بذریعہ شوریٰ

شوریٰ کی اہمیت اور اس کے فرائض کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ یہاں اس کے صرف احتسابی پہلو کا ذکر مقصود ہے۔ ارکانِ شوریٰ کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جب امیر اُن سے کسی معاملہ میں مشورہ کرے تو وہ اپنی رائے دے دیں۔ ان کا اصل کام حکومت کی عملی سرگرمیوں کی نگرانی ہے۔ وہ امت کا دماغ بھی ہیں اور اس کی آنکھیں بھی۔ ان کی نگاہِ احتساب اولی الامر کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے اور بیت المال میں خیانت کرنے سے باز رکھتی ہے۔ یوں تو اسلامی ریاست کے ہر شہری اور بالخصوص مسلمانوں کا یہ حق بلکہ خدا کی طرف سے عائد ہونے والا فرض ہے کہ وہ حق بات کہیں، نیکی کو پھیلائیں۔ برائی کو پھیلنے سے روکیں۔ اور اپنے معاشرہ کو عدل و انصاف پر قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ لیکن یہ فرض سب سے بڑھ کر ارکانِ شوریٰ پر عائد ہوتا ہے جنہیں خاص انہی کاموں کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں وہ خدا اور رسولؐ کی ان ہدایات کے خصوصی مخاطبین ہیں۔

"نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو" (المائدہ۔ ۲)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو" (الاحزاب۔ ۷۰)

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں" (التوبہ۔ ۷۱)

حضورؐ کا ارشاد ہے :

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہیئے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔" (مسلم۔ ترمذی۔ ابوداؤد)

"سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ عدل (یا کلمۂ حق) کہنا ہے۔" (ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

"میرے بعد کچھ لوگ حکمراں ہونے والے ہیں جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔" (ابن ماجہ)

شوریٰ کو ایک اعتبار سے اولی الامر پر بالادستی حاصل ہے۔ اولی الامر شوریٰ سے مشورہ کا پابند ہے۔ لیکن ارکانِ شوریٰ پر یہ پابندی نہیں کہ وہ صرف طلب کرنے ہی پر مشورہ دیں۔ وہ جب چاہیں اولی الامر کو مشورہ دے سکتے ہیں۔ اسے ٹوک سکتے ہیں اس کا برسرِعام محاسبہ کر سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں اولی الامر کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی معاملہ میں بھی من مانی کر جائے اور کسی کے حق کو دبالے یا حقدار کو اپنے زیرِ عتاب لے آئے۔

(۴) احتساب بذریعہ عوام

اسلام میں یہ صورت نہیں ہے کہ اولی الامر اور ارکانِ شوریٰ کے انتخاب کے بعد امت ان کے عہدے کی معینہ مدت تک سارا کاروبارِ مملکت ان پر چھوڑ کر خود فارغ ہو بیٹھے۔ اور انہیں کھلی چھوٹ دے دے کہ جو ان کا جی چاہے آئندہ انتخابات تک کرتے رہیں۔ حکومت چونکہ اس مقصد کے حصول کا اہم ترین اور سب سے مؤثر و کثیر الوسائل ذریعہ ہے جس کے لیے اُمت کا ایک ایک فرد اپنی جانیں اور اپنا مال کھپا رہا ہے۔ اس لیے وہ اس کی نگہداشت اور حصولِ مقصد کے لحاظ سے اس کی کارگزاری کے جائزہ کی ذمہ داری سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے یہ محض روٹی کپڑے اور مکان کا معاملہ نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر اقامتِ دین کا معاملہ ہے۔ مسلم معاشرہ کا ہر فرد نہ اپنے زیرِ تصرف آنے والے محدود وسائل کو عیش و عشرت کی نذر کر کے امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگا، اور نہ دوسروں کو اس امر کی اجازت دے گا کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی وسائل کو اللوں تللوں میں اڑا کر سونپی ہوئی امانت کو اپنی خواہشِ نفس پر ضائع

کرتے چلے جائیں۔ یہی وہ احساسِ ذمہ داری ہے جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت سلمانؓ فارسی نے حضرت عمرؓ جیسے ایثار پیشہ خادمِ عوام اور درویش صفت حکمران کے جسم پر ایک کی بجائے دو چادریں دیکھ کر "لوگو! سنو اللہ تم پر رحم فرمائے" کے الفاظِ تخاطب کے جواب میں کھڑے ہو کر کہا "واللہ ہم نہیں سنیں گے۔ واللہ ہم نہیں سنیں گے"۔ حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا۔"اے ابوعبداللہ! کیوں"؟ مطالبہ ہوا پہلے بتائیے کہ یمنی چادروں میں سے ہر ایک کے حصہ میں ایک ایک چادر آئی تھی۔ یہ آپ دو چادریں پہن کر کیسے تشریف لائے؟ حضرت عمرؓ نے جب اپنے بیٹے سے گواہی دلا کر انہیں مطمئن کر دیا کہ دوسری چادر انہوں نے دی ہے تو سلمانؓ فارسی بولے "ہاں! اب فرمائیے۔ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے"۔ ع۴۲ ۔

اسی طرح بوڑھی خاتون نے انہیں برسرِعام ٹوک کر اپنے اختیارات کی حدود میں رہنے اور عورتوں کے اُس حقِ مہر کو محدود نہ کرنے پر توجہ دلائی، جو خدا نے انہیں دیا ہے۔

خلفائے راشدینؓ امت کے اندر محاسبہ کی اس آزادی کو کچلتے نہیں تھے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خطبہ خلافت میں فرمایا کہ اگر مَیں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو۔ اور اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک بار امت کی قوتِ احتساب کا جائزہ لینے کی خاطر فرمایا کہ اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کر لوں تو تم کیا کرو گے؟ حضرت بشرؓ بن سعد کھڑے ہوئے تلوار نیام سے کھینچ کر کہا "ہم تمہارا سر اڑا دیں گے"۔ حضرت عمرؓ نے ڈانٹ کر کہا "کیا میری شان میں تو یہ الفاظ کہتا ہے"؟ انہوں نے کہا کہ "ہاں، ہاں، تمہاری شان میں" حضرت عمرؓ نے خوش ہو کر کہا "الحمدللہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ مَیں کج ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دیں گے"۔ ع۴۳

یہی طرزِ عمل حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا رہا حضرت عثمانؓ پر تو تنقیدوں کے تیروں کی بارش ہوتی رہی مگر انہوں نے رشوت یا جبر کے ذریعہ کسی کی زبان بندی کرنے کی کوشش نہ کی۔ حضرت علیؓ کو خوارج نے گالیاں تک دیں بلکہ روبرو قتل کی دھمکیاں بھی دیں مگر آپ نے تعرض نہ

کیا اور فرمایا "محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جاتے"۔ ع۲۷

احتساب کے ان مختلف ذرائع کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام نے اپنے دائرہ احتساب کو صرف اجتماعی معاملات (Public Affairs) تک محدود نہیں رکھا بلکہ نجی معاملات (Private Affairs) کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ معروف اور منکر کے بارے میں اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جو چیز مجموعہ افراد کے لیے بری ہے وہ ایک فرد کے لیے بھی بری ہے۔ ایک جرم اگر کھلے طور پر کیا جائے تب بھی جرم ہے اور اگر چھپ کر کیا جائے تو بھی وہ جرم ہی سمجھا جائے گا۔ اگر برسرِعام شراب پینا، جوا کھیلنا قابل دست اندازیِ پولیس جرم ہے تو کسی ہوٹل کی محفوظ چہار دیواری، کسی کلب کے خفیہ گوشے یا خود اپنے گھر میں بیٹھ کر اس جرم کا ارتکاب بھی قابل دست اندازیِ پولیس ہے۔ قانونِ شریعت چونکہ انسان کی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی خانوں میں بانٹ کر خود کو ان میں سے کسی ایک تک محدود نہیں کرتا بلکہ پوری کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے وہ نجی زندگی کو دائرہ احتساب سے خارج کر کے اسے نفس پرستی کے ہاتھوں تباہ ہونے کی کھلی چھوٹ نہیں دیتا۔ اسی اصول کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح ہر خاص و عام کے سامنے رہتی تھیں۔

اسلامی معاشرہ کے بنیادی تصورات اولی الامر کی حیثیت، اس کے انتخاب کی شرائط اس کے اختیارات کی تحدید اس کی اطاعت کے حدود اور اس کے احتساب کے ان ذرائع پر نگاہ ڈال لینے کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں انسان کے بنیادی حقوق کے تحفظات کتنے مضبوط و مؤثر ہیں اور انسانوں کے جس گروہ اور دنیا کے جس خطے کو یہ تحفظات میسر آجائیں وہ امن و سلامتی اور خوشحالی و طمانیت کی کیسی بے پایاں نعمتوں سے ہمکنار ہوگا۔

کیا اسلامی نظام صرف ۳۰ سال قائم رہا؟

اسلام میں بنیادی حقوق کے ان تحفظات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک قاری کے ذہن

بجاطور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اتنے مستحکم اور ہمہ گیر تحفظات کی موجودگی میں یہ المیہ کیونکر رونما ہوا کہ اسلام کا فقید المثال نظام عدل ومساوات خلافت راشدہ کی ۳۰ سالہ مدت کے بعد برقرار نہ رہ سکا۔ اس مختصر سی مدت کے بعد جمہوریت کی روح ختم ہو گئی۔ ملوکیت نے اپنا تسلط جمالیا، خلیفہ کے انتخاب میں اُمت کا کوئی عمل دخل نہ رہا۔ موروثی بادشاہت نے منتخب خلافت کی جگہ لے لی۔ بیت المال مسلمانوں کی امانت نہ رہا، حکمرانوں کی ذاتی ملکیت بن گیا۔ شورائیت، آزادی اظہار رائے اور عدلیہ کی آزادی کا بھی خاتمہ ہوا۔ قبائلی گروہی اور علاقائی عصبیتیں ابھر آئیں، قتل وغارت، خونریزی اور جبر وستم کی وہ ساری صورتیں نمودار ہو گئیں جو دنیا کے کسی بھی دوسرے نظام حکومت میں موجود ہو سکتی تھیں۔ بنو اُمیہ، بنو عباس اور بعد کی مسلمان حکومتوں کے دور میں پیہم ایسے واقعات رونما ہوتے رہے جنہیں ظلم کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ آخر اس نمایاں تبدیلی کی کیا توجیہہ پیش کی جائے گی؟ اور کیا اس تبدیلی سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ اسلام صرف ۳۰ سال نافذ رہ سکا اس کے بعد وہ ناکام ہو گیا؟

یہ سوال بظاہر بڑا معقول اور تاریخی حقائق کی روشنی میں بہت وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کے طرز عمل کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں ان کے ذہنوں میں اس نوعیت کے سوالات ابھرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فی نفسہٖ اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتا ہے، اس کے اصول وقوانین خود اپنی جگہ حجت ہیں۔ مسلمانوں کا طرز عمل اسلام کی کسوٹی نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں کے طرز عمل کو بھی اسلام کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ کس درجہ کے مسلمان ہیں اور اپنے دعویٔ اسلام میں کہاں تک سچے ہیں۔ مسلمانوں کو دنیا کی دوسری اقوام پر قیاس کر لینا درست نہیں ان کی پوزیشن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کے نامہ اعمال کو اسلام کے کھاتے میں ڈالنے کی غلطی کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

دنیا کی دوسری اقوام اپنی اپنی ریاستوں میں خود مقتدرِ اعلیٰ ہیں اس لیے ان کے بادشاہوں کے جاری کردہ فرامین پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے وضع کردہ قوانین، حکمرانوں کے نافذ کردہ احکام اور

عدالتوں کے صادر کردہ فیصلوں کو سند اور حجت کا درجہ حاصل ہے اور جیسا کہ ہم دستور کی بحث میں واضح کر چکے ہیں، ان کے ہاں عملاً قانون حکمرانوں کی منشا کا دوسرا نام ہے قانون اپنا کوئی علیحدہ قائم بالذات اور ریاست سے ماوراء وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ ان کی خواہشات کا پابند ہے۔ مروجہ قانون انہیں کہیں قدم بڑھانے سے روکتا ہو تو وہ اس میں ترمیم کر کے یا اس کی جگہ دوسرا قانون بنا کر اپنا راستہ صاف کر لیتے ہیں اور پھر یہ ترمیم شدہ یا نیا قانون ہی حجت بن جاتا ہے۔ سابقہ قانون منسوخ اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے، عدالتوں میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اب حوالہ نئے قانون کا دیا جاتا ہے اور یہ اس وقت تک مؤثر رہتا ہے جب تک کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ نہیں لے لیتا۔

قانون سازی کا یہ عمل نہ صرف پورے نظام قانون کو مسلسل ترمیم و تنسیخ اور تحدید و تعطل کے چکر میں مبتلا رکھتا ہے بلکہ قانون کو مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کی سند بھی عطا کرتا ہے اور اس سارے عمل میں قانون ساز کسی بھی مرحلے پر قانون شکن نہیں سمجھا جاتا۔ عدالتیں اس کے منسوخ کردہ قوانین کو اٹھا کر ایک طرف رکھتی جاتی ہیں اور اس کے جاری کردہ نئے قوانین کے تحت فیصلے صادر کرنے کی پابند ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس اسلام میں نہ مسلمانوں کے کسی حکمراں کو قانون ساز کی حیثیت حاصل ہے اور نہ بحیثیت مجموعی پوری امت کو۔ ان کا اختیار قانون سازی قرآن و سنت کی پابندی سے مشروط ہے۔ ان کے جن حکمرانوں نے قرآن و سنت کے احکام سے روگردانی کی، منافی اسلام قوانین جاری کیے یا خدا اور رسولؐ کی ہدایات سے متصادم طرز عمل اختیار کیا ان کی حیثیت باغیوں، غداروں اور قانون شکن عناصر کی سی ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں کے نزدیک قابل مذمت رہے ہیں اور مسلمانوں نے حقیقتاً ان کے ساتھ یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کے جاری کردہ احکام و قوانین کبھی اسلام کے ضابطۂ قانون کا حصہ نہ بن سکے۔ انہیں کبھی سند اور حجت کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ قانون شریعت میں ان کا اقتدار ذرہ برابر تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ قانون اپنا علیحدہ قائم بالذات اور ریاست سے ماوراء وجود رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے صرف ان حکمرانوں کے فیصلوں کو نظیر کے طور پر تسلیم کیا جو خود قانون شریعت کے تابع تھے انہوں نے بنو امیہ میں صرف حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے

احکام اور فیصلوں کو سند کی حیثیت دی۔ بنو عباس میں کسی کو اس قابل نہ سمجھا۔ مغلوں میں صرف اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مرتب کرائے ہوئے فتاویٰ عالمگیری کو فقہ کی مستند کتابوں میں شامل کیا گیا لیکن ان کے جدِ امجد اکبر کے دینِ الٰہی کو خود اس کے دور میں مسترد کر دیا گیا۔ اسلام کی ۱۴۰۰ سالہ تاریخ میں بادشاہوں اور آمروں کے وضع کردہ قوانین کو کبھی درخورِ اعتنا۔ نہ سمجھا گیا۔ اس کے برعکس امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام حنبلؒ اور امام شافعیؒ جیسے بوریہ نشین فقہاء کے مرتب کردہ قوانین کو، جو قرآن و سنت سے مستنبط تھے قبولِ عام حاصل ہوا، انہی کو مسلم ممالک میں قانون کا درجہ حاصل ہوا اور آج بھی ساری دنیا کے مسلمان انہی چار مسالک کے پیروکار ہیں۔ برصغیر میں انیسویں صدی کے وسط تک یہی فقہ عدالتوں کا قانون رہی اور انگریزوں کے عہد حکومت میں بھی مسلمانوں کے شخصی معاملات کی حد تک اسی پر عمل ہوتا رہا۔ غرض تاریخ کے کسی بھی عہد میں قانونِ شریعت ایک لمحہ کے لیے منسوخ یا معطل نہیں ہوا۔ خود بادشاہ بھی اسی کے تابع رہے۔ ان کی ذات قانون کا سرچشمہ نہ بن سکی۔ ان میں سے کسی نے اکبر کی طرح قانونِ شریعت کے مقابلے میں کوئی "دینِ الٰہی" ایجاد کرنے اور اسے بزور نافذ کرنے کی کوشش بھی کی تو اسے کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ اس کا وضع کردہ قانون اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ ملتِ اسلامیہ نے اسے قانونِ شریعت میں جذب ہونے کی کبھی اجازت نہ دی۔

خلافت راشدہ کے بعد بلاشبہ نظام حکومت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ خلافت و امانت کا وہ تصوّر رخصت ہوا جو اسلامی ریاست کی روح تھا۔ نیابتی اقتدار ذاتی اقتدار میں تبدیل ہو گیا اور پھر ظلم و فساد کا وہ طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو تاریخ کے کسی طالب علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں لیکن تاریخی واقعات سے آخر یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ناکام ہو گیا؟ تاریخ کا ریکارڈ اسلام کی نہیں، مسلمانوں کی ناکامی کا ریکارڈ ہے۔ ایک مسلمان حکمراں، یا مسلمانوں کے کسی گروہ کا قابلِ اعتراض یا شرمناک طرزِ عمل آخر اسلام کی ناکامی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے بنیادی حقوق کے جو تحفظات مہیا کیے تھے وہ ۴۰ سال بعد غیر مؤثر ہو گئے؟

دنیا کے ہر عقیدے، نظریہ، مسلک، اصول، قدر اور روایت کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کا انحصار

دراصل ایمان و عقیدہ کی پختگی اور پابندی عمل پر ہے۔ یہ کسی نظام اور نظریہ کے اثرات وثمرات کو بروئے کار لانے کی شرط اولی ہے۔ پختگی عقیدہ اور پابندی عمل کی اس بنیادی شرط کو پورا کیے بغیر کوئی بھی نظام یا اصول زندگی اپنے اثرات سامنے نہیں لاسکتا۔ سچائی مسلمہ طور پر ایک بہترین اصول زندگی ہے لیکن کیا عملاً سچ بولے بغیر ہم اس کے فوائد و برکات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو کیا جھوٹ کی فراوانی اور سچ سے اکثریت کی روگردانی کے پیش نظر یہ حکم لگانا درست ہوگا کہ سچائی کا اصول غیر موثر ہو گیا ہے کیونکہ وہ لوگوں کی بڑی تعداد کو اپنی پابندی کرانے سے قاصر رہا ہے؟ اور کیا ہم سچائی کو اس بنا پر ترک کر دینے کا مشورہ دینے میں حق بجانب ہوں گے کہ اب انسانوں کی اکثریت اس پر عمل نہیں کرتی؟ یا خود عمل نہ کرنے والے لوگ قابل مذمت اور قصوروار ٹھہریں گے اور ہر ہوشمند ذی شعور آدمی اس اکثریت کو یہ مشورہ دے گا کہ وہ جھوٹ کو، جو بظاہر بڑا موثر نظر آرہا ہے، ترک کرے اور سچائی کو اپنا کر اسے موثر بنائے؟

اصولوں اور نظریوں کو اثر بخشنے والی چیز درحقیقت انسان کا ایمان اور اس کا شعوری ارادہ و عمل ہے اس جوہر ایمان و عمل کے بغیر ہر اصول اور ہر نظریہ الفاظ کے مجموعہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ برطانیہ کا غیر تحریری دستور ایک مثالی جمہوری دستور سمجھا جاتا ہے لیکن اس دستور کے مجرد الفاظ Abstract Words میں کیا بجائے خود یہ اثر و قوت موجود ہے کہ اگر اسے افریقہ یا ایشیا کے کسی ملک میں نافذ کر دیا جائے تو وہ اسی طرح قابل عمل، مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہو گا جس طرح برطانیہ میں ثابت ہوا ہے؟ اگر نہیں تو ناکامی کا ذمہ دار کون قرار پائے گا؟ دستور یا وہ قوم جس نے اپنے طرز عمل سے اسے ناکام بنا دیا؟

کسی نظریہ حیات کی ناکامی اور اس پر عمل درآمد میں ناکامی دو مختلف چیزیں ہیں جنہیں باہم خلط ملط نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ہم کسی نظام کی ناکامی کا حکم صرف اسی صورت میں لگا سکتے ہیں جب حسب ذیل سوالات میں سے کسی ایک کا جواب اثبات میں ہو۔

(۱) کیا تجربہ نے اسے ناقص اور ناکارہ ثابت کر دیا ہے؟

(۲) کیا انسان کے ترقی یافتہ علم و شعور نے اس کے پیش کردہ اصولوں کو عقل و منطق کی رو سے غلط ثابت کر دیا ہے؟

(۳) کیا انسان نے اس سے بہتر اور زیادہ قابلِ عمل اصول دریافت کر لیے ہیں؟

(۴) کیا تاریخ کے طویل سفر نے اسے فرسودہ اور ناقابلِ عمل بنا دیا ہے؟

(۵) کیا اس کی شکل اس حد تک مسخ ہو چکی ہے کہ اب صحیح اور غلط کو چھانٹنا ممکن نہیں رہا؟

اسلام کے معاملہ میں ان میں سے کسی سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ اسلام تجربہ سے دنیا کے دوسرے نظام ہائے حیات پر اپنی برتری اور افضلیت ثابت کر چکا ہے۔ اسلام کے مقابلے میں وہ کون سا جدید یا قدیم نظریہ حیات ہے جس نے اپنے نفاذ کی ۳۰ سالہ مدت میں عدل و مساوات اور فلاح و خیر کا ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کیا ہو؟ یہ امتیاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ ۳۰ سال تک اپنی حقیقی روح اور تعلیمات کے ساتھ نہ صرف نافذ رہا بلکہ اپنے نقطہ کمال کو پہنچا۔ دنیا کا کوئی دوسرا نظام زمین پر ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنے نقطہ کمال (Ideal) کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکا کسی نظریہ حیات کی عملی آزمائش کے لیے ۳۰ سال کی مدت کچھ کم نہیں ہے۔ اس آزمائشی مدت میں اسلام کا کون سا اصول یا ضابطہ غلط ثابت ہوا؟ کوئی نقص اور عیب دریافت ہوا ہو تو وہ کیا ہے؟ پھر انسان نے کیا فی الحقیقت اس سے بہتر کوئی دوسرا نظام دریافت کر لیا ہے؟ ہم اسی کتاب میں اسلام اور دوسرے نظریہ ہائے حیات کا جائزہ لے کر دیکھ چکے ہیں کہ انسانی عقل اب تک جو کچھ پیش کر سکی ہے، اسلام کے مقابلے میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اسلام کو فرسودہ اور ناقابلِ عمل ٹھہرانے کی بھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ تاریخی حقائق اس امر کی واضح شہادت مہیا کر رہے ہیں کہ اسلام کو جب بھی خود اس کی عائد کردہ شرائط کے مطابق روبعمل لایا گیا مسلم معاشرہ میں خلافت راشدہ کی ساری خوبیاں ابھر آئیں اور اسلام اپنی حقیقی صورت میں پھر جلوہ گر ہو گیا خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کے سیاسی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں لیکن تمام بگاڑ اور فساد کے باوجود خلافت راشدہ سے تقریباً ۶۰ سال بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ منصب

خلافت پر فائز ہوتے اور انھوں نے ملوکیت کے سارے آثار مٹا کر اسلامی نظام کو اس کی اصل روح کے ساتھ دوبارہ نافذ کرنے کا عزم کیا تو پورے معاشرے کی کایا پلٹ گئی۔ اسلامی انقلاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ از سر نو برپا ہوا اور خلافت راشدہ کا ——— دور لوٹ آیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ناکام نہیں ہوا تھا بلکہ مسلمان اور بالخصوص ان کے حکمراں اس پر عمل کے معاملہ میں تساہل اور غفلت شعاری کا شکار ہو گئے تھے۔ انھوں نے ۶۰ سال بعد اصلاح عمل کا عزم کیا اور اسلام کو آزمایا تو ویسا ہی کھرا، توانا اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بار آور ثابت ہوا جیسا کہ خلافت راشدہ میں ثابت ہو چکا تھا۔ اسے ۱۲ سو سال بعد جب سید احمد شہیدؒ نے پشاور میں اپنی مختصر المیعاد اسلامی ریاست میں نافذ کرنا چاہا تب بھی یہ اپنی تمام تر جامعیت اور کاملیت کے ساتھ روبعمل آگیا اور اس کا کوئی اصول فرسودہ یا ناقابل عمل ثابت نہیں ہوا۔

اسلام کے ساتھ یہ صورت بھی نہیں ہے کہ اس کی تعلیمات مسخ ہو چکی ہوں اور صحیح اور غلط کو چھانٹنا ممکن نہ رہا ہو۔ قرآن اپنے ایک ایک حرف کی صحت کے ساتھ محفوظ ہے۔ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک واقعہ، آپ کا ایک ایک عمل اور قول اس طرح محفوظ ہیں کہ دنیا کی کسی دوسری شخصیت کے لیے جامع اور مکمل حالات موجود نہیں۔ خلافت راشدہ کا عہد آئینہ کی طرح کتب تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔ امت کے اندر آج تک تدوین فقہ کا جتنا کام ہوا ہے وہ سب بلا کم و کاست محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں ہر شعبہ زندگی سے متعلق اور عہد جدید کے تمام مسائل پر مفصل رہنما لٹریچر موجود ہے۔ جو شخص یہ جاننے کی خواہش رکھتا ہو کہ کسی معاملہ میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں اسے ان تک رسائی میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے اصول و قوانین آج بھی ہمارے سامنے نہایت واضح صورت میں موجود ہیں۔ ان کا کوئی حصہ مسخ اور کوئی پہلو مبہم نہیں ہوا۔ گویا جس چیز کا نام اسلام ہے وہ کسی نقص و عیب کے بغیر ۱۴ سو سال سے تسلسل کے ساتھ تاریخ کی شاہراہ پر ہمارے ساتھ چلا آرہا ہے۔ اس سفر کے دوران مسلمان کبھی اسلام کے بہت قریب رہے، کبھی اس سے دُور رہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے اسلام کے قریب تر آنے کی نیت

کی ہو اور اسے معدوم یا تاریخ کے صفحات میں مدفون پانے کی وجہ سے وہ اس کے قریب نہ آسکے ہوں۔

ان حالات میں یہ اعتراض کہ اسلام صرف ۳۰ سال چلا، سراسر مغالطہ آرائی ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام پر ۳۰ سال تک قلب و ذہن کی پوری یکسوئی کے ساتھ عمل کیا۔ بعدازاں ان کے سیاسی نظام میں خلل واقع ہوا اور بگاڑ کی صورتیں نمودار ہوئیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس بگاڑ سے خود اسلام کی صحت پر کیا اثر پڑا؟ اور وہ کس بنا پر ناقابلِ عمل ٹھہرا؟ کیا مسلمانوں کی تاریخ میں بعض بادشاہوں اور آمروں کی موجودگی آج صحیح اسلام پر عمل میں مانع ہو گئی ہے؟ کیا ہم یہ عذر پیش کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ چونکہ ہمارے ہاں حجاج بن یوسف اور حسن بن صباح جیسے لوگ درمیان میں آگئے ہیں اس لیے اب خلافتِ راشدہ کا نظام بروئے کار لانا ممکن نہیں رہا؟ آخر اسلام اور مسلمانوں کے باہمی رشتے سے امراء وسلاطین کی کارگزاریوں کا تعلق (Relevance) کیا ہے؟ مسلمانوں نے ان سے کبھی ذہنی رہنمائی کا رشتہ قائم نہیں کیا۔ ایک عام مسلمان کو ان کے نام تک یاد نہیں ان کے احکام و فرامین کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ ان کا ذکر تک کیا جائے یا کسی معاملہ میں ان کا حوالہ دیا جائے اس کے برعکس مسلمانوں کا بچہ بچہ خلفائے راشدین، اکابر صحابہ کرامؓ اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ نیز امام بخاریؒ، ابن تیمیہؒ، غزالیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور اسی طرح کے دوسرے مسلم زعماء کے ناموں سے بخوبی واقف ہے کیونکہ یہ شخصیات عہد نبویؐ سے آج تک کی تاریخ اسلام میں مسلمانوں کو ان کا دینی ورثہ منتقل کرنے اور اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی کا تسلسل قائم رکھنے سے گہرا تعلق Relevance رکھتی ہیں۔ ان کی بدولت اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ کبھی ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہوا اور نہ اسلام عصری مسائل سے کنارہ کش ہوا۔ وہ ہر دور میں مسلمانوں کو زندگی کے تمام معاملات میں کامل رہنمائی دیتا ہوا آگے بڑھتا رہا ہے۔ اب اس اعتراض کا کہ اسلام ۳۰ سال سے زائد نہ چل سکا ایک اور پہلو سے جائزہ لیجئے۔ یہ اعتراض صرف سیاسی نظام کی حد تک اور وہ بھی جزوی طور پر درست ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کی عام انفرادی و اجتماعی زندگی ہمیشہ اسلام کے تابع رہی ہے۔ ان کی

اخلاقی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی، خانگی، ثقافتی اور عدالتی زندگی میں۔۔۔ اسلام ہی کا قانون جاری و ساری رہا ہے ان کی سیاسی زندگی بھی اسلام سے یکسر بے تعلق نہیں رہی۔ اسلام میں مذہب اور سیاست کبھی اس طرح جدا نہیں ہوئے جس طرح یورپ میں چرچ اور ریاست جُدا ہوتے۔ یورپ میں چرچ کی بالادستی ختم ہوئی تو ریاست نے مذہب کو اجتماعی زندگی سے کلیتاً خارج کر کے اسے انفرادی زندگی تک محدود کر دیا۔ ریاست کے اختیارات قانون سازی مذہبی احکام و قوانین کے تابع نہ رہے سیکولرازم کے فلسفے نے اسے مذہب کی گرفت سے بالکل آزاد کر دیا۔ اس کے برعکس نوآبادیاتی دور سے قبل تک مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ہمیں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جہاں کسی بادشاہ یا حکمراں نے قانون شریعت کو مکمل طور پر معطل کر کے خود اپنا وضع کردہ قانون نافذ کر دیا ہو۔ مسلمان بادشاہوں نے قانون شریعت کی خلاف ورزی ضرور کی ہے لیکن اس قانون کو مسجد و مدرسہ کے حوالے کر کے وہ اس سے بے تعلق کبھی نہیں ہوئے۔ ان کی ریاستوں کا قانون شریعت ہی کا قانون تھا اور زندگی کے تمام معاملات میں عدالتی فیصلے اسی کے مطابق ہوتے تھے۔ ان بادشاہوں میں بھی سب کے سب ظالم و جابر اور عیش و عشرت کے دلدادہ نہیں تھے۔ ان میں بڑے بڑے عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار حکمران بھی گزرے ہیں۔ ان میں ناصرالدین محمودؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے بادشاہ بھی شامل ہیں جو شاہی خزانہ کو اپنی ذات کے لیے حرام سمجھتے تھے اور اکل حلال کے لیے ٹوپیاں بُنتے اور قرآن کی کتابت کرتے تھے۔ ان کی اکثریت منصف مزاج اور خدا و خلق کا خوف رکھنے والی تھی۔ ان کے کردار پر اسلام کا گہرا اثر موجود تھا اور وہ غیر مسلم دنیا کے ہمعصر حکمرانوں سے بلاشبہ بہت بہتر تھے۔ ہم چونکہ انہیں خلافت راشدہ کے معیار پر جانچتے ہیں اس لیے وہ ہماری نگاہوں میں نہیں جچتے لیکن ان کا موازنہ ہمعصر حکمرانوں سے اور ان کے نظام سلطنت کا موازنہ دنیا کے دیگر ہمعصر نظاموں سے کیا جائے تو ان کی پوزیشن بالکل بدل جاتی ہے۔

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض کہ اسلام ۳۰ سال سے زائد نہ چل سکا درست نہیں ہے البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ۳۰ سال بعد امت مسلمہ اسے اپنے عمل کی دنیا میں خلافت

راشدہ کی سطح پر برقرار نہ رکھ سکی لیکن ہم معترضین کے سامنے اپنا یہ سوال دہرانا چاہیں گے کہ اگر آج اسلام کو اس کی حقیقی صورت میں نافذ کرنے کا عزم کر لیا جائے تو اس میں کیا چیز مانع ہو گی؟ خود اسلام یا ہوس اقتدار اور نشہ حکمرانی میں بدمست لوگوں کی نیت کا کھوٹ؟

مستشرقین اور ان کے مسلمان متاثرین کی جانب سے اسلام کی "ناکامی" کے ضمن میں ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرن اوّل کے اسلامی معاشرے میں سیاسی، معاشی، عدالتی اور معاشرتی ادارے (Institutions) وجود میں نہ آسکے یا وہ اتنی ٹھوس شکل اختیار نہ کر سکے کہ ان کی بنیاد پر اسلامی نظام حکومت کا کوئی واضح ڈھانچہ (Structure) سامنے آسکتا اسلامی معاشرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے قبائلی طرز کا نسبتاً ترقی یافتہ معاشرہ تھا جس میں قبائلی سردار کی جگہ اب مرکزی حیثیت خلیفہ کو حاصل ہو گئی تھی۔ شخصی نوعیت کے اس نظام حکومت میں مملکت کی باگ ڈور فردِ واحد کے ہاتھ میں تھی جو صحن مسجد میں بیٹھ کر جملہ امور مملکت انجام دیتا۔ مالِ غنیمت تقسیم کرتا۔ گورنروں اور فوجی کمانڈروں کو احکام و ہدایات جاری کرتا ان کی رپورٹیں وصول کرتا۔ ان کے استفسارات کا جواب لکھواتا، انہیں ضروری وسائل مہیا کرتا۔ ان کے خلاف شکایات کی سماعت کرتا عام لوگوں کی تکالیف کا ازالہ کرتا۔ ان کے تنازعات کا تصفیہ کرتا اور فقہی مسائل میں ان کی رہنمائی کرتا۔ عام لوگوں کو چونکہ خلیفہ تک دسترس حاصل تھی اس لیے وہ بھی بالعموم اپنے چھوٹے بڑے مسائل لے کر اسی کی خدمت میں حاضر ہوتے اس طرح خلیفہ کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی اور تقسیم اختیارات کی بجائے ارتکازِ اختیارات کے اس عمل نے خود مختار و نیم خود مختار اداروں کے وجود کی راہیں مسدود کر دیں۔ خلفائے راشدینؓ چونکہ انتہائی نیک طینت، پاکباز، بے لوث، خدا کا خوف رکھنے والے سربراہ حکومت تھے اس لیے ان کے دَور میں سارا کام ٹھیک ٹھاک چلتا رہا لیکن ان کے بعد جب حکمرانوں میں وہ بے غرضی اور کردار کی بلندی و پاکیزگی باقی نہ رہی تو یہ نظام، جو مستحکم اداروں پر استوار نہیں ہو سکا تھا، تیزی سے روبہ زوال ہوا اور اس میں بہت سی خرابیاں در آئیں۔

یہ اعتراض ناواقفیت سے زیادہ عصبیت پر مبنی ہے اور اس کا اصل محرک مغرب کی یہ خواہش ہے کہ انسانی حقوق کے تصوّر، ان کے حصول کی تحریک اور فلسفۂ جمہوریت کی طرح سیاسی معاشی اور معاشرتی اداروں کے قیام و فروغ کا سہرا بھی اسی کے سر باندھا جا سکے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلامی ریاست کی بنیادیں مستحکم اداروں پر استوار کی جا چکی تھیں اور بنو امیہ و بنو عباس کے دورِ حکومت میں ان اداروں کو مزید فروغ حاصل ہوا۔

کتبِ حوالہ

۱۔ ابوبکرؓ: محمد حسین ہیکل۔ مطبوعہ میری لائبریری لاہور۔ ۱۹۷۳ء صفحہ ۸۶

۲۔ ایضاً: صفحہ ۴۵۴

۳۔ ایضاً: صفحہ ۴۵۵

۴۔ ایضاً: صفحہ ۴۵۷

۵۔ عمرؓ بن خطاب: طنطاوی۔ مترجم عبدالصمد صارم۔ مطبوعہ البیان لاہور۔ ۱۹۷۱ء صفحہ ۷۰

۶۔ ایضاً: صفحہ ۷۴

۷۔ ایضاً: صفحہ ۵۵۶

۸۔ ایضاً: صفحہ ۵۵۲

۹۔ ایضاً: صفحہ ۵۵۴

۱۰۔ کنز العمال: ج۔۵ ح ۲۵۰۵

۱۱۔ ایضاً: ج ۵ ح 2512

۱۲۔ ایضاً: ج ۶۔ باب فضائل الفاروقؓ

۱۳۔ کتاب الخراج: امام ابو یوسف۔ ترجمہ نجات اللہ صدیقی۔ مطبوعہ مکتبہ چراغ راہ کراچی۔

۱۹۶۶ء صفحہ ۱۴۰

۱۴۔ ایضاً : صفحہ ۱۲۰

۱۵۔ سیاست شرعیہ : امام ابن تیمیہؒ۔ مترجم مولانا محمد اسماعیل گودھروی۔ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی صفحہ ۸۵

۱۶۔ ایضاً : صفحہ ۱۰۹

۱۷۔ اسلامی ریاست : سید ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۷۷ بحوالہ صبح الاعشیٰ قلقشندی

۱۸۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۵۶۰

۱۹۔ ایضاً : صفحہ ۵۶۱

۲۰۔ کتاب الخراج : صفحہ ۱۱۹

۲۱۔ ایضاً : صفحہ ۳۶۷

۲۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۲۶

۲۳۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۳۱۲

۲۴۔ کتاب الخراج : صفحہ ۱۳۶

۲۵۔ ابوبکرؓ : صفحہ ۸۶

۲۶۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۲۹۳

۲۷۔ الفاروق : شبلی نعمانی مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۵۱۲

۲۸۔ کنز العمال : ج ۵ ح ۲۵۸۷

۲۹۔ اسلامی ریاست : صفحہ ۲۷۳

۳۰۔ کتاب الخراج : صفحہ ۱۶۱

۳۱۔ کنز العمال : ج ۵ ح ۲۳۵۴

۳۲۔ ایضاً : ج ۵ ح ۲۵۷۷

۳۳۔ الامامۃ والسیاسۃ : ابن قتیبہ ج ۱، صفحہ ۴۱

۳۴۔ طبقات ابن سعد : ج ۴، صفحہ ۱۱۳

۳۵۔ کنزالعمال : ج ۵ ح ۲۲۸۰

۳۶۔ البدایہ والنہایہ : ابن کثیر ج ۷۔ صفحہ ۱۳۴

۳۷۔ الفاروق : شبلی نعمانی۔ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۷۰ء بحوالہ کتاب الخراج

۳۸۔ المبسوط : سرخسی مطبوعہ مصر ۱۳۳۱ھ ج ۲۲ صفحہ ۴۷

۳۹۔ تہذیب تاریخ : ابن عساکر دمشق ۱۳۴۹ھ ج ۶ صفحہ ۳۰۶

۴۰۔ الابحاث السیاسیہ : مہدی محمد مرید مطبوعہ تطوان 1951ء صفحہ ۱۳۲

۴۱۔ ایضاً ، صفحہ ۱۳۲

۴۲۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۳۱۲

۴۳۔ الفاروقؓ : صفحہ ۵۱۱

۴۴۔ المبسوط : ج ۱۰۔ صفحہ ۱۳۵

اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق

اسلامی ریاست میں شہریوں کو جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے ہم ان میں سے پہلے ان حقوق کو لیتے ہیں جو بلا امتیاز عقائد تمام شہریوں کو بحیثیت انسان یکساں طور پر حاصل ہیں بعدازاں ہم مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خصوصی حقوق کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ تحفظِ جان

اسلام نے انسانی جان کو انتہائی محترم قرار دیا ہے۔ اور ایک انسان کے قتل کو تمام انسانوں کا قتل ٹھہرا کر تحفظِ جان کی اہمیت پر جس طرح زور دیا ہے اس کی نظیر دنیا کے مذہبی، اخلاقی یا قانونی لٹریچر میں کہیں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۖ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۚ (المائدہ۔ ۳۲)

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔"

سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ (بنی اسرآئیل۔ ۳۳)

"قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ"

اسلامی قانون نے قتل بالحق کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے (۱) قتل عمد کے مجرم سے قصاص (ب) جہاد میں دین حق کی راہ میں مزاحم لوگوں سے جنگ (ج) اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا (د) شادی شدہ عورت یا مرد کو زنا کی سزا (ہ) ارتداد کی سزا (و) قطاع الطریق یعنی شاہراہوں پر ڈاکہ زنی وغیرہ۔ ان چھ صورتوں کے سوا باقی کسی بھی صورت میں انسانی جان کی حرمت ساقط نہیں ہوتی

قرآن کریم میں اسی طرح کی ہدایات سورہ انعام آیت ۱۵۲، سورہ بقرہ آیت ۱۷۸ اور ۱۷۹ اور سورہ فرقان آیت ۶۸ میں دی گئی ہیں۔ قتل کو اللہ نے ایک ایسا سنگین اور قبیح جرم قرار دیا ہے کہ اس کا مرتکب دنیا میں قصاص کی سزا پانے کے بعد مر کر جہنم رسید ہوتا ہے۔ اور اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کا مستقل نشانہ بنا رہتا ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النسآء۔ ۹۳)

"وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

قرآن مجید میں بھوک اور افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کرنے کی بھی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام۔ ۱۵۱)

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے"

یہی ہدایت سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۱ اور سورہ انعام آیت ۱۴۰ میں بھی دی گئی ہے۔ عربوں میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی قبیح رسم موجود تھی۔ اس پر آخرت میں سخت باز پرس کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے انتہائی غضبناک لہجہ میں فرمایا گیا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر۔۸۔۹)

"اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی!"

اللہ تعالیٰ نے صرف دوسروں کی جان لینے ہی کو ممنوع نہیں ٹھہرایا بلکہ انسان کو خود اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اور اس طرح خود کشی کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء۔۲۹)

"اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔"

حرمتِ جان کے بارے میں قرآن کے ان واضح احکام کے بعد اب نبی اکرمؐ کے ارشادات اور آپ کے عہد مبارک کے چند واقعات ملاحظہ کیجئے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے فرمایا:

"لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں، ہمیشہ کے لئے ان چیزوں کی حرمت ایسی ہی ہے جیسی آج تمہارے اس دن کی اور اس ماہِ مبارک (ذی الحجہ) کی حرمت اس شہر (مکہ) میں ہے۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ تم میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، اور کفار کے زمرے میں شامل ہو جاؤ۔" (بخاری، ابوداؤد، نسائی، مسند احمد)

بعد ازاں آپ نے اپنی اس نصیحت پر عمل کی اولین مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"زمانہ جاہلیت کے سارے خون اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون، جسے بنی ہذیل نے مار ڈالا تھا اب میں معاف کرتا ہوں۔"

(بخاری، ابوداؤد، نسائی، مسند احمد)

حضورؐ نے ایک بار ارشاد فرمایا:

کسی مسلمان کے قتل کے مقابلے میں پوری دنیا کا زوال خدا کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا (مسلم) اور خون صرف "مسلمان" ہی کا محترم نہیں، خدا کے ہر بندے کا خون محترم ہے۔ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اگر ذمی کا خونِ ناحق ہو جائے تو اس پر جنت حرام ہے۔

"جس نے کسی ذمی کو قتل کیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی۔" (نسائی)

"جس نے کسی معاہد غیر مسلم کو قتل کیا وہ کبھی جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔" (بخاری)

ایک مرتبہ کسی غزوہ میں مشرکین کے چند بچے زد میں آکر ہلاک ہو گئے۔ آپؐ کو سخت رنج ہوا۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یہ تو مشرک بچے تھے۔ فرمایا:

"مشرک بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔" (مسند احمد)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ عہد نبویؐ میں ایک شخص کی لاش ملی مگر اس کے قاتل کا پتہ نہ چلا۔ آنحضرتؐ نے سخت ناراضگی کے عالم میں خطبہ دیا اور فرمایا:

"اے لوگو! کیا بات ہے؟ میرے ہوتے ہوئے آدمی قتل کیا جاتا ہے اور اس کے قاتل کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک آدمی کے قتل پر اگر آسمان و زمین کی تمام مخلوق بھی متفق ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گا۔" (طبرانی)

ایک غزوہ میں ایک عورت ہلاک ہو گئی۔ آپؐ نے اس کی لاش دیکھ کر کہا:

"اوہ! یہ تم نے کیا کر ڈالا؟ یہ تو جنگ کرنے والوں میں شامل نہ تھی۔ جاؤ، خالدؓ سے کہہ دو کہ ذریت (عورتوں اور بچوں) اور معذوروں کو قتل نہ کرو۔"

اسلام میں انسانی جان کی حرمت اور اس معاملہ میں اسلامی حکومت کے طرزِ عمل کا صحیح اندازہ ہمیں فتح مکّہ کے موقع پر عفوِ عام کے واقعہ سے ہوتا ہے۔ کفار کی حیثیت جب تک حملہ آور کی رہی اور وہ مدینہ کی اسلامی ریاست کا وجود مٹانے کے درپے رہے، ان کے ساتھ ایک

حملہ آور ملک کے فوجیوں کا سا سلوک کیا گیا۔ جنگِ بدر میں حضرت ابوبکرؓ کی اس رائے کے مقابلے میں کہ قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے حضرت عمرؓ کی اس رائے کو تائیدِ الٰہی حاصل ہوئی کہ انہیں تہِ تیغ کیا جائے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

"کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو حالانکہ اللہ کے پیشِ نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔" (الانفال۔ ۶۷، ۶۸)

اب فتحِ مکہ کی صورت میں چونکہ کفار کی پوزیشن بدل گئی۔ ان کی ریاست ختم ہوئی اس کے جارحانہ کردار اور کفار کی حملہ آوروں کی حیثیت کا بھی خاتمہ ہو گیا وہ مفتوحہ علاقے کے باشندوں کی حیثیت سے خود اسلامی ریاست کے زیرِ اقتدار آ کر اس کے شہری بن گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق صاغرین میں شامل ہو گئے۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝ (التوبۃ۔ ۲۹)

(ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس لئے حضورؐ نے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتحِ مکہ کی بشارت پا چکے تھے، اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے فتح کا مرحلہ مکمل ہونے سے قبل ہی عین حالتِ جنگ میں اپنی ریاست کے نئے شہریوں کی حفاظتِ جان کا غیر معمولی اہتمام کیا۔

مکہ حضورؐ کے جانی دشمنوں اور اسلام کے کٹر مخالفوں کا گڑھ تھا۔ یہاں وہ لوگ آباد تھے جنہوں نے قدم قدم پر آپ کی راہ میں کانٹے بچھائے۔ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ آپ کو تین سال تک شعبِ ابی طالب میں محصور رکھا۔ آپؐ کے قتل تک کے منصوبے بنائے اور جب آپ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ مدینہ

پر بار بار حملہ آور ہوئے، جنگِ بدر، جنگ اُحد اور جنگِ احزاب میں آپؐ کے متعدد جانثاروں کو شہید کر دیا اور خود آپؐ کو بھی زخمی کیا۔ آپؐ کے جو ساتھی مکہ سے ہجرت کر کے یمن، شام، حبش اور نجد گئے، وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ فتح مکہ کے وقت آپ کے چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی، ان کا کلیجہ چبانے والی ہندہ اور عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ، کعب بن زہیر اور ان ہی جیسے سینکڑوں دشمنانِ اسلام شہر میں موجود تھے۔ حضورؐ آج ان سے ان کی ایک ایک بدی کا بدلہ چکانے پر قادر تھے لیکن آپ نے قدرتِ انتقام کے باوجود ان کی جان بخشی کے لئے فوج کو حسبِ ذیل احکام جاری کئے:

(۱) جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۲) جو شخص خانہ کعبہ کے اندر پہنچ جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۳) جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۴) جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۵) جو شخص حکیم بن حزام کے گھر میں پہنچ جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۶) بھاگ جانے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

(۷) زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔

فتح مکہ کے بعد جب خانہ کعبہ کے سامنے لوگوں کا اجتماعِ عام ہوا تو آپؐ نے اُن سے خطاب کر کے فرمایا:

"جانتے ہو! میں آج تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"

مجمع سے آواز آئی۔

"آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔"

حضورؐ نے جواباً فرمایا:

"تم پر آج کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔"

مکہ میں آپؐ نے عفو و احسان کی جو عظیم مثال قائم کی وہ بعد کو اسلام کے قانونِ جنگ کا ایک اہم باب بن گئی۔ اور خلفاء راشدین کے دور میں شام، عراق، مصر، ایران اور روم میں جتنی فتوحات ہوئیں ان میں فتح کے بعد قتل و خونریزی سے اسی طرح گریز کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے کمانڈروں اور گورنروں کو اس سلسلہ میں جو ہدایات جاری کیں ان کی تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان سب پر فتح مکہ کے عفوِ عام کا گہرا پرتو موجود ہے۔

تحفظِ جان کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس کا اطلاق کب سے ہوگا؟ دنیا کے عام قوانین تحفظِ جان کے حق کو بعد از ولادت قابلِ اطلاق قرار دیتے ہیں۔ لیکن خدا کے قانون نے اسے استقرارِ حمل سے قابلِ اطلاق قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے غامدیہ نامی عورت کو صریح اقرارِ زنا کے باوجود رجم کی سزا نہیں دی، کیونکہ اُس نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا تھا کہ میں حاملہ ہوں۔ اسے بچے کی ولادت اور رضاعت کی مدت پوری ہونے کے بعد سزا دی گئی۔ یہ سزا فوری طور پر نافذ کر دی جاتی تو بچے کے خونِ ناحق کا اندیشہ تھا۔ فقہاء نے تحفظِ جان کے حق کو استقرارِ حمل کے ۱۲۰ دن کے بعد سے قابلِ اطلاق قرار دیا ہے کیونکہ اس عرصے میں جنین (Fetus) گوشت کے لوتھڑے سے تبدیل ہو کر انسانی شکل و صورت میں ڈھلنے لگتا ہے اور اس پر "انسان" ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے فقہاء کی اس رائے کو اب صدیوں بعد جدید میڈیکل سائنس نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ امریکی سپریم کورٹ نے رو بنام ویڈ (Roe vs wade) کے مشہور مقدمہ میں جدید طبی تحقیقات کے حوالے سے فیصلہ دیا ہے کہ رحمِ مادر میں "انسانی وجود" کو حمل کے تین ماہ بعد قانوناً تسلیم کیا جائے گا۔[۳۲]

۲۔ تحفظِ ملکیت

اسلامی ریاست میں ایسی تمام نجی املاک جو جائز ذرائع سے حاصل شدہ ہوں، جن سے شریعت کے مقرر کردہ تمام حقوق و واجبات مثلاً زکوٰۃ و صدقات، ماں، باپ، بیوی، بچوں،

بھائی، بہنوں اور دوسرے قریبی عزیزوں کی کفالت کے مصارف، حقوقِ وراثت حقوقِ بیع و شہری اور دوسرے نفقات وواجبات ادا کر دیئے گئے ہوں اور ملک کے دفاع، انتظامی امور، فلاحِ عامہ کے منصوبوں یا ہنگامی ضروریات مثلاً جنگ، قحط، سیلاب، زلزلہ اور وباء وغیرہ سے نمٹنے کے لئے حکومت کے عائد کردہ مستقل اور عارضی نوعیت کے ٹیکس بھی ادا کئے جا چکے ہوں نیز جنہیں حرام اور ناجائز مشاغل یا کاروبار میں صرف نہ کیا جا رہا ہو حکومت کی مداخلت سے قطعی محفوظ ہوں گی اور ان سے متعلق مالک کو حسب ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

(ل) استعمال اور تصرف کا حق (ب) مزید نفع کمانے کے لئے کاروبار میں لگانے کا حق۔

(ج) انتقال ملکیت کا حق (د) تحفظِ ملکیت کا حق۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ (البقرہ۔ ۱۸۸)

(اور تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ)

حکومت کو اگر کسی کی ذاتی ملکیت، اجتماعی مفاد کے تحت اپنے قبضہ میں لینے کی ضرورت پڑ جائے، تو وہ مالک کی مرضی سے معروف معاوضہ ادا کر کے اسے حاصل کرے گی۔

حضورؐ نے مدینہ میں مسجد نبویؐ کے لئے جو زمین منتخب کی وہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی انہوں نے اپنی افتادہ زمین بلاقیمت دینے کی پیش کش کی مگر حضورؐ نے اس کی قیمت کا تخمینہ لگوایا اور اس وقت کی عام شرح کے مطابق معاوضہ دے کر یہ زمین حاصل کی۔[۴]

جنگِ حنین کے موقع پر آپؐ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں حاصل کیں۔ اور جب اس نے کہا اغصبًا یا محمدؐ؟ کیا بلا معاوضہ لینے کا ارادہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُونَةٌ "یہ مستعار ہیں اور جو ان میں سے ضائع ہوں گی ان کا معاوضہ دیا جائے گا"۔[۵]

قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج میں فرماتے ہیں:

"امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے

بغیر کسی شخص کے قبضے سے اس کی کوئی چیز نکال لے۔[۶]

خطبہ حجۃ الوداع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت جان کے ساتھ حرمت مال کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ پہلے ہی نگاہ سے گزر چکا ہے۔ تحفظِ ملکیت کے حق کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے کیجیے:

"جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے۔" (بخاری)

۳۔ تحفظِ آبرو

اسلامی ریاست کے ہر شہری کا ایک اہم حق یہ ہوگا کہ اس کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا جائے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں حضورؐ نے جان و مال کے ساتھ ہی حرمت آبرو کا بھی حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ (الحجرات۔۱۱)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔"

وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا (الحجرات۔۱۲)

"اور تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو۔"

اسی آیت میں مزید فرمایا گیا۔

اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (الحجرات۔۱۲)

"بہت گمان کرنے سے پرہیز کیا کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔"

آپس کی گفتگو میں بدزبانی سے بھی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء ۱۴۸)

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو"۔ اس آیت میں جہاں بدگوئی سے منع کیا گیا ہے وہاں ظالم کے خلاف بھرپور آواز اٹھانے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (النور۔ ۳۰)

"اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور۔ ۳۱)

"اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"۔

ان آیات میں دیکھئے مسلمانوں سے براہ راست خطاب نہیں ہے بلکہ یہ ہدایات حضورؐ کے ذریعہ دی جا رہی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں مسلمان ان پر فرداً فرداً عمل کریں وہاں اسلامی ریاست بھی ان پر عمل درآمد کی نگرانی کرے۔ اور جہاں کہیں ان کی خلاف ورزی ہو وہاں ان کا مؤثر انسداد کرے۔ گویا ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا اہتمام کرے اور فواحش کو پھیلنے سے روکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں لوگوں کو بلا وجہ مارنے پیٹنے اور ان کی توہین و تذلیل کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا:

- مسلمان کی پشت محترم ہے (اس کی پٹائی نہیں کی جاسکتی) اِلّا یہ کہ اس نے سزا کے قابل جرم کیا ہو۔ جس نے بلا وجہ کسی مسلمان کو مارا اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضب ناک ہوگا"۔ (طبرانی)

"اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزوجل اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔" (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"جس نے کسی دوسرے کی بے عزتی یا آبروریزی کی ہو یا کوئی اور ظلم کیا ہو تو وہ آج معاف کرا لے اس دن سے پہلے جب نہ روپیہ پیسہ ہوگا نہ مال و زر، البتہ نیک عمل اس کے پاس ہوگا جو لے لیا جائے گا۔ اس ظلم کے موافق۔ اور اگر نیک عمل نہ ہوگا تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی۔" (بخاری)

حضورؐ نے کسی کی بے عزتی کو بدترین زیادتی قرار دیا ہے۔

"بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔" (ابوداؤد)

حضرت عمرؓ عاملوں کو رخصت کرتے وقت انہیں یہ ہدایت دیا کرتے۔

"میں تمہیں جابر و قاہر بنا کر نہیں بلکہ امام اور رہنما بنا کر بھیجتا ہوں، خبردار! مسلمانوں کو مار پیٹ کر انہیں ذلیل و خوار نہ کرنا۔"

ہتک عزت کے معاملہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد عزت دار ہے خواہ اس کا مقام و منصب اور مالی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اسلامی قانون میں کسی کو ہتک عزت کا دعویٰ پیش کرتے وقت یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ صاحب عزت ہے اور مدعا علیہ کے فعل تذلیل سے اس کی عزت کو واقعی بٹہ لگا ہے۔ اسی اصول مساوات کی بنا پر حضرت عمرؓ نے والیٔ مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے محمد بن عمرو کو اس جرم میں ایک مصری سے پٹوایا کہ

اس نے گھڑدوڑ میں اس کا گھوڑا آگے آنے پر مصری کو پیٹا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ "لے یہ کوڑے، میں شریفوں کا بیٹا ہوں" حضرت عمرؓ نے باپ بیٹے کو مدینہ طلب کیا اور مصری کے ہاتھ میں درہ دے کر کہا کہ "مار، شریفوں کے بیٹے کو" اور پھر اس کی مرمت ہو جانے کے بعد فرمایا "عمرو بن العاص کی چندیا پر بھی درہ گھما، کیونکہ خدا کی قسم اس نے اس کی سلطنت ہی کے بل بوتے پر تجھے مارا ہے"۸

تحفظِ آبرو ہی سے متعلق حضرت عمرؓ کے دور میں قتل کے دو واقعات ہوئے لیکن آپ نے دونوں میں قصاص کو ساقط کر دیا اور قاتل کو کوئی سزا نہیں دی۔ ایک واقعہ میں بنی ہذیل کے کسی شخص نے اپنے میزبان کی لڑکی پر دست درازی کی، اُس نے پتھر کھینچ مارا جس سے اس کا جگر پھٹ گیا۔ آپ نے فیصلہ دیا "یہ قتیل الٰہی ہے اس کی دیت نہیں ہو سکتی"۹

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ دو نوجوان ایک دوسرے کے بھائی بنے۔ ایک جہاد پر چلا گیا۔ اور دوسرے کو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا۔ اس نے ایک رات کسی یہودی کو اپنے بھائی کی بیوی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا تو اسے قتل کر کے عریاں لاش راستے پر ڈال دی۔ صبح یہودیوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے مقدمہ پیش کیا تو انہوں نے نوجوان کا بیان سن کر کہا "اللہ تیرے ہاتھ سلامت رکھے" اور یہودی کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔۱۰

حضرت مغیرہ بن شعبہ گورنر بصرہ پر زنا کی تہمت لگانے والے تین افراد پر حضرت عمرؓ نے حدِ قذف جاری کی اور ان کے کوڑے لگائے گئے۔۱۱

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک شخص کو مالِ غنیمت میں زیادہ حصہ طلب کرنے پر ۲۰ کوڑے لگوائے اور اس کا سر منڈوایا۔ وہ سیدھا مدینہ پہنچا۔ حضرت عمرؓ سے اپنی بے عزتی کی شکایت کی۔ آپ نے تحریری حکم بھیجا "اگر تم نے یہ بات لوگوں کے سامنے کی ہے تو میں تمہیں قسم دلاتا ہوں کہ اسی طرح لوگوں میں بیٹھ کر اسے بدلہ دو۔ اور اگر خلوت میں ایسا کیا ہے تو خلوت میں بدلہ دو" اسے لوگوں نے بہت سمجھایا کہ معاف کر دے مگر وہ نہ مانا آخر ابو موسیٰ برسرِ عام بدلہ دینے بیٹھے۔

تو اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا" اے اللہ میں نے اسے معاف کر دیا"۔[۱۲]

تحفظِ آبرو کے معاملہ میں اسلام کا مزاج کیا ہے! اس کا اندازہ سورہ النور کی ان آیات سے کیجئے جن میں اُم المومنین حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشی کی سخت مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی پاکدامنی کی شہادت دی اور مسلمانوں کو افترا پردازی اور الزام تراشی سے بچنے کی تاکید کی۔ ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لئے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اس کے لئے تو عذاب الیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا، اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا؟ اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ وہ لوگ چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا (ذرا غور کرو، اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ! یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے"۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے۔ وہ علیم و حکیم ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ

میں فحش پھیلے۔ وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔" (النور۔ ۱۱ تا ۱۹)

قرآن میں یوں تو ہر فرد کی عزت و آبرو کے تحفظ پر زور دیا گیا ہے لیکن ناموسِ خواتین کی حفاظت کے لئے تو غیر معمولی انداز فہمائش اختیار کیا گیا ہے۔ سورہ النور ہی میں فرمایا گیا:

"جو لوگ پاک دامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں، اُن پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ انہیں وہ بھرپور بدلہ دے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے۔ سچ کو سچ کر دکھانے والا۔" (النور ۲۳ تا ۲۵)

یہ انہی ہدایات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی متعدد داستانوں کے درمیان ہمیں کہیں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا جس میں کسی حکمران نے اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لئے ان کی بہو بیٹیوں اور ماؤں بہنوں کی بے حرمتی کی ہو۔

۴۔ نجی زندگی کا تحفظ

اسلامی ریاست میں شہریوں کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور گھروں کی چار دیواری کو ایک محفوظ قلعہ کی حیثیت دی گئی ہے جس میں مداخلت کا کسی کو حق نہیں۔ قرآن مجید کا حکم ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ (النور۔ ۲۷۔۲۸)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔ یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو

اجازت نہ دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے گھر میں بھی آواز یا دستک دے کر داخل ہونے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ ماں بہنوں اور بیٹیوں پر ایسی حالت میں نظر نہ پڑے جس میں نظر پڑنا بداخلاقی کے زمرہ میں آتا ہو۔

ان سخت پابندیوں سے صرف وہ عمارتیں مستثنیٰ ہیں جہاں کوئی آباد نہ ہو۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ (النور۔۲۹)

"تمہارے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو"۔ ان جگہوں میں دفاتر، پبلک عمارات، ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دوکانیں اور مدارس وغیرہ شامل ہیں۔ گھروں میں بلا اجازت داخل نہ ہونے کی ہدایت کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہ دوسروں کی نجی زندگی میں زیادہ دخیل نہ ہوں۔ گھر میں آنے کی اجازت کا مطلب یہ نہیں کہ بس دھرنا دے کر دہیں بیٹھ رہیں اور صاحب خانہ کو اپنے گھر میں بھی اپنی مرضی اور پروگرام کے مطابق وقت گزارنے کا موقع نہ دیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ (الاحزاب۔۵۳)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ۔ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔"

کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہونے اور وہاں صرف بقدرِ ضرورت وقت گزارنے کے

سلسلہ میں ان ہدایات کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر دروازے ہی سے کوئی چیز لینی ہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الاحزاب۔۵۳)

"نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو"

اسی طرح گھروں میں تاک جھانک سے منع کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے دیکھے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ آپؐ نے دوسرے کا خط پڑھنے یا پڑھتے وقت اسے کنکھیوں سے دیکھنے کی بھی ممانعت کی ہے۔

قرآن نے ایک شہری کے گھر کو بیرونی مداخلت سے محفوظ کرنے کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تاکید بھی کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے راز ٹٹولنے، نجی معاملات کی ٹوہ لینے اور کھوج کرید میں پڑے رہنے سے سخت پرہیز کریں۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات۔۱۲)

"اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو"

انسان تجسس کے ذریعہ دوسروں کے عیب تلاش کرتا ہے اور پھر جو عیب اور کمزوریاں اس کے علم میں آتی ہیں انہیں مزے لے لے کر دوسروں کو سناتا اور اس طرح متعلقہ شخص کی بدنامی و رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ قرآن نے تجسس اور غیبت دونوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا:

"تم اگر لوگوں کے مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہو گئے تو ان کو بگاڑ دو گے یا کم از کم بگاڑ کے قریب پہنچا دو گے" (ابو داؤد)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا۔

"جس شخص نے کسی کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور انسان کو زندہ کر دیا۔" (ابو داؤد، نسائی)

حضورؐ نے حکمرانوں کو خصوصیت کے ساتھ تجسس کرنے سے منع فرمایا ہے:

"حکمران جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ انہیں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔" (ابو داؤد)

اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کی حدودِ مداخلت کیا ہیں، اور ایک شہری کو اس مداخلت سے کتنا وسیع تحفظ حاصل ہے۔ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا اور دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا اے دشمنِ خدا! کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟ اس نے جواب دیا" امیر المومنین! جلدی نہ کیجئے۔ اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کئے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازے سے آؤ اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر نہ جاؤ اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ البتہ اس سے وعدہ لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا (تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۸۹ بحوالہ مکارم الاخلاق)

حضرت عمرؓ ہی کے دور کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکی نے حدِ شرعی سے بچنے کے لیے چھری سے خودکشی کی کوشش کی مگر زندہ بچ گئی اور پھر گناہ سے تائب ہو گئی۔ ایک شخص نے اُسے نکاح کا پیغام دیا جو اس واقعہ سے لاعلم تھا۔ سرپرست نے حضرت عمرؓ سے پوچھا "کیا میں اسے

فرمایا "شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا یا چھیڑ چھاڑ کی ہوگی یا نظر بد ڈالی ہوگی۔" انہوں نے کہا "نہیں" آپؐ نے پوچھا "کیا تو اس سے ہم بستر ہوا؟" انہوں نے کہا "ہاں" پھر پوچھا "کیا تو نے اس سے مباشرت کی؟" انہوں نے کہا "ہاں" پھر پوچھا "کیا تو نے اس سے مجامعت کی؟" انہوں نے کہا "ہاں" اسی طرح مزید تین سوالوں کے جواب میں انہوں نے جواباً ہاں کہا۔ آخر آپؐ نے دریافت فرمایا "کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟" انہوں نے کہا "جی ہاں میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا جو شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔" آپؐ نے پوچھا "کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟" انہوں نے کہا "جی ہاں" آپ نے پوچھا "تو نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟" انہوں نے کہا "نہیں"۔ ایک شخص نے اٹھ کر ان کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپ نے محلہ والوں سے دریافت کیا کہ "یہ دیوانہ تو نہیں؟" انہوں نے کہا کہ ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ آپؐ نے حضرت ہزالؓ بن نعیم سے جنہوں نے ماعز بن مالک کی پرورش کی تھی اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائے مغفرت کرانے کا مشورہ دیا تھا فرمایا "کاش تم نے اس کا پردہ ڈھانک دیا ہوتا تو تمہارے لئے اچھا تھا" پھر آپؐ نے ماعز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ انہیں شہر کے باہر لے جا کر سنگسار کر دیا گیا۔ جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعز بھاگے اور کہا "لوگو! مجھے رسول اللہؐ کے پاس لے چلو، میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ انہوں نے مجھے دھوکہ دیا کہ رسول اللہ مجھے قتل نہیں کرائیں گے" مگر پتھر مارنے والوں نے انہیں ہلاک کر دیا۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع دی گئی تو فرمایا "تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟ میرے پاس لے آئے ہوتے شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔" (تفہیم القرآن جلد سوم ص ۳۳۵)

اس واقعہ میں حضورؐ کا ایک ایک سوال صاف بتا رہا ہے کہ آپؐ ماعز کو رجم سے بچا لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اور ان کے اپنے بیان میں یا محلہ والوں کی شہادت میں شک کا کوئی ایسا پہلو تلاش کر رہے تھے جس کا فائدہ پہنچا کر ماعز کی جان بچائی جا سکے۔ آپ نے نشہ یا فتورِ عقل کا شبہ بھی ڈھونڈا، لیکن جب بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہی تب فیصلہ صادر کیا۔ اور پھر آپ کو اس پر عملدرآمد ہو جانے کا قلق بھی ہوا۔ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ کرتے

وقت اور بالخصوص کسی کو سزا دیتے وقت معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے کس حد تک تحقیق ہونی ضروری ہے۔

عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ کے متعدد واقعات اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی شہری کو باقاعدہ مقدمہ چلائے اور جرم ثابت کئے بغیر قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔

ایک مرتبہ آنحضرتؐ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے ایک شخص نے خطبے کے دوران کھڑے ہو کر کہا "یا رسول اللہ میرے پڑوسی کس جرم میں گرفتار کئے گئے ہیں" آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے اٹھ کر پھر یہی سوال کیا۔ آپؐ نے خطبہ جاری رکھا اور اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ جب اُس نے تیسری بار اٹھ کر یہی سوال دہرایا۔ تو آپ نے حکم دیا کہ اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دیا جائے۔

(ابوداؤد۔ کتاب القضاۃ)

آپ کے دو مرتبہ خاموش رہنے کی وجہ یہ تھی کہ کوتوال مسجد میں موجود تھا۔ اگر گرفتار شدگان کا واقعی کوئی قصور ہوتا تو وہ اُٹھ کر بیان کرتا۔ لیکن جب اُس نے چپ سادھے رکھی تو آپ نے نتیجہ اخذ کر لیا کہ گرفتاری بلاجواز ہے۔ اس لئے رہائی کا حکم صادر کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں ایک شخص عراق سے آیا اور حاضر خدمت ہو کر کہا " امیر المومنین! میں ایک ایسے معاملہ کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر" آپ نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا "جھوٹی شہادت کا فتنہ ہمارے ملک میں پھوٹ پڑا ہے" حضرت عمرؓ نے کہا "اچھا یہ چیز شروع ہو گئی"۔ اس نے کہا "ہاں"۔ آپ نے فرمایا "تم پریشان نہ ہو خدا کی قسم اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا" (موطا۔ باب الشرط الشاہد)

حضرت عمرؓ ہی کے عہد کا وہ واقعہ نظر سے گزر چکا ہے جس میں آپ نے گورنر مصر حضرت عمروؓ بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو کو مدینہ طلب کر کے برسر عام روداد مقدمہ سنی۔ مظلوم مصری کے ہاتھ سے محمد بن عمرو کے کوڑے لگوائے۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو بھی کوڑے لگانے کی اجازت دی جن کی گورنری کی وجہ سے بیٹے کو ایک شہری پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہوئی۔ مگر فریادی نے کہا " امیر المومنین میں نے

اپنا بدلہ اتار لیا۔ میرا جی ٹھنڈا ہو گیا اور جس نے مجھے مارا تھا میں نے اس کو پیٹ لیا"۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص کو مخاطب کر کے یہ تاریخی جملہ کہا "اے عمرو! تم لوگوں نے انسانوں کو کب سے اپنا غلام بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا" ۱۴۲

ان نظائر سے عیاں ہو جاتا ہے کہ اسلام میں معقول عدالتی چارہ جوئی کے بغیر حکومت نہ کسی شہری کو کوئی سزا دے سکتی ہے نہ اسے قید کر کے آزادی سے محروم کر سکتی ہے۔ قرآن کا صاف حکم ہے: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء۔ ۵۸)

"اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو"

مسلمانوں کے لئے اس عام حکم کے ساتھ اسلامی ریاست کے اولین سربراہ نبی اکرمؐ کو تو خصوصیت کے ساتھ عدل کا حکم دیا گیا۔
وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ۔ ۱۵)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں"۔

پہلی آیت کے الفاظ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ انصاف محض من مانے فیصلے کا نام نہیں ہے اس کا اپنا ایک معیار۔ ایک معروف تصور ہے، ایک متعین ضابطہ ہے۔ اس لئے فیصلے کو لازماً معروف عدالتی طریقۂ کار (Due process of Law) کی تمام شرائط پر پورا اترنا چاہیئے۔ اس معاملہ میں اسلامی ریاست کی عدلیہ کا طریقۂ کار خود حضورؐ کے ایک فیصلے سے واضح ہو جاتا ہے۔

فتح مکہ سے قبل کا واقعہ ہے کہ عین اس وقت جب آپؐ مکہ کی طرف کوچ کی تیاریاں فرما رہے تھے اور آپؐ کے منصوبۂ جہاد کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک اس امر پر تھا کہ کفارِ مکہ کو اس کا قبل از وقت علم نہ ہو، ایک صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے اپنے بال بچوں کی حفاظت کے خیال سے ایک بوڑھی عورت کے ہاتھ سردارانِ قریش کو ایک خط بھیج دیا جس میں انہیں حضورؐ کی تیاریوں کی اطلاع دی گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہو گیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا۔ وہ یہ خط برآمد کر کے

لے آئے۔ اسے کھول کر پڑھا گیا تو اس میں قریش کے لئے یہ اطلاع موجود تھی کہ حضورؐ تم پر چڑھائی کرنے والے ہیں۔ حضرت حاطبؓ کو طلب کر کے جب کھلی عدالت میں باز پرس کی گئی تو انہوں نے احساس ندامت کیساتھ کہا "یا رسول اللہ میں کافر و مرتد نہیں ہو گیا ہوں میں نے یہ کام غداری کی نیت سے نہیں کیا۔ میرے بال بچے مکہ میں ہیں۔ وہاں میرا حامی کوئی قبیلہ نہیں۔ میں نے یہ خط صرف اس لئے لکھا کہ میرا یہ احسان مان کر قریش میرے بال بچوں کے ساتھ زیادتی نہ کریں" بظاہر یہ کھلی غداری کا مسئلہ تھا۔ یہ خط قریش تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کے سارے جنگی منصوبے تلپٹ ہو جاتے۔ جرم کی سنگین نوعیت دیکھ کر حضرت عمرؓ غضبناک ہو کر اٹھے اور کہا "یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ اس غدار کی گردن اڑا دوں" مگر رحمت العالمینؐ نے بڑی نرمی سے فرمایا کہ "حاطب اہل بدر میں سے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے فعل کی جو وجہ بیان کی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے" حضرت عمرؓ اس جواب پر شدت جذبات سے رو دیئے۔ اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ "اللہ اور اس کا رسولؐ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں" حضرت حاطبؓ کی یہ برأت ایک طرف انسانی جان کے احترام اور دوسری طرف سنگین سے سنگین جرم کی بھی کھلی عدالت میں سماعت اور ملزم کو صفائی کا موقع دیئے جانے کی عدیم النظیر مثال ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت اس نوعیت کے جرم کا ارتکاب کرنے والے کو کبھی کھلی عدالت میں پیش نہ کرتی اور نہ کوئی عدالت ایسے ٹھوس ثبوت جرم اور ملزم کے اپنے اقراری بیان کے بعد اسے موت سے کم کوئی سزا دیتی۔ لیکن حضورؐ نے حضرت حاطبؓ کے ماضی، جنگ بدر میں ان کی شرکت اور ان کے بیان کی صداقت کے پیش نظر سزائے موت تو درکنار انہیں کوئی معمولی سی سزا بھی نہ دی اور ان کی لغزش کی بناء پر عام مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کی جو سبکی ہوئی اس کو کافی سزا سمجھا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ الممتحنہ میں بھی آیا ہے (واقعہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۴۲۲)

حضرت علیؓ کے عہد میں خارجیوں کے طرز عمل کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی مخالفت کے جرم میں کسی خارجی کو پکڑ کر جیل میں نہیں ڈالا۔ انہوں نے آخر وقت تک ضبط و تحمل کا دامن تھامے رکھا اور اس اصول پر قائم رہے کہ جب تک وہ خروج (مسلح بغاوت) کا عزم

نہیں کرتے خلیفہ ان سے تعرض نہیں کر سکتا۔

عدی بن ارطاۃ نے جو حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے ایک عامل تھے آپ کو لکھا کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے ذمہ واجب الادا اخراج اس وقت تک ادا نہیں کرتے جب تک انہیں تھوڑا سا عذاب نہ چکھا دیا جائے، اس لئے اس کی اجازت دیجئے ـــــ انہوں نے جواب میں لکھا:

"مجھے حیرت ہے کہ تم نے مجھ سے انسانوں کو عذاب دینے کی اجازت طلب کی ہے گویا میں تمہیں عذاب الٰہی سے بچا لوں گا یا میری رضامندی تمہیں غضبِ خداوندی سے بچا لے گی۔ میرا خط پانے کے بعد یہ طریقہ اختیار کرو کہ جو شخص اپنے ذمہ واجب رقم آسانی سے ادا کر دے اس سے لے لو۔ اور جو نہ دے اسے حلف لے کر چھوڑ دو۔ خدا کی قسم ایہ بات کہ لوگ اپنے جرائم کا بار اٹھائے خدا کے سامنے پیش ہوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو عذاب دینے کا جرم لئے اس کے سامنے حاضر ہوں" [15]

عہدِ عباسی کے چیف جسٹس قاضی ابو یوسفؒ حبس (Detention) کے بارے میں فرماتے ہیں:

"نہ یہ بات جائز ہے اور نہ اس کے جائز ہونے کی کوئی گنجائش ہے کہ کسی شخص کو محض اس بناء پر حوالات میں ڈال دیا جائے کہ ایک شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجرد الزام کی بناء پر کسی کو گرفتار نہیں کرتے تھے۔ اگر ایسی صورت ہو تو کرنا یہ چاہیئے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا جائے۔ اگر مدعی کے پاس ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دیدیا جائے ورنہ مدعا علیہ سے ضمانت لے کر اس کو رہا کر دیا جائے۔ اگر اس کے بعد مدعی کچھ ثبوت پیش کرتا ہے تو خیر، ورنہ اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا" [16]

اسلام کے یہ قوانین حالات کے پابند نہیں ہیں۔ انہیں ہنگامی حالت (Emergency) نافذ کر کے معطل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہر صورتِ حال میں نافذ العمل رہیں گے۔ اس لئے اسلامی ریاست میں شہریوں کو بلا جواز قید سے مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔

۶۔ عمل غیر سے برأت

اسلامی ریاست میں ایک شہری کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ اسے دوسروں کے قصور میں نہ پکڑا جائے۔ قرآن نے اس سلسلے میں یہ قطعی ضابطہ مقرر کردیا ہے :

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (انعام - ۱۶۴)

"ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

یہی بات سورہ فاطر آیت ۱۸ میں کہی گئی ہے، سورہ بقرہ میں صاف حکم ہے :

فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ (البقرۃ : ۱۹۳)

"ظالموں کے سوا کسی اور پر دست درازی روا نہیں۔"

ان احکام کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست میں ملزم کے بجائے اس کے باپ، بیٹوں، ماں، بہنوں یا دوسرے عزیزوں کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی مثالیں ہمیں صرف بیسویں صدی کی ترقی یافتہ نام نہاد جمہوری ریاستوں میں ملتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور سے قبل کی پوری مسلم تاریخ ان سے خالی ہے۔ حجاج بن یوسف ایک نہایت ظالم و سفاک حکمراں کی حیثیت سے مشہور ہے، لیکن اپنی تمام تر خونخواری کے باوجود اپنے حریفوں کے رشتہ داروں کی گردنیں اڑانے کا جرم اس سے بھی سرزد نہ ہوا۔ اس کے دور کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے قطری بن فجاءۃ نامی شخص کو گرفتار کیا اور کہا کہ میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔ قطری نے پوچھا وہ کس لیے؟ حجاج نے جواب دیا اس لیے کہ تیرے بھائی نے میرے خلاف چڑھائی کی ہے۔ قطری نے کہا کہ میرے پاس امیر المومنین کا خط ہے کہ میرے بھائی کے جرم میں آپ مجھے ماخوذ نہ کریں۔ حجاج نے کہا "کہاں ہے وہ خط؟ لا مجھے دکھلا۔ قطری نے جواب میں کہا :-

"میرے پاس تو اس سے بھی زیادہ واجب التعمیل خط ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ" حجاج کو یہ جواب پسند آیا اور مسکرا کر اسے رہا کردیا۔ ۱۷۱

۷۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

اسلام نے شہریوں کو یہ حق دیا ہے کہ ان پر ظلم ہو تو وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں، ظالم سے ہرگز نہ دبیں اور اس کے ظلم کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النسا - ۱۴۸)

"اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔"

یعنی بدگوئی نہایت ناپسندیدہ فعل ہے لیکن جب ظلم حد سے بڑھ جائے، صبر و تحمل کا بند ٹوٹ جائے اور بالکل اضطراری حالت میں زبان سے ظالم کے حق میں برے الفاظ ادا ہونے لگیں تو اللہ کے نزدیک اعلیٰ ترین اخلاقی تعلیم کے باوجود یہ آخری حالت قابل معافی ہے۔ مظلوم کو اس کا حق ہے کہ وہ حرف شکایت زبان پر لائے اور ایسا کرتے ہوئے اگر اس کی جذباتی کیفیت شائستہ گفتگو کے آداب ملحوظ رکھنے سے قاصر ہو جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

مشہور حدیث ہے:

"افضل ترین جہاد اس شخص کا ہے جو کسی حق سے ہٹے ہوئے سلطان کے آگے کلمۂ حق (یا کلمۂ عدل) کہے" (ابوداؤد - ترمذی - ابن ماجہ - نسائی - مسند احمد)

"لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام نازل کردے"۔ (ابوداؤد، ترمذی)

"اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ وہ مظلوم ہو تو ہم اس کی مدد کریں گے مگر ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟ فرمایا اسے ظلم سے روک دو۔" (بخاری)

حضورؐ سراپا رحمت تھے، کبھی کسی کے ساتھ ادنیٰ سا بھی ظلم نہیں کیا لیکن کسی کو آپؐ سے شکایت ہوتی تو اسے اس کے اظہار کا موقع دیتے اور اپنی ذات کو بدلے کے لیے پیش فرما دیتے۔

ایک مرتبہ آپؐ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، ہجوم میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر منہ کے بل آپ پر لد گیا۔ دست مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی۔ آپ نے اس سے

ٹھوکا دیا۔ اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آ گئی، آپؐ نے فرمایا "مجھ سے انتقام لے لو۔" اس نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ میں نے معاف کر دیا۔" (ابوداؤد)

جنگ بدر کے موقع پر آپؐ ایک تیر سے مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے۔ حضرت سوادؓ بن غزیہ صف سے کچھ آگے تھے۔ آپ نے ٹھوکا دے کر فرمایا "سواد برابر کھڑے رہو۔" سواد بولے "یا رسول اللہؐ! آپ نے مجھ کو تکلیف دی حالانکہ اللہ نے آپ کو حق و انصاف کے لیے مبعوث فرمایا ہے، پس آپ اجازت دیجئے کہ میں آپ سے بدلہ لوں"۔ رسول اللہؐ نے فوراً شکم مبارک کھول کر فرمایا۔ سواد اپنا بدلہ لے لو۔ سواد دوڑ کر جسم اطہر سے لپٹ گئے اور شکم مبارک کو چوم لیا۔ ۱۸۱

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگا۔ اس نے بھری محفل میں سخت کلامی کی۔ اس کے گستاخانہ طرز تخاطب پر صحابہؓ کو غصہ آ گیا اور وہ اس کی مرمت کے لیے اٹھے آپؐ نے فرمایا:

"اسے کہنے دو، اسے کہنے دو!" "جس کا کچھ حق نکلتا ہو وہ ایسی باتیں کر سکتا ہے"۔ (بخاری)

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے وہ خطبات نظر سے گذر چکے ہیں جن میں لوگوں کو دعوت دی گئی کہ وہ جہاں کہیں ظلم ہوتے دیکھیں فوراً اس پر گرفت کریں۔ حضرت ابوموسیٰؓ کے خلاف شکایت کا وہ واقعہ تحفظ آبرو کے زیر عنوان بیان کیا جا چکا ہے جس میں آپ نے ایک شخص کے بال منڈوا دیئے تھے۔ یہ بالوں کو جمع کر کے سیدھا مدینہ پہنچا اور حضرت عمرؓ کو دیکھتے ہی بالوں کا گچھا ان کے سینے پر دے مارا اور بڑے اکھڑ لہجے میں بولا "دیکھ، بخدا آگ" حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہاں، بخدا آگ" وہ بولا "امیر المومنین! میں بہت بلند آواز اور دشمن پر بہت دباؤ ڈالنے والا انسان ہوں میرے ساتھ ایسا ایسا کیا گیا ہے، میرے بیس کوڑے لگائے گئے ہیں اور سر کے بال منڈوائے گئے ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے اس کی گستاخی پر غضب ناک ہونے کی بجائے اسے یوں خراج تحسین پیش کیا:

"بخدا! اگر سارے لوگ اس جیسے عزم والے ہوں تو یہ بات مجھے اس سارے

مال غنیمت سے زیادہ عزیز ہے جواب تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے"۔ ۱۹ؔ

اسلام نے ظلم کے خلاف احتجاج ہی کا حق نہیں دیا بلکہ یہ حق بھی دیا ہے کہ اگر یہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہو تو ظالم کی اطاعت سے انکار کر دیا جائے اور اسے اس کے منصب سے ہٹا دیا جائے کیونکہ منصب امارت کی اولین ذمہ داری ظلم کو مٹانا اور عدل کو قائم کرنا ہے۔ عدل شرط امارت ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

(جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے کہا) میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا " اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے "؟ اس نے جواب دیا " میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے " (البقرہ - ۱۲۴)

مسلمانوں کو حکم ہے :

وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۝ (الشعراء - ۱۵۱)

اور حدود سے نکل جانے والوں کی اطاعت نہ کرو۔

اس موضوع سے متعلق متعدد آیات و احادیث گذشتہ صفحات میں حدود اطاعت کے زیر عنوان نقل کی جا چکی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں ظالموں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا اور ان کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا نہ صرف ایک حق بلکہ فرض ہے جس میں کوتاہی مقتدر اعلیٰ کے سامنے قابل مواخذہ ہو گی۔

۸۔ آزادیٔ اظہار رائے

اسلامی ریاست کے شہریوں کو محض یہی حق حاصل نہیں کہ جب ان پر ظلم ہو تو وہ زبان کھولیں، بلکہ انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ ملک کے معاملات و مسائل سے متعلق اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کریں۔ قرآن مجید میں مومنوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے :

تَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ (آل عمران : ۱۱۰)

" وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں "۔

یہ صفت آزادیٔ اظہار خیال کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے نہ صرف اس آزادی کی ضمانت مہیا ہو جاتی ہے بلکہ آزادی کے استعمال کا رخ بھی متعین ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان اس آزادی کو صرف نیکی کے فروغ کے لیے استعمال کر سکتا ہے برائی کو پھیلانے کے لیے اسے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ یہ منافقوں کی صفت ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا:

يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ (التوبہ : ٦٧)

"وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں"

قرآن نے بنی اسرائیل کے تنزل کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ:

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ (المائدہ : ٧٩)

"انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔"

مسلمانوں کو اس تساہل سے بچنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ (النساء : ١٣٥)

"اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

یعنی یہاں اگر تم نے حق بات کہنے سے گریز کیا یا کسی دباؤ، دھونس یا لالچ میں آ کر لگی لپٹی بات کہہ کر منافقانہ طرز عمل اختیار کیا تو یہ جان رکھو کہ دنیا میں تو تم چاہے سزا سے بچ جاؤ مگر آخرت میں اس جرم کی سزا سے نہ بچ سکو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"میرے بعد کچھ لوگ حکمراں ہونے والے ہیں، جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔" (نسائی۔ کتاب البیع)

حضورؐ کا معمول تھا کہ مختلف معاملات میں صحابۂ کرام سے رائے لیتے اور اظہار رائے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس کی متعدد مثالیں گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں۔ جنگ اُحد

کے موقع پر آپؐ کی اور معمر و جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی یہ رائے تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے مگر حضرت حمزہؓ اور نوجوانوں کی رائے یہ ہوئی کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے۔ آپ نے دیکھا کہ اکثریت باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں ہے تو اسی کے مطابق عزم جنگ کیا اور ہتھیار بندی کے لیے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ اس دوران معمر صحابہؓ نے نوجوانوں کو عار دلائی کہ تم نے پیغمبر خدا کی رائے کا لحاظ کیے بغیر آپؐ کو تکلیف میں ڈالا۔ یہ سن کر نوجوان متاثر ہوئے اور معذرت کے لیے حجرہ کے سامنے جمع ہو گئے۔ آپؐ باہر آئے اور ان کی معذرت سنی تو فرمایا "عزم کے بعد اب نبی کی شان نہیں ہے کہ مقصد کو حاصل کیے بغیر غیر مسلح ہو جائے۔ چلو اب مدینہ کے باہر ہی میدان جنگ قائم ہو گا۔" ۲۰

ایک بار آپؐ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کسی نے کہا "تقسیم غنیمت مرضئ الٰہی کے خلاف ہوئی ہے۔" بات بہت سخت تھی مگر آپؐ نے معاف کر دیا۔ کسی اور کی آواز آئی "آپ نے عدل سے کام نہیں لیا فرمایا " اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون کرے گا۔"؟ پھر کہنے والے سے کوئی باز پرس نہ کی۔ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کا کوئی معاملہ آپ کی خدمت میں پیش ہوا آپؐ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ انصاری نے غصہ میں آ کر کہا "اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں فیصلہ کر دیا! آپؐ نے اس گستاخی سے درگزر کیا اور کچھ نہ فرمایا۔ ۲۱

ایک غزوہ میں آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں اور پڑاؤ ڈالیں۔ ایک صحابی نے دریافت کیا۔ "یہ ارشاد وحی سے ہے یا آپ کی ذاتی رائے ہے"؟ آپؐ نے فرمایا "یہ میری ذاتی رائے ہے۔" صحابی نے عرض کیا۔ "پھر تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں فلاں منزل مناسب ہو گی" چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔ ۲۲

حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنے خطبہ خلافت میں اظہار رائے کی باقاعدہ دعوت دی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل نے انہیں ایک مشترکہ خط لکھا۔ جس میں انہیں خلافت کی ذمہ داریوں اور آخرت کی جوابدہی کا احساس دلایا گیا تھا اس خط میں انہوں نے لکھا "ہم

اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہمارے اس خط کو آپ وہ حیثیت نہ دیں جو اس کی واقعی اور حقیقی حیثیت ہے۔ ہم نے یہ خط خیر خواہی اور اخلاص کے جذبہ سے لکھا ہے۔" حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں اپنے طویل جوابی خط میں لکھا "تم دونوں کی تحریریں صداقت سے بھرپور ہیں مجھے ان جیسے مکتوبات کی ضرورت ہے لہٰذا تم مجھے خط لکھتے رہا کرو۔"[۲۳]

حضرت سعد بن عبادہ انصاری نے نہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ حضرت عمرؓ کے۔ وہ نہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے نہ ان کی امامت میں جمعہ ادا کرتے اور نہ حج کرتے۔ ابن قتیبہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

"ان کو کچھ مددگار مل جاتے تو وہ ارباب اقتدار پر حملہ بول دیتے اور اگر کچھ لوگ ان سے جنگ کے لیے بیعت کر لیتے تو وہ ان لوگوں سے جنگ بھی چھیڑ دیتے۔ وہ اپنے اس رویہ پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ ابوبکرؓ نے وفات پائی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو وہ شام چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔"[۲۴]

حضرت سعدؓ بن عبادہ کی اس روش کے باوجود ان سے نہ حضرت ابوبکرؓ نے کوئی تعرض کیا نہ حضرت عمرؓ نے، کیونکہ انہوں نے بیعت نہ کرنے کے باوجود کبھی باغیانہ طرز عمل اختیار کر کے عملاً کوئی مفسدانہ کارروائی نہیں کی۔ حضرت عمرؓ کے دور میں آزادئ اظہار رائے کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی راہ چلتے یا بھری مجلس میں برسر منبر جہاں چاہتا آپ کو ٹوک سکتا تھا۔ آپ سے اپنی شکایت بیان کر سکتا تھا۔ آپ کا مواخذہ کر سکتا تھا اور آپ اظہار رائے کی اس روح کو بیدار رکھنے کے لیے ہمیشہ شکایت کنندہ کی بات پر پوری توجہ دیتے، اس کو کوئی دوسرا درمیان میں ٹوکتا تو آپ سخت ناراض ہوتے اور کہنے والے کو پوری بات کہنے کا موقع دیتے۔ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور اس کی شکایت پر فوری کارروائی عمل میں لاتے۔ عمروؓ بن العاص، مغیرہؓ بن شعبہ، ابوموسیٰؓ اشعری اور سعدؓ بن وقاص جیسے گورنروں کے خلاف آپ نے برسر عام شکایات سنیں اور ان کا تدارک کیا۔ اپنے جسم کی دو چادروں کا حساب بھرے مجمع میں دیا۔ تحدید مہر کا فیصلہ کھلے اجلاس میں واپس لیا۔ اور معترض خاتون کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے

انہیں سیدھی راہ دکھائی۔ مجمع میں اٹھ کر ایک شخص نے کہا کہ تم ٹیڑھی راہ چلے تو ہم تلوار سے تم کو سیدھا کر دیں گے اور آپ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ قوم میں ایسے افراد موجود ہیں کہ اگر میں گمراہ ہونے لگوں تو وہ مجھے راہ راست پر لے آئیں گے۔ غرض آپ کا پورا عہد خلافت آزادی اظہار رائے کے بے شمار واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ان واقعات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آپ نے کبھی کسی ٹوکنے احتساب کرنے اور شکایت بیان کرنے والے کی زبان بندی نہیں کی۔ نہ اس کے لب و لہجہ کے بارے میں کبھی تُنک کر یہ فرمایا کہ تم نے میری شان میں گستاخی کی ہے آپ کے اس رویہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ایک شخص نے سرِ راہ آپ کو مخاطب کر کے کہا "عمر! خدا سے ڈرو" اس نے یہ جملہ کئی بار دہرایا اس پر کسی نے ٹوکا "چپ رہ! تو نے امیر المومنین کو بہت کچھ کہہ سنایا" حضرت عمرؓ نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا "اسے مت روکو یہ لوگ اگر ہم سے ایسی بات کہنا چھوڑ دیں تو پھر ان کا فائدہ ہی کیا؟ اور اگر ہم ان کی باتوں کو نہ قبول کریں تو ہمیں بھلائی سے عاری سمجھنا چاہیئے اور بعید نہیں کہ یہ بات اپنے کہنے والے پر ہی چسپاں ہو جائے"۔ ۲۵

ایک شخص نے آ کر عرض کیا "امیر المومنین! میرے لیے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہر برائی پر کھل کر تنقید کروں، اور خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی لعن طعن کی پروا نہ کروں یا اپنی تمام تر توجہ اپنے ہی نفس کی اصلاح پر مرکوز رکھوں؟" آپ نے جواب دیا :

جو فرد کسی درجے میں بھی مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا سربراہ کار بنایا گیا ہو اسے تو راہ خدا میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرنا چاہیئے اور جس کے سر یہ ذمہ داری نہ ہو اسے چاہیئے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اپنے حکمرانوں کا خیر خواہ رہے"۔ ۲۶

ایک خاتون راہ چلتے آپ پر برس پڑیں اور بولیں "عمر تمہارے حال پر افسوس ہے، میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب تم عمیر کہلاتے تھے اور لاٹھی لیے دن بھر عکاظ میں بکریاں چرا تے

پھرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم عمر کہلانے لگے اور اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھرتے ہو۔ رعایا کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرے گا اور آخرت کے بعید عالم کو اپنے آپ سے بالکل قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہوگا وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہے گا کہ خدا کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ جائے۔"

جارود عبدی، جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے یہ تقریر سن کر بولے آپ نے امیر المومنین کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں فوراً ٹوکا اور فرمایا "یہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں انہیں کہنے دو نہیں شاید علم نہیں کہ یہ خولہ بنت حکیم ہیں ان کی بات تو اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سنی تو عمر کی کیا ہستی ہے کہ وہ ان کی بات نہ سنے۔" ۲۷

شام کے سفر میں جب آپ نے ایک مجمع میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کی وجہ بیان کی تو ایک شخص نے وہیں اٹھ کر کہا۔ "اے عمر! خدا کی قسم تو نے انصاف نہیں کیا۔ تو نے رسول اللہ کے عامل کو برطرف کر دیا، تو نے رسول اللہ کی کھینچی ہوئی تلوار کو نیام میں ڈال دیا۔ تو نے قطع رحم کیا، تو نے اپنے چچیرے بھائی پر حسد کیا۔" حضرت عمرؓ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے اور جب اس شخص نے اپنی بات پوری کر لی تو نرمی سے فرمایا۔ "تم کو اپنے بھائی کی حمایت میں غصہ آگیا۔" ۲۸

آپ کا اعلان عام تھا کہ :

"جس کسی کو کوئی ضرورت پیش آئے یا ظلم کیا جائے یا میری کسی بات پر ناراض ہو تو مجھے اطلاع دے۔ میں بھی تم ہی میں سے ایک فرد ہوں۔" ۲۹

"میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی اور نہیں ہے۔ اللہ نے پکارنے والوں کی پکار سننا میرے ذمہ کیا ہے۔ لہٰذا اپنی شکایتیں مجھ تک پہنچاؤ۔ اگر کوئی شخص مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو ان لوگوں کو اپنی شکایت پہنچاؤ جو مجھ تک پہنچا سکیں۔ ہم اس کا حق بغیر کسی پریشانی کے اسے دلا دیں گے۔" ۳۰

حضرت عثمانؓ نے تو سیاسی اختلاف کے اظہار کی اتنی کھلی چھوٹ دی کہ مخالفین کو طاقت سے کچلنے یا ان کی زبان بند کرنے پر اپنی جان دینے کو ترجیح دی۔ حضرت علیؓ نے بھی اظہار اختلاف کرنے والوں کو کبھی طاقت کے ذریعے نہیں کچلا۔ بلکہ اس کی پوری اجازت دی۔ بیت المال میں سے ان کا جو حصہ نکلتا تھا وہ انہیں باقاعدگی سے ملتا رہا۔ کسی کی جائیداد ضبط نہیں ہوئی وظیفہ بند نہیں ہوا۔ آپ نے خوارج کو جو تحریری پیغام بھجوایا اس میں صاف لکھا تھا کہ:

"تم کو آزادی حاصل ہے، جہاں چاہے رہو البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے، بدامنی پیدا نہیں کرو گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی تم سے سرزد ہوئی تو پھر تمہارے خلاف جنگ شروع کر دوں گا۔" [۳۱]

اظہار رائے کی یہ آزادی صرف خلفائے راشدین ہی کے دور تک محدود نہیں رہی، اس کی جھلک ہمیں مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں ملتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو حکمرانوں کے اندر اختلاف برداشت کرنے کی وہ روح باقی نہ رہی جو ہمیں خلفائے راشدین کے اندر ملتی ہے لیکن اس معاملہ میں انحطاط کے باوجود جرأت اظہار اور احترام اختلاف رائے کی جو مثالیں ہمارے ہاں ملتی ہیں وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ مسلمان اپنے حق سے کبھی کلیتاً دستبردار یا محروم نہیں ہوئے۔

حجاج بن یوسف بنی امیہ کا ظالم ترین حکمران تھا۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا: "کیا تم محمد بن یوسف کو جانتے ہو؟" وہ کہنے لگا ہاں! کیوں نہیں جانتا" حجاج نے کہا "کچھ اس کے چال چلن کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے جواب دیا "وہ تو بڑا ہی بدآدمی ہے اللہ اور اس کے احکام کی سرتابی میں یکتا۔" حجاج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور کرخت آواز میں بولا کمبخت تجھے معلوم نہیں وہ میرا بھائی ہے؟" اس نے اطمینان سے جواب دیا "ہاں ہاں جانتا ہوں مگر

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ میرا رب ہے اور خدا کی قسم وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب و مطلوب ہے جتنا تجھے تیرا بھائی۔" [۳۲]

ایک مرتبہ ہارون الرشید حج کے لیے گیا۔ دوران طواف عبداللہ عمری کی نظر پڑ گئی انہوں نے آواز دی "اے ہارون! ہارون نے آگے بڑھ کر جواب دیا" عم محترم! خاکسار حاضر ہے"۔ عبداللہ عمری نے پوچھا "بتا سکتے ہو حج کے لیے جو لوگ آئے ہیں ان کی تعداد کیا ہے۔ ہارون بولا "بے شمار، صحیح تعداد تو خدا ہی جانتا ہے" عبداللہ عمری نے کہا "اے شخص! اس حقیقت کو نہ بھول کہ اس انبوہ خلائق میں سے ہر ایک خدا کے سامنے صرف اپنے لیے جواب دہ ہے اور تو ان سب کا جواب دہ۔ ذرا سوچ، محاسبے کے وقت تجھ پر کیا گزرے گی؟" ہارون یہ سن کر رونے لگا اور عبداللہ عمری سے کچھ نہ کہا۔ [۳۳]

اسی ہارون الرشید کو قاضی ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب الخراج کے مقدمہ میں جو نصیحتیں کی ہیں وہ جرات اظہار رائے کا ایک شاہکار ہے۔ ہارون ایک بار خطبہ دے رہا تھا ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا "خدا کی قسم! تم نے مال کی تقسیم برابر کی اور نہ عدل و انصاف سے کام لیا۔ بلکہ اس کے بجائے فلاں فلاں برائیاں کیں۔ ہارون نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ نماز کے بعد قاضی ابو یوسف کو طلب کیا گیا۔ ہارون نے ان سے کہا کہ اس شخص نے آج ایسی گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ وہ اس وقت سخت غصہ میں تھا اور گرفتار ہونے والا شخص جلادوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کی مثالیں پیش کر کے بڑی جرأت سے کہا "آپ اسے سزا نہیں دے سکتے"۔ اسوۂ حسنہ کا حوالہ سامنے آتے ہی ہارون کا غصہ جاتا رہا اور اس نے اس شخص کو فوراً چھوڑ دینے کا حکم دیا۔" [۳۴]

ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر، خراسان کا فرمانروا تھا۔ امام غزالیؒ اس سے ملے اور اسے مخاطب کر کے کہا "افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی

جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوق ہائے زریں کے بار سے"۔ ۳۵؎

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کو ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ بادشاہ کی دست بوسی کریجئے، قصہ رفع دفع ہو جائے گا اور آپ کو ترقی کے ساتھ عہدہ پر بحال کر دیا جائے گا۔ شیخ نے کہا :

"اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں۔ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو اور میں کسی اور عالم میں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو"۔ ۳۶؎

انہی شیخ عزالدین نے عین عید کے روز جب کہ جشن منایا جا رہا تھا اور لوگ زمین بوس ہو کر نذرانے پیش کر رہے تھے، بھرے دربار میں بادشاہ کو پکار کر کہا " ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لیے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے"؟ بادشاہ نے پوچھا "کیا یہ واقعہ ہے"؟ شیخ نے بلند آواز سے کہا "ہاں، فلاں میخانے میں شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں۔ اور تم یہاں داد عیش دے رہے ہو"۔ بادشاہ نے فوراً شراب خانہ بند کرنے کا حکم دیا ۳۷؎

اس طرح کے سینکڑوں واقعات تاریخ اسلام میں موجود ہیں جہاں کلمۂ حق پوری جرأت مندی سے، انتہائی تند و تیز لہجہ میں اور بھری مجلسوں اور درباروں میں بلند کیا گیا۔ مطلق العنان بادشاہوں نے بھی ان کو صبر و تحمل سے سنا اور ایسا کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں دی۔

آج کے جمہوری دور میں خود عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے کتنے حکمراں ہیں، جو اپنی کھلی کچہریوں اور عام جلسوں میں لوگوں کو یہ انداز تخاطب اختیار کرنے اور اپنا بے لاگ محاسبہ کرنے کی اجازت دیں گے؟

اسلام میں آزادئ اظہار رائے کی حدود کا تعین کرتے ہوئے علامہ شوکانی لکھتے ہیں :

" شریعت ان لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو امام کے خلاف بغاوت کا عقیدہ

رکھتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے اس عقیدے کو عملی شکل دینے کے لیے کوئی جنگ نہ برپا کریں یا اس کے لیے کوئی تیاری نہ شروع کر دیں۔ کیونکہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ جب وہ بغاوت کریں تب ان کو قتل کرو۔" ۳۸

" اگر کوئی گروہ کسی طرح کی باغیانہ رائے کا اظہار کرے جس طرح کی رائے خوارج رکھتے تھے تو اس کی بنیاد پر اس کا قتل جائز نہیں ہوگا۔ قتل صرف اس صورت میں جائز ہوگا جب ان کی تعداد زیادہ ہو جائے، وہ مسلح ہو جائیں اور لوگوں کے جان و مال سے تعرض شروع کر دیں۔" ۳۹

ان حدود سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں محض تشکوک و شبہات کی بنا پر شدید سے شدید اختلاف کے برملا اظہار پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ تا وقتیکہ عملاً کسی باغیانہ سرگرمی کا مظاہرہ نہ ہو۔ اسلامی ریاست میں کوئی حکومت آزادی اظہار رائے پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتی۔ کیونکہ اس کا مطلب خدا کے دیئے ہوئے حق کو سلب کرنا اور خود مقتدر اعلیٰ کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کرنا ہوگا۔

۹۔ آزادیٔ ضمیر و اعتقاد

اسلامی ریاست میں ہر شخص کو ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہوگی۔

قرآن کا فیصلہ ہے :۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (البقرہ ۲۔ ۲۵۶)

"دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔"

یعنی صحیح بات تو وہی ہے جس کی طرف اسلام دعوت دے رہا ہے۔ اور اس نے غلط و گمراہ کن خیالات کو بھی چھانٹ کر الگ کر دیا ہے۔ تاکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز واضح ہو جائے۔ اب اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مسلمانوں کی کوشش تو یہی ہے کہ دنیا اسلام کی دعوت حق کو قبول کر لے لیکن اس معاملہ میں جبر

کسی پر نہیں کیا جائے گا۔ جس کا جی چاہے وہ دلائل کی بنیاد پر اسے قبول کرے اور جو نہ چاہے وہ اس کی قبولیت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ قرآن میں حضور سے ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (یونس : ۹۹)

"اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ زمین میں سب مومن فرمانبردار ہی ہوں تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟" ایک اور جگہ دعوتِ حق کے سلسلہ میں آپؐ کی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ (الغاشیہ۔ ۲۱-۲۲)

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! نصیحت کئے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو کچھ اُن پر جبر کرنے والے نہیں۔"

یہی بات سورۃ ق آیت ۴۵، سورۃ یونس آیت ۱۰۸ سورۃ کہف آیت ۲۹، سورۃ انعام آیت ۱۰۷، سورۃ عنکبوت آیت ۴۶ اور سورۃ زمر آیت ۴۱ میں کہی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے جتنے انبیاء کرامؑ مبعوث فرمائے ان سب کی ذمہ داری بس اتنی ہی تھی کہ وہ پیغامِ حق بلا کم و کاست پہنچا دیں انہوں نے اپنے مشن کے بارے میں خود کہا ہے،

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (یٰسٓ۔ ۱۷)

"اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔"

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (النحل-۸۲)

"اے محمدؐ! تم پر صاف صاف پیغامِ حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں" سورۃ شوریٰ میں حضورؐ کو ہدایت کی گئی کہ آپؐ دین کو جھٹلانے والے کفار اور مشرکین سے کہہ دیں۔

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ

(الشوریٰ - ۱۵)

"اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں"۔

یہی مضمون سورۃ الکٰفرون میں پہلی سے آخری آیت تک یوں بیان کیا گیا ہے:-

"کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔

اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔

تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین ۔"

اس معاملہ میں رواداری کی بہترین مثال حضرت عمرؓ کے غلام وسق رومی کا واقعہ ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ بن خطاب کا غلام تھا وہ مجھ سے کہا کرتے تھے "مسلمان ہو جا ، اگر تو اسلام قبول کرلے گا تو میں تجھے مسلمانوں کی امانت کا کوئی کام سونپ دوں گا۔ کیونکہ میرے لئے یہ روا نہیں کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی امانت کے کام پر متعین کر دوں ۔" مگر میں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس پر وہ کہا کرتے، لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، پھر جب ان کی وفات کا وقت آن پہنچا، تو

انہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور کہا "تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔" ع۴۰

حضرت سعدؓ بن عبادہ انصاری کا واقعہ بیان کیا جا چکا ہے وہ آخر وقت تک خلافت کے معاملہ میں اپنی رائے پر جمے رہے مگر ان سے نہ حضرت ابوبکرؓ نے جبراً بیعت لی نہ حضرت عمرؓ نے۔ مسلمانوں کے درمیان اختلافِ مسلک کی آزادی ہمیشہ برقرار رہی خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں امیر اور شوریٰ کے فیصلوں سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوتا اور وہ رائے کی حد تک اپنے مسلک پر قائم رہتے مگر اطاعت امیر کے فیصلے ہی کی کرتے۔ اس کی ایک عمدہ مثال حضرت عثمانؓ کا منیٰ میں نماز کے قصر نہ کرنے کا واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کے اس مسلک سے شدید اختلاف کیا لیکن جب نماز پڑھی تو بحیثیت امیر انہی کے پیچھے اور انہی کے مسلک کے مطابق پڑھی۔ یہ اختلاف آج تک باقی ہے۔ ع۴۱

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کے کلیسا کے ایک گوشے میں نماز پڑھی، پھر خیال آیا کہ مسلمان میری نماز کو حجت قرار دے کر کہیں عیسائیوں کو نکال نہ دیں، اس لئے ایک خاص عہد لکھ کر بطریق کو دیا۔ جس کی رو سے کلیسا عیسائیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی مسلمان کلیسا میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں"۔ ع۴۲

آزادیٔ عقیدہ کے معاملہ میں اسلام نے صرف یہی ہدایت نہیں دی کہ تم کسی پر جبر نہ کرو، بلکہ یہ حکم بھی دیا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ کرو۔ اس کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانعام ۔ ۱۰۸)

"جن معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں انہیں برا نہ کہو۔"

مذہبی بحث مباحثہ میں اکثر لوگ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے

ہیں اور اپنے مخالف کے عقائد کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور ان کے معبودوں کے ساتھ ان کی مقدس اور بزرگ ہستیوں کو بھی برا بھلا کہنے لگتے ہیں مگر مسلمانوں کو سختی سے ہدایت کی گئی ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (العنکبوت - ۴۶)

"اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقے سے۔"

اس ایک لفظ "احسن" میں شرافت و شائستگی اور تحمل و رواداری کی جملہ صفات آجاتی ہیں۔ یہ حکم صرف اہلِ کتاب ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام اہلِ مذاہب کے لئے ہے۔

۱۰۔ حقِ مساوات

قرآن دنیا کے تمام انسانوں کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ (الحجرات - ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

یہی بات خطبہ حجۃ الوداع میں زبانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں ادا ہوئی:

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر ماسوا تقویٰ کے۔"

"تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔" (بخاری، مسلم)

قرآن اور پیغمبرِ اسلام کے ان ارشادات کی رو سے اسلامی ریاست کی حدود

میں بسنے والے تمام انسان قانون کی نظر میں مساوی الحیثیت ہوں گے۔ معاشرتی زندگی میں بھی ان کے درمیان تقویٰ کے سوا اور کوئی معیار فضیلت نہیں ہوگا۔ اسلام نے خون کے رشتہ کی بنیاد پر پوری بنی نوعِ انسان کو ایک برادری بنا دیا ہے۔ اور ایمان کی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دے کر ان کے درمیان کامل مساوات قائم کر دی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ـ ۱۰)

"تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مسلمانوں ہی کو نہیں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔

"میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔۔"
(ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ)

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خلافت راشدہ اور بعد کے زمانوں میں ہمیں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن میں آقا اور غلام، حکمران اور شہری، امیر اور غریب اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان انصاف کے معاملہ میں اصولِ مساوات پر سختی سے عمل کیا گیا۔ حضورؐ نے حقوق و معاملات میں ہمیشہ اپنی ذات کو دوسروں کے برابر رکھا۔ قریش کی ایک عورت فاطمہ نے چوری کی۔ حضرت اسامہؓ نے اُسے معاف کر دینے کی سفارش کی تو آپؐ نے سختی کے ساتھ فرمایا:۔۔

"اے اسامہ! اللہ کی مقرر کردہ سزا میں سفارش کر کے مُداخلت کرتے ہو؟ خبردار! آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔" پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو مسجد میں جمع کرو۔ مسلمان جمع ہو گئے تو آپؐ نے اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئی ہیں کہ وہ کم درجے کے

لوگوں کو تو قانون کے مطابق سزا دیتی تھیں اور اونچے درجے کے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی ایسا کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔" (بخاری، مسلم)

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (المائدہ۔۸)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کرے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ کسی شخص کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی تھی لیکن اللہ کے اس حکم کو اسلامی معاشرہ میں عملاً نافذ کرنے کے معاملہ میں آپؐ اس درجہ محتاط و فکر مند تھے کہ لوگوں سے بار بار فرماتے، جس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہو وہ مجھ سے بدلہ لے لے چنانچہ حیاتِ طیبہ میں ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ جن میں آپؐ نے خود کو بدلہ کے لئے پیش کیا۔ حضرت سوادؓ بن عمر کہتے ہیں کہ میں ایک روز رنگین کپڑے پہن کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ حضورؐ نے مجھے دیکھ کر "حط، حط" فرمایا اور چھڑی سے ٹھوکا دیا۔

میں نے کہا:

"یا رسول اللہ! میں تو قصاص لوں گا" آپؐ نے فوراً شکم مبارک کھول کر میرے سامنے کر دیا۔" ۴۳

اسی طرح آپؐ نے میدانِ بدر میں حضرت سوادؓ بن غزیہ کو، ایک مجلس میں گفتگو

کے دوران حضرت اسیدؓ بن حضیر کو اور تقسیم غنیمت کے وقت ایک صحابی کو چھڑی کی نوک سے پہنچنے والی تکلیف کا بدلہ لینے کی پیش کش کی۔[۴۴]

حضورؐ کی قائم کردہ اِنہی مثالوں کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت عمرؓ نے والئ مصر حضرت عمروؓ بن العاص کے اس اعتراض پر کہ "امیر المومنین! فرض کیجیئے کہ ایک شخص کہیں کا گورنر ہے اور کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اُس سے بھی قصاص لیں گے؟" فرمایا تھا کہ:

"اُس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اس سے بھی مظلوم کو قصاص دلاؤں گا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ آپؐ اپنی ذات کو بھی قصاص کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔"[۴۵]

چنانچہ آپؓ نے اپنے دس سالہ عہدِ خلافت میں اس اصولِ مساوات پر سختی سے عمل کیا۔ جبلہ بن ایہم غسانی نے جب ایک بدوی کے تھپڑ مارنے پر قصاص سے بچنے کے لئے یہ دلیل پیش کی کہ:

"امیر المومنین! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں" تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "اسلام نے آپ دونوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ آپ صرف تقویٰ اور طہارت سے اس پر فضیلت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور کسی صورت سے نہیں۔"[۴۶]

آپؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، ان کے بیٹے عبداللہ، والئ حمص عبداللہ بن قرط، اور والئ بحرین قدامہ بن مظعون کے خلاف سزا کے احکامات اور خود اپنے بیٹے عبدالرحمٰن پر حد جاری کر کے قانون کی نظر میں مساوات کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیر تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔"[۴۷]

حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں آپ کا مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر ہونا، ان کی تعظیم پر اظہار ناراضگی فرمانا اور یہ کہنا کہ "یہ تمہارا پہلا ظلم ہے" مدعی مقدمہ حضرت ابیؓ بن کعب کے برابر بیٹھنا اور گواہ پیش نہ کرنے پر قسم کے لئے رضامند ہو جانا اور پھر ابیؓ بن کعب کو حضرت زیدؓ بن ثابت کے اس مشورے پر کہ امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو، آپ کا برہم ہونا اور یہ فرمانا کہ "زید! جب تک تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر دونوں برابر نہ ہوں تم منصبِ قضا کے قابل نہیں سمجھے جا سکتے" اسلام میں عدالتی مساوات کی ایک روشن مثال ہے۔ اسی نوعیت کی دوسری مثال حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں قائم کی۔ زرہ کی چوری کے مقدمہ میں آپ مدعی کی حیثیت سے قاضی شریحؒ کی عدالت میں پیش ہوئے۔ مدعا علیہ ایک ذِمّی تھا قاضی شریحؒ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:-

"ابو تراب! اپنے فریق کے برابر بیٹھئے۔"

قاضی صاحب نے محسوس کیا کہ یہ بات حضرت علیؓ کو بری لگی ہے۔ وہ بولے "ابو تراب! شاید آپ کو میری یہ ہدایت ناگوار گزری حالانکہ اسلام کی قانونی اور عدالتی مساوات کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اپنے فریق کے برابر بیٹھیں"

حضرت علیؓ نے جواب دیا "مجھے یہ چیز بری نہیں لگی کہ آپ نے مجھے فریقِ مقابل کے برابر بیٹھنے کی ہدایت کی، بلکہ مجھے جو چیز ناگوار گزری وہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے کنیت کے ساتھ خطاب کیا اور اس طرح میرے فریق کے مقابلے میں میری عزت افزائی کی یہ میرے فریق کے ساتھ صریح ناانصافی ہے۔" ۴۸

حضرت عمرؓ نے لوگوں کو عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ ایک شخص کو عورتوں کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو دُرّے لگائے اس نے کہا:

"خُدا کی قسم اگر میں نے اچھا کام کیا تو تم نے مجھ پر ظلم کیا۔ اور اگر میں نے بُرا کام کیا تو تم نے مجھے اس کی اطلاع نہ دی تھی۔"

آپ نے فرمایا:

"کیا تُو میری ہدایت کے وقت موجود نہ تھا؟" اس نے کہا "نہیں"

آپ نے دُرّہ اس کے سامنے ڈال دیا اور کہا "مجھ سے بدلہ لے لو" اس نے کہا "آج نہیں لیتا" آپ نے فرمایا "اچھا تو معاف کر دے" وہ بولا "معاف بھی نہیں کرتا"

اس کے بعد دونوں جُدا ہو گئے۔ اگلے دن وہ شخص ملا تو حضرت عمرؓ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا:

"امیر المومنین! شاید آپ پر میری بات کا اثر ہوا ہے؟"

آپ نے کہا "ہاں" اُس نے کہا "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو مُعاف کر دیا۔" ۴۹

قرآن مجید میں فرعون کے کردار کی جن پستیوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اُس نے اپنی قوم کو اعلیٰ و ادنیٰ اور شریف و رذیل کے مختلف طبقوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اور ان میں سے ایک گروہ کو وہ اپنے ظلم و ستم کے شکنجے میں کسے رکھتا اور اُسے ذلیل و خوار کرتا تھا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (القصص)

"حقیقت یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔"

اس کے برعکس اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بلند کو پست اور پست کو بلند کر کے

معاشرہ میں توازن پیدا کیا۔ اور لوگوں کے درمیان مساوات قائم کی۔ حضرت عمرؓ کو جب مکہ کے گورنر نافع بن الحارث نے بتایا کہ میں آزاد کردہ غلام ابن البزیٰ کو اپنا نائب مقرر کرکے آیا ہوں تو آپ نے ان کی صفات سنیں اور پھر خوش ہو کر فرمایا :

"کیوں نہ ہو، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ اللہ اس کتاب (قرآن) کے ذریعہ بعض کو اوپر اٹھائے گا اور بعض کو نیچے گرائے گا۔" ؎۵۰

۱۱۔ حصولِ انصاف کا حق

اسلامی ریاست کا مقصدِ وجود ہی قیامِ عدل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو ہدایت فرماتا ہے کہ آپؐ یہ اعلان کر دیں :- وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (الشوریٰ ۔ ۱۵)

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں" قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ۔ (الاعراف ۲۹) "(اے محمدؐ) ان سے کہو کہ میرے رب نے تو راستی اور انصاف کا حکم دیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں انبیاء کرام کی بعثت الہامی کتابوں کے نزول اور مسلمانوں کی سیاسی و جنگی قوت کا واحد مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں عدل قائم ہو۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (الحدید ۔ ۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی۔ تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور لوہا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔ یہ اسی لئے کیا گیا کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔"

حضورؐ کو اور آپ کے بعد مسلمانوں کو جس عدل کے قیام پر مامور کیا گیا ہے :

اس کا معیار بھی پوری شرح و لبسط کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ تاکہ اس "عدل" کا مفہوم متعین کرنے اور خدا کی منشاء کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (النساء - ۱۳۵)

"اے ایمان لانے والو! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ تم جو کچھ کرتے ہوئے اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

اس آیت میں نہ صرف عدل کا مفہوم واضح کر دیا گیا۔ بلکہ قیام عدل کی تمام ضروری شرائط بھی گنوا دی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی ساقط ہو گی تو عدل، عدل نہ رہے گا۔ ظلم بن جائے گا۔ یہ شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) عدل کو نہ صرف قائم کرو بلکہ اس کا پرچم بلند کرو، جہاں اسے دبتا دیکھو وہاں اسے اونچا اٹھانے کے لئے پوری قوت لگا دو۔

(۲) گواہی کسی فریق مقدمہ کی ہار یا جیت کے لئے نہیں صرف خدا کی خوشنودی کے لئے دو۔ کیونکہ سچی گواہی کے بغیر عدل کا قیام ناممکن ہے۔ سچی گواہی کی زد خواہ تمہارے اپنے مفاد پر پڑتی ہو یا تمہارے والدین اور قریبی عزیزوں کے مفاد پر، اس کی پروا نہ کرو۔

(۳) گواہی دیتے وقت رشتہ کی قربت کے علاوہ فریقین کے مقام و منصب اور ان کی معاشی و معاشرتی حیثیت کو بھی نہ دیکھو۔ کیونکہ تم اللہ سے بڑھ کر کسی شخص کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ گواہی میں امتیاز برتنا خیر خواہی نہیں بلکہ صریح ظلم اور بد خواہی ہے۔

(۴) گواہی دیتے وقت حقائق کو جوں کا توں بیان کر دو اس میں اپنی خواہشات کی آمیزش نہ کرو۔ خواہشات واقعات کی صورت مسخ کر دیتی ہیں اور گواہی کا سننے والا حقائق کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا اور یہ چیز عادلانہ فیصلہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

(۵) اگر تم نے کسی فریق کو بچانے یا کسی کو سزا دلوانے کی غرض سے گول مول بات کی کچھ باتیں چھپا گئے کچھ اپنی طرف سے ملا گئے اور یوں کھری اور بے لاگ گواہی سے گریز کر کے عدل کے بجائے ظلم اور ناانصافی کا ذریعہ بن گئے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ سے تمہاری اندرونی کیفیت چھپی نہ رہے گی اور جب اس کے حضور پیش ہو گے تو اپنے کئے کی سزا سے نہ بچ سکو گے۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا :۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (المائدہ ۸)

"کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔"

قرآن مجید کے اسی حکم کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کے نام ایک خط میں لکھا تھا :۔

"مجلسِ قضا میں نہ مول بھاؤ کرو، نہ کسی سے جھگڑو نہ کچھ خرید و فروخت کرو، اور کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسی حالت میں فیصلہ نہ کرو کہ تم غصے میں ہو۔" ۵۱

غرض صفتِ عدالت کے لئے ضروری ہے کہ انصاف کرنے والا ایسے تمام

داخلی اور خارجی محرکات سے پاک ہو، جو ایسے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب انصاف کرنے بیٹھو تو اس کا پورا پورا حق ادا کر دو۔

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء ۵۸)

"اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (المائدہ ۴۲)

"اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (الانعام ۱۵۲)

"اور جب بات کہو، انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا ہی کیوں نہ ہو"

عدل کے بارے میں قرآن نے یہ اصول بھی طے کر دیا:۔

أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (المائدہ ۴۵)

"جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔"

یہی ضابطہ دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا:۔

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ ۝ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشوریٰ ۴۰-۴۳)

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا

اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ لوگ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔"

اس آیت میں عدل کے لیے "جیسے کو تیسا" کا کھرا اصول پیش کرنے کے ساتھ ہی مظلوم کو جواباً زیادتی سے باز رہنے کی ہدایت اور معاف کر دینے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ یعنی وہ نقصان کے مساوی بدلہ لے لے تو یہ عین عدل ہوگا۔ نقصان سے زیادہ بدلہ لے گا تو یہ ظلم ہوگا۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اگر مظلوم عفو و درگذر سے کام لے تو یہ اس کی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہوگی اور اللہ کے نزدیک نہایت پسندیدہ بات۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ ج (النحل۔ ۹۰)

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔"

لیکن "احسان" سراسر ایک انفرادی فعل ہے۔ اسلامی ریاست کی عدلیہ استغاثہ پیش ہونے پر عدل ہی کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ البتہ مظلوم مستغیث کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ فریقِ مخالف پر سے اپنا دعویٰ واپس لے لے اور اپنے اس احسان کا اجر اللہ کے ہاں پائے۔ عدلیہ کے لئے تو صاف یہ حکم ہے :-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ ۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۷)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، وہی ظالم

ہیں، وہی فاسق ہیں۔"

اس حکم کے مطابق فیصلہ کرنے والا خواہ کوئی فرد ہو، ثالث ہو، پنچایت ہو، باقاعدہ عدالت ہو، ان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ کریں۔

حضورؐ کا ارشاد ہے:۔

"امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

نیز آپؐ نے فرمایا:۔

"مخلوق میں خدا کو سب سے زیادہ محبوب امام عادل ہے۔ اور خدا کے نزدیک مبغوض ترین آدمی امام ظالم ہے۔" (مسند احمد)

نبی اکرمؐ اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے قرآن کے ان احکامات پر جس طرح عمل کیا۔ اس کی مثالیں گذشتہ صفحات میں نظر سے گزر چکی ہیں۔ حضورؐ نے اپنی ذات کو قصاص کے لئے پیش کیا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اپنے زمانہ خلافت میں فریق مخالف کی طرح عدالتوں میں حاضر ہوئے، حضرت عمرؓ نے بیٹے پر حد جاری کی، اپنے آپ کو بدلے کے لئے پیش کیا۔ عام شہریوں کی شکایت پر اپنے گورنروں کو سزائیں دیں اور حصول انصاف کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹیں دور کر کے دادرسی کو انتہائی سہل بنا دیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو قاضی مقرر کر کے انتظامیہ سے عدلیہ کی علیحدگی کا اہتمام کیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے باقاعدہ ایک ادارے (Institution) کی شکل دی اور خود عدالت میں حاضر ہو کر انتظامیہ پر عدلیہ کی بالادستی کو عملاً قائم کیا۔ آپ کے بعد مسلمانوں کی پوری تاریخ میں یہی نظام قائم رہا۔ اس نظام کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ انصاف بلاقیمت ملتا تھا۔ اس میں نہ کورٹ فیس تھی اور نہ وکیل کا معاوضہ۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد تک یہی نظام برقرار تھا۔ اور اُن مسلم ممالک میں جو نوآبادیاتی تسلط سے آزاد

رہے۔ آج تک یہی نظام موجود ہے۔ مثلاً سعودی عرب میں آج بھی انصاف امیر غریب سب کے لئے یکساں اور بلاقیمت مہیا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی بھی نظامِ عدل ایسا نہیں ہے جس نے انصاف کو قابلِ فروخت شے بنا کر "قانون کی نظر میں مساوات" اور "سب کے ساتھ یکساں انصاف" کے بلند بانگ دعووں کو بے معنی نہ بنا دیا ہو۔ آج کتنے لوگ ہیں جو ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کی فیس اور ان میں پیش ہونے والے وکلاء کا بھاری معاوضہ ادا کرنے کی سکت رکھتے ہیں؟ اور اگر وہ اس کی سکت نہیں رکھتے تو کیا ان پر ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے عملاً بند نہیں ہو گئے؟ اور وہ حصولِ انصاف کی سہولتوں سے محروم ہو کر صاحبِ وسائل لوگوں کے مقابلے میں قانون کے تحفظ اور اس کی اعانت سے خود بخود محروم نہیں ہو گئے؟

اسلامی ریاست کا عدالتی نظام اس تاجرانہ اندازِ فکر سے یکسر پاک ہے۔ یہاں قیامِ عدل کے مصارف تمام تر ریاست کے ذمہ ہیں۔ فریادی کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دے۔ اور ایک عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہ ہو تو عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ تک جا پہنچے۔ اس پر مالی بار کہیں نہیں ڈالا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح کا بار اس پر دوہرا ظلم ہو گا کہ وہ ظلم کی شکایت لے کر آئے اور پھر مالی پریشانیوں کا مزید ظلم برداشت کرے۔

علاوہ ازیں یہ مالی بار عدالتوں سے رجوع کے معاملہ میں غریب اور نادار لوگوں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور مالداروں کو ان پر برتری عطا کر کے ظلم و ستم کے معاملہ میں مزید جری بنا دیتا ہے۔

اسلام نے امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ اور بے اثر و بااثر سب کو عدلیہ میں مساوی الحیثیت بنا کر قانون کی نظر میں برابری کے اصول کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ قابلِ نفاذ اور انصاف کے بنیادی حق کو ہر شہری کے لئے سہل الحصول بنا دیا ہے۔

۱۲۔ معاشی تحفظ کا حق

سورۃ فاتحہ کے دعائیہ کلمات کے بعد جب ہم سورۃ بقرہ سے قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز کرتے ہیں۔ تو ابتدائی آیات ہی میں قرآن اور اس پر ایمان لانے والوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ۔ ۱-۳)

"الف، لام، میم، یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے اُن پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

ان آیات پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب پر اور اس میں بیان کردہ غیب کی باتوں مثلاً وجودِ باری تعالیٰ، تقدیر، تخلیقِ کائنات، تخلیقِ آدم، جنت دوزخ، آخرت اور جن و ملائکہ کے وجود وغیرہ پر ایمان لاتے ہی انسان پر دو حقوق واجب ہو جاتے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان قائم ہونے والے تعلق کے دائرہ میں اوّلین حق یہ ہے کہ اپنی پیشانی خدا کے آگے جھکائی جائے اور نماز قائم کر کے اپنی عبدیت اور خدا کی معبودیت کا اقرار دن میں پانچ مرتبہ اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔

نماز کے فوراً بعد ایمان لانے والوں پر انسان اور انسان کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کے دائرہ میں جو اوّلین حق قائم ہوتا ہے وہ انفاق ہے۔ یعنی خدا کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کے حاجت مندوں کی کفالت۔ یہ ترتیبِ حقوق صرف اسی ایک آیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ پورا قرآن صلوٰۃ کے فوراً بعد زکوٰۃ کے لاحقہ کو ساتھ ساتھ لئے آگے بڑھتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر وہ صلوٰۃ کو ایسی صورت میں بالکل ضائع قرار دیتا ہے جہاں نماز پڑھنے والے نے اپنے کسی حاجت مند بندے کی ضرورت پوری کرنے

میں بخل سے کام لیا ہو۔
سورہ الماعون کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے، وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے انکار کرتے ہیں"

اس سورۃ کی پہلی آیت اب سورہ بقرہ میں بیان کردہ حقیقت کو ایک دوسرے زاویہ سے ہمارے سامنے لا رہی ہے۔ جو شخص غیب پر یعنی آخرت کی جزا و سزا پر ایمان نہیں لائے گا۔ اس سے نہ خدا کا حق (صلوٰۃ) ٹھیک طور پر ادا ہوگا اور نہ وہ انفاق کے ذریعہ اپنے حاجتمند بھائیوں کی کفالت کا حق ادا کرے گا۔ نماز ادا کرے گا تو سستی اور کاہلی سے اور محض دکھاوے کی خاطر اور اللہ کے دیئے ہوئے مال پر سانپ بن کر بیٹھ جائے گا۔ یتیم کو دھکے دے گا۔ مسکین کو نہ صرف یہ کہ خود کھانا نہیں دے گا۔ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب نہیں دے گا اور کوئی حاجت مند معمولی ضرورت کی چیز بھی مانگے گا تو یہ صاف انکار کر دے گا۔ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کو صاف وعید سنائی جا رہی ہے کہ تمھاری یہ نماز تمھارے کسی کام نہ آئے گی، یہ تمھارے منہ پر دے ماری جائے گی اور خدا کے بندوں کا حق ادا نہ کرنے کے جرم میں تمھیں جس تباہی کا سامنا کرنا ہوگا یہ نماز تمھیں اس سے بچا نہ سکے گی۔

یہ ہے اسلام میں انسان کے معاشی مسئلہ کی اہمیت اور اسے حل کرنے کے لیے مقتدرِ اعلیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو دی گئی ہدایات کی نوعیت۔ قرآن مجید میں ۳۰ سے زائد مقامات پر اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر ہے اور ۲۰ سے زائد مقامات پر انفاق کا۔ بدقسمتی سے خود مسلمانوں نے نہ جانے کس بناء پر ارکانِ اسلام کے زیرِ عنوان قائم کردہ ترتیب میں زکوٰۃ کو پانچویں نمبر پر رکھا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن نے اسے کلمہ اور نماز کے

بعد تیسرے درجے پہ رکھتا ہے اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے روزہ و حج اس کے بعد آتے ہیں۔

اسلام میں معاشی مسئلہ کی اہمیت پر اس تمہیدی گفتگو کے بعد اب دیکھئے کہ انسان کو معاشی تحفظ فراہم کرنے کے لیے خدا کے دین میں انفاق پر کس قدر زور دیا گیا ہے، اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں اسلامی ریاست پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ انفاق کے احکام اور اس کی ترغیب سے متعلق سب سے پہلے چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج۔ ۲۴)

"جن کے (مسلمانوں کے) مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے"۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات۔ ۱۹)

"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محروم دونوں کا حق ہے"۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل۔ ۲۰)

"نماز قائم کرو، زکواۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو"۔

سورہ بقرہ میں یہ فرما کر کہ "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلیے یا مغرب کی طرف" ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (البقرہ۔ ۱۷۷)

"(نیکی یہ ہے کہ) اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکواۃ دے"۔

اس آیت میں ترتیبِ احکام پر غور کیجئے۔ یہاں ایمان کی جو شرائط گنوائی جا رہی ہیں ان میں دل پسند مال کے خرچ کا ذکر اقامتِ صلواۃ سے بھی پہلے ہے۔ اسی سورۃ میں مزید فرمایا گیا:

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ

وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ؕ (البقرہ-۲۱۵)

"لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو۔"

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ۬ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (البقرہ-۲۱۹)

"اور لوگ پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو، جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔"

انفاق پر غیر معمولی زور دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

كَيۡ لَا يَكُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ ؕ (الحشر-۷)

"تاکہ وہ تمھارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔"

پھر انفاق کی صورت میں انسان کو مال میں کمی آجانے اور مفلس ہو جانے کا جو دھڑکا لگا رہتا ہے اس سے دل و دماغ کو نجات دلانے کے لیے فرمایا گیا:

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ (البقرہ-۲۷۲)

"اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔"

وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (البقرہ-۲۷۴)

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔"

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ مال خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بڑھتا ہے، یہ خسارے کا نہیں سراسر نفع کا سودا ہے، یہ لینے والے پر نہیں، خود دینے والے کے اپنے نفس پر احسان

ہے۔ کیونکہ اس کا نفع کئی گنا ہو کر اسی کی طرف پلٹ آئے گا اور پھر آخرت میں اللہ تعالےٰ کی خوشنودی اور اس کی سرخروئی کا ذریعہ بن کر ابدی راحت وسکون کے اس عظیم انعام کا مستحق بنائے گا جس کا حصول ہی مسلمان کا اصل مقصدِ حیات ہے اس کے برعکس مال جمع کرکے رکھا گیا تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ہلاکت وبربادی کا سبب بنے گا۔ اس مضمون کی چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

(۱) "اور (مومنین) اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی رضاجوئی کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالےٰ انھیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انھیں تازگی اور سُرور بخشے گا۔"

(الدھر، ۸ تا ۱۱)

(۲) "جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے مال کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔"

(البقرہ - ۲۶۱)

(۳) "جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو۔"

(البقرہ : ۲۶۵)

(۴) "تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ اللہ اس سے کئی گنا بڑھا کر واپس کر دے! گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔" (البقرہ - ۲۴۵)

(۵) "دردناک سزا کی وعید سنا دو ان لوگوں کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔"

(التوبہ: ۳۴ - ۳۵)

(۶) "جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے، ہرگز نہیں۔ یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔"

(آل عمران - ۱۸۰)

(۷) جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا، ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔" (الھمزۃ - ۲ تا ۴)

انفاق پر غیر معمولی زور دینے اور بخل سے بچنے کی تلقین کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کے لیے خرچ کی راہِ اعتدال بھی متعین فرما دی ہے تاکہ وہ افراط و تفریط کا شکار نہ ہوں۔

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الاعراف - ۳۱)

"اے بنی آدم ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

یہاں زینت سے آراستہ ہونے کا مطلب ہے مناسب لباس جو صرف ستر پوشی ہی کی ضرورت پوری نہ کرے بلکہ صاف ستھرا بھی ہو اس کے علاوہ کھانے پینے کی جو فطری ضروریات ہیں وہ بھی پوری کی جانی چاہئیں۔ البتہ لباس خوراک اور دوسری ضروریاتِ زندگی کے معاملہ میں اسراف نہ کیا جائے۔ کیونکہ اللہ کو اپنے دیئے ہوئے مال کا ضیاع سخت ناپسند ہے۔ اسی آیت کے فوراً بعد نفس کشی اور رہبانیت کے منفی رجحانات کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"اے محمدؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا، جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔" (الاعراف - ۳۲)

ان عمومی احکام و ہدایات کے ساتھ افرادِ معاشرہ کے معاشی تحفظ اور ان کی خوشحالی کے لیے اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

(۱) ہر انسان کو معاشی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ وہ کسی کا دستِ نگر نہ رہے۔

(۲) لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (النجم - ۳۹)

"انسان کیلئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔"

(۳) حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود متعین کر کے سعی و عمل کا دائرہ مقرر کر دیا گیا۔

سود، شراب، جوئے، رشوت، فحاشی و بدکاری کے ذرائع آمدنی، ممنوعہ اشیاء کی خرید و فروخت، ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور اسی طرح کے دوسرے کاروبار پر پابندی عائد کر کے معاشرے سے لوٹ کھسوٹ کا قلع قمع کر دیا گیا اور معاشی استحصال کی راہ روک دی گئی۔

(۴) حاصل شدہ آمدنی کو غیر شرعی مصارف میں استعمال کی ممانعت، اسراف و بے اعتدالی کی ممانعت، عیش و عشرت اور تنعم کی ممانعت اور مال کو ضائع کرنے کی ممانعت کے ذریعہ اسے غلط راستوں پر صرف ہونے سے روک دیا گیا اور اس کا رخ اصل مستحقین کی جانب موڑ کر انھیں اپنے حقوق سے محروم ہو جانے سے بچا لیا گیا۔

(۵) ہر فرد کی کمائی میں دوسرے افراد کا حصہ مقرر کر کے اسے اجتماعی نظامِ کفالت کا معاون بنا لیا گیا۔ شریعت کی رو سے اس کی متعین ذمہ داریاں حسبِ ذیل ہیں:

(الف) نفقاتِ واجبہ یعنی والدین، بیوی، بچوں، دادا، دادی، نانا، نانی، پوتے، نواسے، بھائی، بہن، پھوپھی، بھتیجی اور صلبی و رحمی قرابت کے دوسرے رشتہ داروں کی کفالت۔

(ب) زکوٰۃ جو معاشرے کے ان عام اہلِ حاجت کی کفالت پر صرف ہوگی۔ جن کی صراحت قرآن مجید میں کر دی گئی ہے۔ اس رقم سے فقراء، مساکین اور عاملین زکوٰۃ کی ضروریات پوری ہوں گی، نو مسلموں کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی ہو گی (مولفۃ القلوب) غلاموں کو یا دشمن کے پنجے میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کو آزاد کرایا جائے گا۔ نادار یا انتقال کر جانے والے قرض داروں کا قرض ادا ہوگا اللہ کی راہ میں لگے ہوئے (فی سبیل اللہ) مجاہدین طالب علموں اور دوسرے لوگوں کی کفالت ہو گی اور جن مسافروں کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ ان کی مدد کی جائے گی۔

(ج) مزید انفاقِ مال یعنی خاندان، اور قریبی رشتہ داروں کی کفالت اور ادائیگیٔ زکوٰۃ کے بعد بھی اہلِ ثروت پر ذمہ داری ہے کہ وہ ناداروں اور حاجت مندوں کی مدد کے لیے صدقہ

خیرات کرتے رہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے :

"تمہارے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔"

(مسند دارمی، ترمذی، مسلم)

حدیث کی راوی فاطمہؓ بنت قیس سے مروی ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر سورہ بقرہ کی وہ آیات تلاوت کیں جن میں کہا گیا ہے کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا دل پسند مال خرچ کرو۔"

(دیکھئے آیت - ۱۷۷)

اس سلسلہ میں قرآن کا یہ صریح حکم بھی موجود ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ ہو وہ دوسرے ضرورت مندوں کو دے دو۔ (قل العفو، البقرہ - ۲۱۹)

مزید انفاق کی مد میں تین طرح کے افراد کا حق ادا کرنا لازمی ٹھہرایا گیا ہے ایک وہ مسافر جو کھانا طلب کرے، دوسرے وہ حاجت مند جو دستِ سوال دراز کرے اور تیسرے وہ شخص جو شدید حالتِ اضطرار میں ہو، مثلاً بھوکا ہو، پیاسا ہو، ننگا ہو، شدید گرمی یا سردی یا بارش سے بچاؤ کا ضرورت مند ہو یا مرض کی حالت میں دوا کا محتاج ہو۔

معذور اور بھوکے آدمی کے لیے قرآن کا دیا ہوا یہ حق ملاحظہ کیجئے :

"کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا یا لنگڑا یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماں اور نانی کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے سپرد ہوں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔" (النور - ۶۱)

اس آیت کی رو سے اندھے، لنگڑے، مریض اور ہر ایسے معذور آدمی کے لیے، جو کمانے کی صلاحیت سے محروم ہو، ہر مسلمان کا گھر کھلا ہوا ہے وہ جہاں سے چاہیں کھانا طلب کر سکتے ہیں۔ ایک عام آدمی پر بھی قرآن نے ایک نہیں ستر دروازے کھول دیئے ہیں وہ اپنے گھر کے علاوہ ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، بھائی، بہن، چچا، تایا، پھوپھی، ماموں، خالہ یا دوست کے ہاں یا جن لوگوں نے اسے اپنے مکان کی کنجیاں دے دی ہوں۔ ان میں سے کسی کے بھی گھر بلا تکلف اسی طرح کھانا کھا سکتا ہے۔ جس طرح وہ اپنے گھر میں کھاتا ہے۔ گویا اسلامی معاشرہ میں کسی شخص کے لیے بھوکا ننگا یا سر چھپانے کی جگہ اور دوا سے محروم رہ جانے کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔

(ہ) قرض و عاریت۔ اہلِ ثروت کو اسلام نے یہ ہدایت بھی کی ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر لوگوں کو فراخدلی سے قرض دیں اور کوئی چیز ان سے عاریتاً مانگی جائے تو اسے دینے سے انکار نہ کریں۔

"کسی بندے کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کا بھائی اس سے قرض مانگنے آئے اور وہ اس کو دینے کی گنجائش رکھتا ہو پھر بھی اس سے انکار کر دے۔" (کنز العمال جلد ۳ ح ۱۵۸ / ۳۵)

"قرض دینا صدقہ ہے" (طبرانی، المعجم الصغیر، صفحہ ۸۰)

سورہ ماعون کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے جس میں برتنے کی معمولی چیزیں دینے سے انکار پر نماز تک پڑھنے والوں کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے۔

(و) وراثت، وصیت، مہر اور طلاق کی صورت میں بیوی بچوں کے لیے مقررہ مدت تک نفقہ وغیرہ۔ قانونِ وراثت کے تحت، ایک شخص کا ترکہ اس کی وفات کے بعد شریعت کے مقرر کردہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اپنی ایک تہائی ملکیت کی حدِ وصیت کے تحت اس نے جن لوگوں کو اپنا وصی مقرر کیا ہوگا انھیں بھی اس میں سے حصہ ملے گا۔

ایک شخص کے کمائے ہوئے مال میں زیرِ کفالت افراد، قریبی رشتہ داروں، معاشرہ کے عام نادار لوگوں اور وارثوں کے ان معاشی حقوق کا حساب پھیلا کر دیکھا جائے تو یہ ہزاروں افراد تک پہنچتا ہے اور یوں اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کی کمائی ایک ایسا چشمۂ فیض بن جاتی ہے۔ جس سے بے شمار لوگ سیراب ہوتے ہیں اور خود وہ بھی اسی طرح دوسروں کے جاری کردہ چشمہ ہائے فیض سے سیراب ہوتا رہتا ہے۔

جہاں اس طرح کا نظامِ معیشت موجود ہو کہ ہر فرد دوسرے درجنوں افراد کو سنبھالنے ہوئے ہو اور وہ باہم ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہوں وہاں اندازہ کیجئے کہ کتنے لوگ ایسے نکلیں گے جو فی الواقع روٹی کپڑے اور علاج و رہائش کی ضروریات پوری ہونے سے محروم رہ جائیں ؟

اسلام میں اجتماعی کفالت کی صورت یہ نہیں ہے کہ حکومت تمام املاک پر خود قابض ہو کر پوری قوم کے ایک ایک فرد کو اپنا تنخواہ دار نوکر بنا کر اور انھیں تمام آزادیوں سے محروم کر کے ان سے حسبِ منشا کام لے اور اس جبری محنت کے صلے میں انھیں غلاموں کی طرح روٹی، کپڑا، دوا اور سر چھپانے کی جگہ فراہم کر دے۔ اس کے برعکس یہاں کفالت عامہ یا اجتماعی عدل (Social Justice) کی یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر فرد حدودِ شریعت میں رہ کر زیادہ سے زیادہ کمائے، اپنی ضرورت پر کم سے کم خرچ کرے اور جو کچھ زائد از ضرورت ہو وہ معاشرے کے نسبتاً پسماندہ اور نادار لوگوں کو منتقل کر کے انھیں اوپر اٹھنے میں مدد دے۔ تاکہ اس عمل سے بتدریج معاشی ناہمواریاں ختم ہوں اور معاشرہ میں اعتدال و توازن قائم ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوعیت کی معاشی جدوجہد کو جہاد قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے :

"اللہ کے لیے صدقہ و خیرات کی کوشش، جہاد فی سبیل اللہ کی مانند ہے۔" [۵۲]

معاشی تحفظ کے سلسلہ میں ریاست کی ذمہ داریوں سے قبل انفرادی کوششوں اور

ذمہ داریوں کا یہ قدرے تفصیلی ذکر اس لیے ضروری تھا کہ اسلام میں دوسرے بنیادی حقوق کی طرح یہ حق بھی محض فرد اور ریاست کے باہمی تعلقات کے دائرہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک فرد سے لے کر خاندان، برادری، چھوٹی بڑی تنظیموں، اداروں اور حکومت تک یہ سب پر اپنے اپنے وسائل و اختیارات کے بقدر عائد ہوتا ہے۔

اب اس معاملہ میں ریاست کی ذمہ داریوں کا جائزہ لیجیے۔

ریاست کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں کسبِ حرام کے تمام دروازے بند کرے، کسبِ حلال کی راہیں کشادہ کرے اور اپنی معاشی و تعلیمی اسکیموں کے ذریعہ ہر فرد کو کسبِ حلال کے لیے ضروری تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کر کے معاشی جدوجہد کے قابل بنائے۔

اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے مقرر کردہ حقوق دلانے میں ان کی مدد کرے۔ کوئی بیٹا باپ کی کفالت سے انکار کرے تو وہ قانوناً اسے اس کفالت کا پابند بنائے، کوئی شوہر بیوی کا مہر یا نفقہ یا بچّوں کا حق دینے سے انکار کرے تو اس سے بزور یہ حق دلوایا جائے۔ غرض جس کا جو حق نکلتا ہو وہ اس کی ادائیگی کو یقینی بنائے۔

ریاست کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرے اور مستحقینِ زکوٰۃ کا حق صاحبِ نصاب لوگوں سے وصول کر کے اُن تک پہنچائے یا ان کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے۔

ریاست کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ جن کا کوئی کفیل نہ ہو ان کی کفیل وہ خود بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔" (ترمذی)

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔" (ترمذی)

اسی طرح آپؐ نے مرنے والے کے قرض کی ادائیگی اور اس کے پسماندگان کی

سرپرستی بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دی۔

"جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہوگا۔"

(بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

"جو شخص مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

(ترمذی۔ ابوداؤد)

حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن روانہ کرتے وقت آپؐ نے اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں یہ اصول بیان فرمایا:

"انھیں اطلاع دینا کہ اللہ نے ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے۔ جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے ناداروں پر تقسیم کیا جائے گا۔"

(بخاری، موطا، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی)

یہ معاشی تحفظ صرف مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص نہیں غیر مسلم رعایا بھی اس کی یکساں حقدار ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اسے گھر لے گئے، پہلے اپنے گھر سے کچھ دیا اور پھر بیت المال کے خزانچی کو بلا کر ہدایت کی کہ اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا روزینہ مقرر کرو اور فرمایا۔

"خدا کی قسم! یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے جزیہ لے کر کھائیں اور بڑھاپے میں انھیں بے سہارا چھوڑ دیں۔" ۵۳

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں شہریوں کے معاشی حقوق کے سلسلہ میں حسبِ ذیل ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمہ رکھی تھی:

(۱) خورد و نوش کا ضروری سامان (ب) سردی اور گرمی کے کپڑے (ج) نقل و حمل، حج اور جہاد کے لیے سواری ۵۴

چنانچہ آپ کے عہد میں عام شہریوں سے لے کر نومولود بچوں تک کے وظائف بیت المال سے مقرر ہوئے۔ اور انہیں معاشی احتیاجات سے مکمل طور پر نجات دلا دی گئی۔ بیت المال کا یہ استعمال حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں بھی برقرار رہا۔

آج کی اسلامی ریاست اِسی اصول کی بنیاد پر اپنے وسائل اور شہریوں کی کم سے کم ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر معاشی حقوق کا تعین کر سکتی ہے اسلام نے ریاست کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر عام شہری محاصل اجتماعی بہبود اور کفالت عامہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہوں تو وہ مزید محاصل عائد کر کے ان کے لیے وسائل مہیا کر سکتی ہے۔ ۵۵

معاشی تحفظ کے معاملہ میں اسلامی ریاست کے مزاج و کردار اور اس کے احساس ذمہ داری کو حضرت عمرؓ کی ایک تقریر اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی ایک مُراسلت کے آئینہ میں ملاحظہ کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے تقسیم مال کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کی پہاڑی پر مویشی چرانے والے کو بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس مال میں سے اس کا حصّہ پہنچ جائے گا۔ بغیر اس کے کہ اسکا چہرہ سُرخ ہو (آپ کا مطلب یہ تھا کہ بغیر اس کے کہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کوئی بھاگ دوڑ کرنی پڑے اور اس میں اُسکا چہرہ تمتما اُٹھے)" ۵۶

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور ان کے گورنر عراق عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کے درمیان بیت المال میں عام لوگوں کے معاشی حقوق سے متعلق یہ خط و کتابت ہوئی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گورنر عراق عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کو لکھا "لوگوں کو اُن کے وظائف دیدو" اس کے جواب میں عبد الحمید نے لکھا:- "میں لوگوں کے مقررہ

وظائف دے چکا ہوں اور اس پر بھی بیت المال میں مال بچا ہوا ہے۔" اس پر عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب میں لکھا: " اب ایسے لوگوں کو دیکھو جو مقروض ہوں لیکن انہوں نے یہ قرضہ کسی فضول خرچی یا بے راہ روی کے سلسلہ میں نہ لیا ہو اور ان کے قرض (بیت المال میں بچی ہوئی رقم سے) ادا کر دو۔" اس پر عبد الحمید نے انہیں لکھا: " میں نے ایسے مقروض افراد کے قرض بھی ادا کر دیئے ہیں۔ بایں ہمہ بیت المال میں رقم باقی رہتی ہے۔" اس پر عمر بن عبد العزیزؒ نے انہیں لکھا:

"اب ایسے کنواروں کو تلاش کرو جو نادار ہوں اور وہ یہ پسند کریں کہ تم ان کی شادی کرا دو۔ تو تم ان کی شادی کر کے ان کی طرف سے ان کے ذمہ واجب الادا مہر بھی ادا کر دو"۔ اس کے بعد عبد الحمید نے انہیں لکھا " مجھے جتنے بھی کنوارے ملے میں ان کی شادی بھی کرا چکا ہوں۔ بایں ہمہ بیت المال میں رقم باقی رہتی ہے۔" اس کے جواب میں عمر بن عبد العزیزؒ نے انہیں لکھا " اب ایسے لوگوں کو تلاش کرو جن پر جزیہ مقرر ہے اور وہ اپنی زمین کا انتظام نہیں کر پاتے ایسے ذمیوں کو اتنی رقم قرض دو کہ وہ اپنی زمین کا بندوبست کر سکیں۔ اس لئے کہ ان سے ہمارا واسطہ ایک دو سال کے لئے نہیں ہے" ۵ے

۱۳۔ معصیت سے اجتناب کا حق

اسلام نے اپنی حدود ریاست میں رہنے والے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ وہ کسی بھی ایسے حکم کو ماننے سے انکار کر دے جس کی تعمیل سے معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو۔ یہ انکارِ اطاعت اسلامی قانون کی نگاہ میں کوئی جرم نہیں ہے بلکہ اس طرح کے حکم کی تعمیل اعانت جرم کے مترادف ہو گی۔ کیونکہ معصیت کا حکم دینے والی اتھارٹی تو خود مقتدر اعلیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کے جرم کی مرتکب قرار پائے گی۔ اس کیخلاف عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ جو نہ صرف اطاعت سے انکار کرنے والے کو قانونی

تحفظ مہیا کرے گی۔ بلکہ معصیت کا حکم دینے والے کو مناسب سزا بھی دے گی۔
اس سلسلہ میں قرآن مجید کے احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہم "حدود اطاعت" کی تشریح کے دوران تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ ان کا خلاصہ ان دو حدیثوں میں موجود ہے۔

"خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں"۔ (کنز العمال۔ حدیث ۲۹۴)
" امراء کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ جب خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے نہ ماننا ہے۔" (بخاری)

۱۴۔ آزادی تنظیم و اجتماع

اسلامی ریاست میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیادی شرط کیساتھ شہریوں کو تنظیم سازی اور اجتماع کا حق حاصل ہوگا۔ قرآن میں مسلمانوں کے مقصد حیات کی پوری وضاحت اس ایک آیت میں کر دی گئی ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
(آل عمران ۱۱) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔
یہ پوری اُمت مسلمہ کے کرنے کا کام ہے لیکن سب مسلمان اگر اس مشن کے لیے پوری تندہی، دل سوزی اور لگن سے کام نہ کر رہے ہوں، تب بھی ان کے اندر ایک ایسا جاندار اور فرض شناس گروہ موجود رہنا چاہیئے جو اس کام کے لئے خود کو وقف کئے ہوئے ہو چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران۔ ۱۰۴)

"تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔ جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے"۔

اب اگر اسلامی ریاست میں کچھ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے خود کو ایک جماعت میں منظم کرنا چاہیں۔ اور اس مقصد کے لیے وہ تنظیمی ضروریات یا لوگوں سے رابطہ کے لیے مجتمع ہونا چاہیں تو انہیں اس کا حق ہو گا۔ اپنے جائز حقوق کے تحفظ، شکایات کے ازالہ اور مسائل کے حل کے لیے قائم کی جانے والی تنظیم اور اس کے اجتماعات پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہو گا بشرطیکہ تنظیم سازی اور اجتماع بھلائی کے فروغ اور برائی کے انسداد کے لیے ہو۔

۱۵۔ سیاسی زندگی میں شرکت کا حق

اسلام کی رو سے خلافت چونکہ کسی خاص فرد، گروہ، خاندان، نسل یا جماعت کو نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی پوری ملت اسلامیہ کو عطا کی گئی ہے اس لئے "خلیفۃ اللہ" ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان کو مملکت کے امور میں شرکت کا پورا حق حاصل ہے۔ اسی لیے اسلامی ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے قرآن نے یہ اصول طے کر دیا ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ۔ ۳۸)

"اور مسلمانوں کا کام آپس کے مشورے سے چلتا ہے۔"

خود حضورؐ کو، جو وحی کے ذریعۂ ہدایت کی موجودگی میں کسی سے مشورہ لینے کے حاجتمند نہ تھے، یہ حکم ملتا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران۔ ۱۵۹)

"(اے پیغمبر) ان سے (مسلمانوں سے) اپنے معاملات میں مشورہ لیا کرو۔"

شوریٰ کے اس مفہوم میں اسلامی ریاست کے حسب ذیل اصولِ سیاست شامل

ہیں :- (۱) ریاست کے امیر اور اس کے مشورہ دینے والے نمائندے لوگوں کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہوں۔

(۲) لوگوں کو اور ان کے نمائندوں کو تنقید، اختلاف اور اظہار رائے کی آزادی ہو۔

(۳) ملک کے حالات و مسائل اپنی حقیقی شکل میں عوام کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ وہ صحیح رائے قائم کر سکیں۔ اور صحیح مشورے دے سکیں۔

(۴) عوام کو یہ حق ہو کہ جسے وہ چاہیں وہی حکومت کرے اور جسے وہ نہ چاہیں اسے حکومت کے منصب سے ہٹا دیا جائے۔

۱۶ - آزادیٔ نقل و حرکت و سکونت

اسلامی ریاست کے ہر شہری کو اپنی پسند کے مطابق کسی بھی جگہ سکونت اختیار کرنے اور حدود ملکیت کے اندر اور عام حالات میں مملکت سے باہر دنیا کے کسی بھی حصّے میں آنے جانے کی آزادی ہوگی۔ قرآن نے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا جرام قرار دیا ہے۔ بنی اسرائیل کی بدعہدی اور ان کے جرائم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا :-

وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ (البقرہ - ۸۵)

"تم اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو۔ ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کا لین دین کرتے ہو حالانکہ انہیں ان کے گھروں سے نکالنا تم پر حرام تھا۔"

اسی طرح ترک سکونت اور نقل و حرکت کی آزادی بھی خدا نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ط (النساء۔۹۷)

"کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے ؟"

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ط (النساء۔۱۰۰)

"جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور گزر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا۔"

اسلام نے جلاوطنی کی سزا صرف مفسدوں اور باغیوں کے لیے رکھی ہے۔ عام شہریوں کو یہ سزا کسی صورت میں نہیں دی جا سکتی۔ سورۃ المائدہ میں اللہ اور رسولؐ سے لڑنے اور زمین میں فساد بپا کرنے والوں کے لیے قتل، سولی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا کے ساتھ ہی یہ سزا بھی مقرر کی گئی۔

اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط (المائدہ۔۳۳)

"یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں۔"

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں خوارج کی سرکشی اور فتنہ انگیزی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن آپ نے انہیں آزادی سے گھومنے پھرنے اور جہاں جی چاہے وہاں رہنے کا حق دیا۔ اور اپنے پیغام میں اس حق کی ضمانت دیتے ہوئے فرمایا:

"تم کو آزادی ہے، جہاں چاہے رہو البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے۔ بدامنی پیدا نہیں کرو گے۔ اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ شروع کر دوں گا۔" ؎۵۸

۱۷۔ حقِ اجرت و معاوضہ

اسلامی ریاست میں مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان سے کوئی بیگار نہ لی جائے۔ ان کی محنت کا معقول معاوضہ انہیں دیا جائے۔ ان کے مالی یا جسمانی نقصان کی تلافی کی جائے، ان پر برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن نے حق خدمت وصول کرنے والے پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اپنی طے شدہ مزدوری کے بدلے بہترین خدمت انجام دے۔ اپنی پوری توانائی تفویض شدہ کام میں صرف کرے جو سامان اس کی تحویل میں دیا جائے اسے امانت سمجھ کر استعمال کرے اور اسے خرد برد، چوری، ناجائز استعمال یا کسی اور شکل میں ضائع نہ کرے۔ ایک اچھے ملازم کے بارے میں فرمایا گیا:

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (القصص۔۲۶)

"بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔"

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو شرائطِ ملازمت بیان کرنے کے بعد ایک مالک کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے متعلق یہ یقین دہانی کی:

"میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم انشاء اللہ مجھے کھرا اور نیک آدمی پاؤ گے" (القصص ۲۷)

یعنی جو شرائط طے ہوئی ہیں ان کا پابند رہوں گا۔ ان سے زیادہ کام کا مطالبہ نہ کروں گا اور جو معاوضہ طے ہوا ہے وہ پورا پورا ادا کر دوں گا۔ اس معاملہ میں تم مجھے کھرا اور نیک آدمی پاؤ گے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے جو حقوق متعین کئے ہیں ان میں سب سے پہلا حق یہ ہے کہ انہیں نہ صرف پوری مزدوری دی جائے بلکہ اس کی ادائیگی میں غیر معمولی عجلت بھی برتی جائے آپؐ نے فرمایا:

"مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کی جائے۔"

(بیہقی، ابن ماجہ)

ایک اور حدیث میں فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن ہونگا ایک وہ جس نے میرا نام لے کر عہد کیا اور اس سے پھر گیا۔ اور دوسرا وہ جس نے آزاد کو بیچ کر اس کا مول کھایا اور تیسرے وہ جس نے مزدور سے پوری محنت لی اور پھر اس کی اُجرت ادا نہ کی۔" (بخاری)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ" رسول اللہؐ نے کبھی کسی کو اسکی مزدوری کم نہیں دی۔"

(بخاری شریف)

آپؐ نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ" مزدور کی اُجرت طے کئے بغیر اس کو کام پر نہ لایا جائے۔" (بیہقی۔ کتاب الاجارہ)

یعنی مزدور جب تک اپنی اُجرت نہ ٹھہرائے اور خوش دلی سے اسے قبول نہ کرلے اسے جبراً کام پر نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ حضورؐ نے مزدوری کے علاوہ مزدور کو منافع میں حصّہ دینے کی بھی ہدایت فرمائی ہے۔

"کام کرنے والے کو اس کے کام کے منافع میں حصّہ دو کیونکہ خدا کا عامل نامراد نہیں کیا جاتا۔" (مسند احمد)

فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں مزدور کے حصّہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ" سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی وجہ سے اور مضارب اپنی محنت (عمل) کی وجہ سے نفع کا حق دار ہوتا ہے۔" (ہدایہ۔ کتاب المضاربہ)

تعین اُجرت اور شرائط کار کے بارے میں آپؐ نے یہ قاعدہ مقرر فرمایا:

"مزدوروں کو معروف کے مطابق مناسب غذا اور لباس دیا جائے اور ان پر

کام کا اتنا ہی بار ڈالا جائے جتنا کہ وہ برداشت کر سکتے ہوں"۔ (موطا امام مالک)
یعنی مزدوری اتنی ہو کہ وہ کسی ملک اور زمانہ کے عمومی حالات کے مطابق مناسب ہو اور کمانے والا اپنی مزدوری سے غذا، لباس، مکان، علاج، تعلیم اور دوسری بنیادی ضروریات پوری کر سکے۔ گویا مالک اس کی کفالت کا مکمل ذمہ دار ہے۔
اس کے ساتھ ہی آپؐ نے مالکوں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اس کفالت تامہ کی ذمہ داری کے بدلے میں ملازموں پر کام کا حد سے زیادہ بار نہ ڈالیں۔ ماوردی اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"محتسب کو چاہیے کہ اگر ملازم مردوں اور عورتوں پر زیادتی ہو تو ان کے مالکوں سے باز پرس کرے۔ اور حکم دے کہ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیں۔ اسی طرح اگر مالک اپنے جانوروں کو پوری خوراک نہ دیں یا طاقت سے زیادہ کام لیں تو ان سے مواخذہ کرے"۔ ۵۹

حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ آپؓ ہر شنبہ کے دن مدینہ کے قرب و نواح میں جاتے اور اگر کسی شخص کو ایسے کام میں مشغول دیکھتے جو اس کی برداشت سے زیادہ ہو تو اس کا بار ہلکا کر دیتے (موطا امام مالک)
خلیفہ منصور کے دور کا یہ واقعہ پچھلے صفحات میں نظر سے گزر چکا ہے۔ کہ قاضی مدینہ محمد بن عمران نے سمن جاری کر کے منصور کو بغداد سے اپنی عدالت میں طلب کیا۔ اور اونٹ والوں کو وہ معاوضہ دلوایا جو حج کے موقع پر سامان ڈھونے کے لئے طے ہوا تھا مگر ادا نہ کیا گیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے جب ایک کاشت کار نے آکر شکایت کی کہ میں نے کھیت لگایا تھا شام کا لشکر ادھر سے گزرا اور اس نے اسے روند کر تباہ کر دیا۔ تو آپ نے اس کاشت کار کو بیت المال سے دس ہزار درہم بطور معاوضہ دیئے"۔ ۶۰

معاوضہ املاک کے سلسلہ میں یہ بات حق ملکیت کے تحت پہلے ہی زیرِ بحث آ چکی ہے کہ اسلامی ریاست میں کسی فرد کی جائز ذرائع سے حاصل شدہ املاک معروف معاوضہ ادا کئے بغیر حکومت اپنی تحویل میں نہیں لے سکتی۔ وہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر اسے مالک سے جبراً حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن اس جبری حصول کا حق استعمال کرتے ہوئے وہ مالک کو حقِ معاوضہ سے محروم نہیں کر سکتی۔

مسلمانوں کے خصوصی حقوق

اب تک ہم نے جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا ہے وہ بلا امتیاز مذہب و عقیدہ تمام شہریوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔ اب ہم ان حقوق کو لیتے ہیں جو اسلامی ریاست میں صرف مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اس امتیاز کی وجوہ پر ہم "اسلام کا تصورِ بنیادی حقوق" کے زیرِ عنوان باب میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔

اسلام نے ہمیں بنیادی حقوق کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے لیے وہ تمام حقوق بنیادی قرار دیئے جائیں گے جو قرآن و سنت کے طے کردہ ہیں۔ ان میں وراثت، ملکیت، نفقہ، مہر، نکاح، طلاق، خلع، بیع و شریٰ اور زندگی کے دوسرے معاملات سے متعلق وہ تمام حقوق شامل ہیں جو شریعت نے ہمیشہ کے لیے متعین کر دیئے ہیں۔ اور جن میں قانون سازی کے ذریعہ اب کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔

ان حقوق کے علاوہ اسلامی ریاست میں جہاں شہری حقوق (Civil Rights) کی حد تک تمام شہری مساوی الحیثیت ہوں گے وہاں سیاسی حقوق (Political Rights) کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے گا۔ غیر مسلم چونکہ قرآن و سنت پر ایمان نہ رکھنے کی بناء پر ان اصولوں سے وفاداری (Allegiance) کی

بنیادی شرط پوری نہیں کرتے جن پر ریاست کا پورا نظام حکومت قائم ہے اور نہ وہ ان اصولوں کے عملی نفاذ کے لیے مسلمانوں کی طرح مقتدر اعلیٰ کے ساتھ کسی عہد کے پابند (Committed) ہیں۔ اس لیے اسلام نے انہیں سربراہ مملکت کے عہدہ اور ایسے تمام کلیدی مناصب کی ذمہ داریوں کے لیے اہل قرار نہیں دیا جن کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل سے ہو، البتہ وہ ان پالیسیوں کے نفاذ کی ذمہ دار مشنری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ماوردی نے ذمیوں کی پوزیشن واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک ذمی وزیر تنفیذ ہو سکتا ہے۔ مگر وزیر تفویض نہیں۔ جس طرح ان دونوں عہدوں کے اختیارات میں فرق ہے اسی طرح ان کے شرائط میں بھی فرق ہے۔ یہ فرق ان چار صورتوں سے نمایاں ہوتا ہے۔ پہلے یہ کہ وزیر تفویض خود ہی احکام نافذ کر سکتا ہے اور فوجداری مقدمات کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ یہ اختیارات وزیر تنفیذ کو حاصل نہیں۔ دوسرے یہ کہ وزیر تفویض کو سرکاری عہدیدار مقرر کرنے کا حق ہے مگر وزیر تنفیذ کو یہ حق حاصل نہیں۔ تیسرے یہ کہ وزیر تفویض تمام فوجی اور جنگی انتظامات خود کر سکتا ہے۔ وزیر تنفیذ کو یہ حق حاصل نہیں۔ چوتھے یہ کہ وزیر تفویض کو خزانے پر اختیار حاصل ہے۔ وہ سرکاری مطالبہ وصول کر سکتا ہے اور جو کچھ سرکار پر واجب الادا ہے اُسے ادا کر سکتا ہے۔ یہ حق بھی وزیر تنفیذ کو حاصل نہیں ہے۔ ان چار شرطوں کے علاوہ اور کوئی بات ایسی نہیں جو ذمیوں کو اس منصب پر فائز ہونے سے روک سکے۔" [۶۲]

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن مصری بھی ماوردی سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وزارت تفویض یا وزارت عظمیٰ کے عہدے پر ذمی کا تقرر جائز نہیں کیونکہ وزارتِ عظمیٰ کے لیے "امامت" کی شرطیں لازمی ہیں"۔ [۶۳]

ابن تیمیہؒ، نظام الملک اور دوسرے مسلمان سیاسی مفکرین نے بھی بالاتفاق اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اس اصول کے تحت اسلامی ریاست میں مسلمانوں کو حسب ذیل سیاسی حقوق حاصل ہوں گے:

(۱) صدر مملکت اور وزیر اعظم لازماً مسلمان ہوں گے۔

(۲) ان کا انتخاب مسلمانوں کے ووٹوں سے ہوگا۔ اس لیے حق رائے دہی بھی مسلمانوں تک محدود ہوگا۔

(۳) قرآن مجید میں چونکہ اولی الامر کے ساتھ منکم کی شرط بھی عائد کی گئی ہے۔ اس لیے تمام کلیدی مناصب مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنی پالیسیوں کے رہنما اصول قرآن وسنت کے مطابق وضع کرسکیں اور صاحب امر ہونے کی حیثیت سے انہیں مسلمانوں کے تعاون سے نافذ کرسکیں۔ اس اصول کے تحت اسلامی ریاست کے چیف جسٹس، وزیر قانون، کمانڈر انچیف، وزیر دفاع، وزیر خزانہ (ناظم بیت المال) اور اسی اہمیت کے دوسرے عہدیدار مسلمانوں میں سے مقرر کئے جائیں گے۔

(۴)۔ قرآن نے چونکہ شوریٰ کے لیے بھی بینہم کی شرط عائد کی ہے۔ (وامرہم شوریٰ بینہم) اس لیے مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کے عام ارکان بھی مسلمانوں ہی میں سے منتخب کئے جائیں گے۔ یہ مملکت کا مرکزی اور اہم ترین پالیسی ساز ادارہ ہے اس میں ریاست کے تمام معاملات قرآن وسنت کی روشنی میں طے پائیں گے۔ اس لیے یہاں مشاورت کا حق وہی لوگ ادا کرسکتے ہیں جو قرآن وسنت پر نہ صرف ایمان رکھتے ہوں بلکہ ان کی تعلیمات پر گہری نظر بھی رکھتے ہوں۔ اور ان کے حوالے سے مسائل حل کرنے کی بصیرت وصلاحیت سے متصف ہوں۔ ان حقوق کے سوا اور کوئی حق ایسا نہیں ہے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی امتیاز روا رکھا جائے

ذمیوں کے خصوصی حقوق

ذمیوں کے حقوق کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی ریاست جس طرح مسلمانوں کے معاملہ میں قرآن و سنت کے طے کردہ حقوق کے نفاذ و احترام کی پابند ہے اسی طرح وہ ذمیوں کے معاملہ میں بھی قرآن و سنت ہی کی قائم کردہ حدود کی پابند ہے۔ گویا ذمیوں کے حقوق بھی غیر منفک (Inalienable) ہیں۔ مسلمانوں کو ان میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اسلامی حکومت شریعت کے مقرر کردہ حقوق میں کوئی کمی نہیں کر سکتی۔ البتہ وہ ذمیوں کو زائد حقوق دے سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں حقوق کے تعین اور ان کے تحفظ کے اعتبار سے مسلمانوں اور ذمیوں کی پوزیشن بالکل یکساں ہے۔ دونوں کے حقوق کی ضمانت (Guarantee) قرآن و سنت نے دی ہے۔ اپنے حقوق کے معاملہ میں جو آئینی اور عدالتی تحفظات مسلمانوں کو حاصل ہیں وہی تحفظات ذمیوں کو بھی حاصل ہیں بلکہ تحفظ کے لحاظ سے انہیں مسلمانوں پر برتری حاصل ہے۔ اسلامی ریاست وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کے پیش نظر مسلمانوں پر اضافی ٹیکس عاید کر سکتی ہے۔ ان کی املاک حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن وہ معاہد اہل ذمہ پر شرائط معاہدہ کے بعد کوئی اضافی بوجھ نہیں ڈال سکتی۔ اسلامی حکومت اگر مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت میں ناکام ہو جائے اور بیرونی حملے کی صورت میں ان کا مؤثر دفاع نہ کر سکے تو وہ مسلمانوں سے وصول کردہ ٹیکس واپس کرنے کی ذمہ دار نہ ہو گی لیکن ایسے حالات میں اسے اہل ذمہ سے وصول کی جانے والی جزیہ کی رقم واپس کرنا ہو گی۔ جیسا کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے جنگ یرموک کے موقع پر حمص اور دمشق وغیرہ کے ذمیوں کو اس خیال سے جزیہ کی رقم واپس کر دی تھی کہ مسلمان ان کی حفاظت کی ذمہ داری پوری نہ کر سکیں گے۔ اسلامی قانون ذمیوں کو ان کی حیثیت کے لحاظ سے تین اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔

(۱) معاہدین۔ یعنی وہ لوگ جو کسی جنگ کے بغیر یا دوران جنگ ذمی بن کر رہنے پر رضامند ہو

جائیں اور صلح نامہ یا معاہدہ کے ذریعہ اسلامی حکومت کے تحت آجائیں۔

(۲) مفتوحین۔ جو جنگ میں آخر وقت تک لڑتے رہے ہوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں اور جن پر اب اسلامی حکومت کا اقتدار قائم ہو چکا ہو۔ فقہی اصطلاح میں انہیں اہل العنوہ بھی کہا جاتا ہے۔

(۳) وہ ذمی جو صلح اور جنگ، دونوں کے سوا کسی اور صورت میں اسلامی ریاست کے شہری بنے ہوں مثلاً پاکستان کے غیر مسلم شہری جو تقسیم برصغیر کی بناء پر پاکستان میں شامل ہوئے۔

معاہدین کے بارے میں شریعت کا بنیادی قانون یہ ہے کہ ان سے صرف شرائط معاہدہ کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور جو شرائط طے پا گئی ہیں ان کی سختی سے پابندی کی جائے گی اور تبدیلی حکومت کے باوجود یہ شرائط تبدیل نہیں ہوں گی۔ ان کی حیثیت دائمی ہو گی الّا یہ کہ خود اہل معاہدہ اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی درخواست کریں اور وہ باہمی رضامندی سے طے پا جائیں۔ اسلامی ریاست کو یہ اختیار بہرحال نہیں ہوگا کہ وہ معاہدہ میں من مانی تبدیلی کرلے۔ اسے یک طرفہ طور پر منسوخ کر دے یا ذمیوں کو جبراً کچھ نئی شرائط قبول کرنے پر آمادہ کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا۔"

(ابوداؤد۔ کتاب الجہاد)

اسی طرح آپؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا:۔

"اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آجاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کرے (ایک اور حدیث میں ہے کہ تم سے صلح نامہ کرلے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے ناجائز ہوگا۔" (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد)

قاضی ابو یوسفؒ اس سلسلہ میں اسلامی قانون کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"ان سے وہی لیا جائے گا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے۔ ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائیں گی اور ان پر کچھ اضافہ نہ کیا جائے گا" ۶۴

مفتوحین کو اسلامی ریاست میں حسب ذیل حقوق حاصل ہوں گے :

(۱) قبول جزیہ کے ساتھ ہی اسلامی حکومت پر ہمیشہ کے لئے عقد ذمہ قائم ہو جائے گا اور ذمیوں کے جان و مال کا تحفظ مسلمانوں پر فرض ہو گا۔ ان کی املاک پر قبضہ کیا جائے گا اور نہ انہیں غلام بنایا جائے گا۔

(۲) ذمیوں کو اپنی املاک پر مالکانہ تصرفات حاصل ہوں گے۔ ان کی ملکیت ورثا کو منتقل ہو گی۔ انہیں اپنی املاک میں بیع، ہبہ، رہن وغیرہ کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی ریاست کو انہیں بیدخل کرنے کا کوئی حق نہ ہو گا۔

(۳) جزیہ کی رقم حسبِ استطاعت مقرر کی جائے گی یعنی مالداروں سے زیادہ متوسط لوگوں سے کم اور غریبوں سے بہت ہی کم۔ جن کا اپنا ذریعہ آمدنی نہیں اور دوسروں کے سہارے گزر بسر کر رہے ہیں ان پر جزیہ معاف ہو گا۔

(۴) جزیہ صرف اہلِ قتال (Combatants) پر عاید ہو گا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں، راہبوں، عبادت گاہوں کے خادموں، مستقل مریضوں اور غلاموں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

(۵) ذمیوں کی عبادت گاہوں کو علی حالہٖ قائم رہنے دیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں کسی بھی مفتوحہ علاقے کے گرجا یا صومعے کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔

قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں۔

"ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ نہ منہدم کیا گیا اور نہ ان سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا" ۶۵

حضور اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں نے بلا استثناء ذمیوں سے کئے گئے تمام معاہدات میں ان کی عبادت گاہوں کے تحفظ کی ضمانت دی اور بعد کی حکومتوں نے بھی اس اصول پر سختی سے عمل کیا۔

معاہدین اور مفتوحین کے لئے ان خصوصی حقوق کے علاوہ اسلامی ریاست میں بسنے والے تینوں قسم کے اہل ذمہ کو حسب ذیل حقوق بھی حاصل ہوں گے :

(۱) اسلام کا فوجداری قانون یوں تو ذمی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے لیکن ذمیوں کو شراب کے معاملہ میں استثناء حاصل ہے۔ امام مالک کے نزدیک انہیں زنا کے معاملہ میں بھی استثناء ہے۔ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اس فیصلے سے استدلال کرتے ہیں کہ ذمی اگر زنا کرے تو اس کا معاملہ اس کے اہل ملت پر چھوڑ دیا جائے۔

(۲) دیوانی قانون بھی مسلمان اور ذمی کے لئے یکساں ہیں۔ اموال پر حقوق اور پابندیوں کے معاملہ میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ تجارت کے جو طریقے مسلمانوں کے لئے ممنوع ہیں وہ ذمیوں کے لئے بھی ممنوع ہیں۔ سودی لین دین کی اجازت جس طرح مسلمانوں کو نہیں اسی طرح ذمیوں کو بھی نہیں البتہ شراب اور سور کا استثناء ہے۔ ذمی شراب بنانے پینے اور خود اپنے درمیان فروخت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ انہیں سور پالنے، کھانے اور اپنے درمیان فروخت کا حق بھی حاصل ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی شراب یا اس کے سور کو تلف کردے تو اس پر تاوان لازم آئیگا۔

(۳) عقد ذمہ مسلمانوں کے لئے ابدی لزوم رکھتا ہے۔ یعنی وہ اسے ایک بار باندھنے کے بعد پھر کبھی نہیں توڑ سکتے لیکن ذمیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں اسے توڑ دیں۔ ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے مسلمانوں کا عقد ذمہ ساقط نہیں ہوتا حتیٰ کہ جزیہ بند کرنے، مسلمان کو قتل کرنے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے اور مسلمان عورت کی آبروریزی کرنے پر بھی ذمہ برقرار رکھتا ہے۔ وہ ان جرائم پر قانون کے مطابق سزا تو پائے گا لیکن ذمہ سے خارج نہیں ہوگا۔ ذمہ صرف دشمن سے جاملنے اور صریح بغاوت کرکے فتنہ وفساد پھیلانے کی دو

صورتوں میں ساقط ہو گا[68]

(۴) ذمیوں کے شخصی معاملات ان کے اپنے شخصی قانون (Personal Law)
کے مطابق طے پائیں گے مثلاً ان کے ہاں اگر بغیر گواہوں کا نکاح، بلا مہر نکاح، زمانہ عدت میں نکاح ثانی یا محرمات کے ساتھ نکاح جائز ہے تو یہ سب صورتیں جائز ہی سمجھی جائیں گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک استفسار پر خواجہ حسن بصریؒ نے یہ فتویٰ دیا تھا:

"انہوں نے (ذمیوں نے) جزیہ دینا اسی لئے تو قبول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام پچھلے طریقے کی پیروی کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا"[69]

(۵) ذمیوں کو اپنے محلوں اور بستیوں میں اپنے مذہبی مراسم اور قومی شعائر کو ادا کرنے کی مکمل آزادی ہو گی۔ تاہم انہیں مسلمانوں کے محلوں میں کھلم کھلا اپنے مذہب کے شعائر ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی البتہ عبادت گاہوں کے اندر انہیں بہر حال مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ حکومت اس میں مداخلت نہیں کرے گی۔

امصار المسلمین (وہ مقامات جن کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو اور جن کو مسلمانوں نے شعائر اسلام کی ادائیگی کے لئے مخصوص کر لیا ہو۔) میں ذمیوں کے قدیم معابد سے تعرض نہیں کیا جائے گا اگر وہ ٹوٹ جائیں تو ذمیوں کو ان کی تعمیر نو کا حق ہو گا۔ جو مقامات امصار المسلمین نہیں ہیں وہاں نئے معابد بنانے کی بھی اجازت ہو گی۔

(۶) ذمیوں کو اپنے بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے، مدارس قائم کرنے اور اپنے ذمیان اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام کرنے کی پوری آزادی ہو گی وہ اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی آزاد ہوں گے البتہ انہیں اسلام پر معاندانہ حملے کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

ذمیوں کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ انہیں عہد جدید کی اسلامی ریاست میں نمائندگی کس طرح دی جائے؟ جہاں تک بلدیات (Local Bodies) کا تعلق ہے ان

میں ذمیوں کو نمائندگی کے پورے حقوق دیئے جا سکتے ہیں البتہ مرکزی اور صوبائی مجالس شوریٰ یعنی اسمبلیوں میں ان کی نمائندگی کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ اس کے لئے دو صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

(۱) جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر ذمیوں کو تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے لیکن پارلیمنٹ میں وہ قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کے پابند ہوں گے البتہ جن امور میں خود قرآن و سنت نے انہیں آزادی عمل عطا کی ہے ان سے متعلق قانون سازی میں وہ اپنی تجاویز پیش کرنے میں قطعی آزاد رہیں گے۔

(۲) ذمیوں کے لئے ایک علیحدہ نمائندہ ادارہ بنا دیا جائے جہاں وہ اپنے مسائل اپنی صوابدید کے مطابق حل کر سکیں اور حکومت ان کی سفارشات کو روبعمل لانے میں ان کی مدد کرے۔ وہ اپنے شخصی معاملات کی حد تک قانون بنانے یا مروجہ قوانین میں ترمیم و اصلاح کرنے کے مجاز ہوں اور ان کی تجاویز سربراہ حکومت کی منظوری سے قانون کی صورت میں نافذ ہو سکیں۔ وہ انتظامی امور، اور پارلیمنٹ کے فیصلوں سے متعلق اپنی تجاویز، شکایات، اعتراضات اور سفارشات آزادی کے ساتھ پیش کر سکیں اور حکومت ان پر عدل کے تقاضوں کے مطابق ہمدردانہ غور کرے اور شکایات کا ازالہ کرے۔

اس معاملہ میں کوئی لگا بندھا اصول ہمارے سامنے نہیں ہے۔ حالات کے مطابق کوئی بھی مناسب صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ اسلام کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ ایک نظام حیات کی حیثیت سے جس طرح جلوہ گر ہونا چاہتا ہے اس میں غیر مسلم رعایا کہیں رخنہ انداز نہ ہو۔ وہ کسی بھی مرحلے پر مزاحم قوت نہ بننے پائے۔ اسلام اپنے دائرۂ نفاذ میں رہنے والے غیر مسلموں کو ہر ممکن تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیتا ہے مسلمانوں سے بڑھ کر ان کے حقوق کی پاسداری کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ انہیں اپنے سایہ رحمت میں لیتا اور اپنے ثمرات و برکات میں شریک کرتا ہے لیکن اپنی راہ میں رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لئے وہ انہیں ایسے مناصب سے الگ رکھتا ہے جن کا تعلق شریعت کی تعبیر و تشریح اس کی روشنی میں پالیسیوں اور

قوانین کی تشکیل اور ان کے نفاذ کے لئے قیادت و رہنمائی سے ہو۔

کتبِ حوالہ

۱۔ کتابُ الاموال : ابو عبید۔ مترجم عبدالرحمٰن طاہر سورتی مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد ۱۹۶۹ء جلد اوّل صفحہ ۱۵۸۔

۲۔ رحمۃ اللعالمین : قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ جلد اوّل صفحہ ۱۱۸۔

۳۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس سپریم کورٹ رپورٹس متعلقہ اکتوبر ۱۹۷۲ء۔ مطبوعہ لائرز کوآپریٹو پبلشنگ کمپنی۔ نیو یارک ۱۹۷۴ء۔ صفحہ ۱۴۷۔

۴۔ محسنِ انسانیت : نعیم صدیقی۔ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۲۴

۵۔ اسلامی ریاست : امین احسن اصلاحی۔ مطبوعہ مکتبہ جماعت اسلامی لاہور۔ ۱۹۵۰ء۔ سلسلہ نمبر ۴، صفحہ ۱۳۔

۶۔ ایضاً : صفحہ ۱۲

۷۔ کتاب الخراج : قاضی ابو یوسف۔ مترجم محمد نجات اللہ صدیقی، مطبوعہ چراغ راہ کراچی۔ ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۶۷۔

۸۔ عمر بن خطاب : طنطاوی۔ مترجم عبدالصمد صارم مطبوعہ البیان لاہور ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۸۷

۹۔ ایضاً صفحہ ۲۴۲

۱۰۔ ایضاً : صفحہ ۲۲۷

۱۱۔ ایضاً : صفحہ ۲۳۶

۱۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۸۵

۱۳۔ ایضاً : صفحہ ۲۴۶

۱۴۔ ایضاً : صفحہ ۱۸۷

۱۵۔ کتاب الخراج : صفحہ نمبر ۲۷۷

۱۶ : اسلامی ریاست : امین احسن اصلاحی۔ صفحہ نمبر ۲۳

۱۷۔ سراج الملوک : طرطوشی۔ مطبوعہ مصر صفحہ نمبر ۶۹
۱۸۔ اسلام کا اقتصادی نظام : مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۹۲۔
۱۹۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۱۸۴
۲۰۔ اسلام کا اقتصادی نظام : صفحہ ۸۹
۲۱۔ کتاب الخراج : صفحہ ۵۳
۲۲۔ سیرت النبیؐ : شبلی نعمانی۔ مطبوعہ اعظم گڑھ۔ جلد اول طبع سوم۔ صفحہ ۲۹۵۔
۲۳۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۳۰۲
۲۴۔ اسلامی ریاست : امین احسن اصلاحی۔ صفحہ ۲۱
۲۵۔ کتاب الخراج : صفحہ ۱۲۹
۲۶۔ ایضاً : صفحہ ۱۳۳
۲۷۔ اسلامی ریاست : امین احسن اصلاحی۔ صفحہ ۶۲۔ بحوالہ الاستیعاب ابن عبدالبر۔
۲۸۔ الفاروق : شبلی نعمانی۔ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ۱۹۷۰ء صفحہ ۴۶۶
۲۹۔ عمر بن خطاب : صفحہ ۲۸۷
۳۰۔ ایضاً : صفحہ ۲۹۱
۳۱ : اسلامی ریاست : امین احسن اصلاحی صفحہ ۲۳
۳۲۔ اسلامی جمہوریت : سید رئیس احمد جعفری مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۶۴
۳۴۔ کتاب الخراج : صفحہ ۵۳
۳۵۔ تاریخ دعوت وعزیمت : سید ابوالحسن علی ندوی۔ مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۶۷ء۔ جلد اول صفحہ نمبر ۱۸۷

۳۶۔ ایضاً : صفحہ ۳۶۴ ۳۷۔ ایضاً : صفحہ ۳۶۶

۳۸۔ نیل الاوطار : علامہ شوکانی۔ جلد ۷۔ صفحہ ۱۴۰

۳۹۔ ایضاً : صفحہ ۱۳۶

۴۰۔ کتاب الاموال : جلد اوّل۔ صفحہ ۱۵۴

۴۱۔ اسلامی ریاست : امین احسن اصلاحی۔ صفحہ نمبر ۲۹

۴۲۔ عمرؓ فاروق اعظم : محمد حسین ہیکل۔ مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور۔ صفحہ ۳۰۲

۴۳۔ رحمۃ اللعالمینؐ : جلد اول صفحہ ۲۶۵۔

۴۴۔ اسلامی مساوات : محمد حنیظ اللہ پھلواروی۔ مطبوعہ ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی ۱۹۷۱ء صفحہ ۸۵۔

۴۵۔ اسلامی ریاست : اصلاحی۔ صفحہ ۴۲، بحوالہ کتاب الخراج

۴۶۔ عمرؓ بن خطاب : صفحہ ۲۵۴

۴۷۔ ان واقعات کی تفصیلات کے لیے دیکھئے "عمرؓ بن خطاب" مولفہ طنطاوی اور "الفاروق" مولفہ شبلی نعمانی

۴۸۔ اسلامی ریاست : اصلاحی۔ صفحہ نمبر ۴۵

۴۹۔ احکام السلطانیہ : ماوردی۔ مترجم مفتی انتظام اللہ شہابی مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل کراچی صفحہ نمبر ۲۲۵

۵۰۔ اسلامی مساوات : صفحہ ۱۰۰

۵۱ : عمرؓ بن خطاب : صفحہ نمبر ۲۰۷

۵۲۔ سیاست شرعیہ : ابن تیمیہؒ۔ مترجم مولانا محمد اسماعیل گودھروی مطبوعہ کلام کمپنی کراچی ص۱۱۱

۵۳۔ اسلام کا نظریۂ ملکیت : ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۹۶۸ء حصہ دوم صفحہ ۱۱۰ بحوالہ کتاب الخراج۔

۵۴۔ اسلام کا نظامِ حکومت : حامد الانصاری غازی مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۹۸ بحوالہ طبری۔

۵۵۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے اسلام کا نظریہ ملکیت، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ اسلام میں عدل اجتماعی، سیّد قطب شہید مترجم ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور اسلام کا نظامِ حکومت، مولانا حامد الانصاری غازی۔

۵۶۔ کتاب الخراج : صفحہ نمبر ۲۱۲

۵۷۔ کتاب الاموال : جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۴۴

۵۸۔ اسلامی ریاست : اصلاحی سلسلہ نمبر ۴۔ صفحہ نمبر ۳۴

۵۹۔ احکام السلطانیہ : صفحہ نمبر ۲۴۴۔

۶۰۔ کتاب الخراج : صفحہ نمبر ۳۷۷۔

۶۱۔ اسلامی ریاست : اصلاحی صفحہ ۵۶،۵۵

۶۲۔ احکام السلطانیہ : صفحہ نمبر ۱۰۵

۶۳۔ مسلمانوں کا نظم مملکت : ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن مترجم محمد علیم اللہ صدیقی مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ طبع اوّل ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۵۷۔

۶۴۔ اسلامی ریاست : مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۷ء۔ صفحہ نمبر ۵۷۸، بحوالہ کتاب الخراج

۶۵۔ کتاب الخراج : صفحہ نمبر ۴۱۷۔

۶۶۔ اسلامی ریاست : مولانا مودودی۔ صفحہ نمبر ۴۸۰۔ بحوالہ کتاب الخراج اور المبسوط۔

۶۷۔ ایضاً : صفحہ نمبر ۵۸۵، بحوالہ در المختار۔

۶۸۔ ایضاً : صفحہ ۵۸۶، بحوالہ در المختار، بدائع

۶۹۔ ایضاً : صفحہ نمبر ۵۸۷، بحوالہ المبسوط۔

ضمیمہ

خطبہ حجۃ الوداع

سب تعریف خدا کے لیے ہے ہم اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اس سے مدد و مغفرت چاہتے ہیں اس کے سامنے توبہ کرتے ہیں۔ اس کے دامن میں اپنے نفس کی خرابیوں اور بُرے اعمال سے پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے۔ بندگانِ خدا! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں اور اپنے خطبہ کا آغاز نیک بات سے کرتا ہوں۔ لوگو! سنو میں تمہیں وضاحت کے ساتھ بتاتا ہوں کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد کبھی تم سے اس جگہ نہ مل سکوں۔

لوگو! تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت نہیں۔ ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں اور جاہلیت کے تمام آثار و مفاخر ختم کیے جاتے ہیں۔ صرف سدانہ (کعبہ کی نگرانی و نگہبانی) اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے) کے عہدے باقی رہیں گے قتل عمد کا بدلہ قصاص ہے۔ عمد کے مشابہ وہ قتل ہے جو لاٹھی یا پتھر سے وقوع میں آتے۔ اس کی دیت ۱۰۰ اونٹ مقرر ہے جو زیادہ چاہے گا وہ اہل جاہلیت میں سے ہو گا۔ اہل قریش! ایسا نہ ہو کہ خدا

کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دنیا کا بوجھ لدا ہو جبکہ دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اہلِ قریش! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو خاک میں ملا دیا ہے اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے لیے تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تمہارے لیے حرام (محترم) ہیں یہاں تک کہ قیامت میں خدا کے سامنے پیش ہو۔ جس طرح اس دن اور اس مہینے کی حرمت تمہارے نزدیک مسلم ہے اور عنقریب تم سب خدا کے آگے جاؤ گے۔ پس وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس فرمائے گا۔ دیکھو! میرے بعد کہیں گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس ہی میں گردنیں مارنے لگو۔ دیکھو! میں نے حق پہنچا دیا ہے۔ پس اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے، تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے۔ اور تمام سودی کاروبار آج سے ممنوع قرار پاتا ہے البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے اور نہ تمہارا۔ اللہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ سود کی کوئی گنجائش نہیں اور جہاں تک عباسؓ (ابن عبدالمطلب) کے سود کا تعلق ہے تو میں اس تمام سود کو باطل کرتا ہوں اور زمانہ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں اور (اپنے خاندان میں سے) پہلا انتقام جسے میں معاف کرتا ہوں ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بچے کا ہے جسے بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔

لوگو! خدا نے میراث میں سے ہر وارث کا جداگانہ حصہ مقرر کر دیا ہے اس لیے اب وارث کے حق میں (ایک تہائی سے زائد میں) کوئی وصیت جائز نہیں۔ جان لو کہ لڑکا اس کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا اور جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا سنگ ہے۔ خبردار! جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ اپنی نسبت قائم کرے گا۔ اس پر خدا کی اس کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں

کی لعنت ہے اور قیامت کے دن اس سے کوئی بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ قرض قابلِ ادائگی ہے۔ عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیئے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیئے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے تو اسے تاوان ادا کرنا چاہیئے۔ دیکھو اب ایک مجرم اپنے جرم کا خود ہی ذمہ دار ہے اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا۔ اور نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

لوگو! شیطان اس بات سے تو مایوس ہو چکا کہ اس زمین میں اس کی پرستش کی جائے گی۔ لیکن اس بات پر بھی راضی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کے اشاروں کی تعمیل کی جائے اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرو۔ لوگو! نسئی (مہینے کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا) کفر میں (کچھ اور) اضافہ کر دیتا ہے۔ کافر اس سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں کہ ایک سال تو (اپنی نفسانی غرض سے) اسے حلال ٹھہرا لیتے ہیں۔ پھر دوسرے سال (جب کوئی ذاتی غرض نہ ہو) اس کو حرام کہہ دیتے ہیں تاکہ اللہ نے جو گنتی (حرام مہینوں کی) مقرر کر رکھی ہے اسے پورا کر لیں۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کیے ہوئے مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور اس کے حلال کیے ہوئے مہینہ کو حرام۔ اور زمانہ گھوم پھر کر اسی جگہ آ گیا ہے جہاں سے کائنات کی پیدائش کے دن شروع ہوا تھا۔ مہینوں کی گنتی خدا کے پاس (سال میں) بارہ ہے۔ ان میں سے چار محترم ہیں کہ تین (ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم) تو متواتر ہیں اور ایک الگ آتا ہے یعنی رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔

لوگو! تمہارے اوپر جس طرح تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اسی طرح ان پر تمہارے کچھ حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ سلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی کام کھل کر بے حیائی کا نہ کریں۔ پس اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں بستروں پر اکیلا چھوڑ دو اور ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو پھر اگر وہ باز آجائیں تو (حسب حیثیت) ان کا کھانا کپڑا تمہارے ذمہ ہے۔ پس عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور ان سے بہتر سلوک کرو کیونکہ وہ

تمہاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم نے ان کو خدا کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لیے حلال ہوئیں اور کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔

لوگو! میری بات سمجھ لو۔ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اس پر قائم رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔ اور تم لوگ غلو (زیادتی کرنے) سے بچو کیونکہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں غلو کے باعث ہلاک ہو گئے۔

لوگو! میری بات سنو اور سمجھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے کچھ لے سوائے اس کے جسے اس کا بھائی برضا و رغبت عطا کر دے۔ اپنے نفس پر اور دوسروں پر زیادتی نہ کرو اور ہاں تمہارے غلام! ان کا خیال رکھو جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ اگر وہ کوئی ایسی خطا کریں جسے تم معاف نہ کرنا چاہو تو اللہ کے بندو! انہیں فروخت کر دو اور انہیں سزا نہ دو۔

لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر یا نبی ہے اور نہ تمہارے بعد کوئی امت ہے۔ خوب سُن لو۔ اپنے پروردگار کی عبادت کرو، نماز پنجگانہ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، مالوں کی زکوٰۃ خوشی خوشی دیا کرو۔ خانہ خُدا کا حج ادا کرو اپنے حکام کی اطاعت کرو اور اس طرح اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔

لوگو! سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ تم پر کوئی نکٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ امیر بنا دیا جائے جو تم پر کتاب اللہ کو قائم کرے۔ لوگو! حج کے مسائل مجھ سے سیکھ لو میں نہیں جانتا شاید اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔ اچھی طرح سُن لو! تم میں سے جو حاضر ہے اسے چاہیئے کہ یہ باتیں وہ غائب کو پہنچا دے شاید ان سے وہ جسے یہ پہنچے اس کا زیادہ محافظ ہو۔ بہ نسبت ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اسے سُن لیا ہے۔ ہاں بتاؤ کیا میں نے تبلیغ کا حق ادا

کر دیا ہے۔ لوگ کہتے گئے "ہاں بیشک" پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ گواہ رہ"
اور ہاں قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائے گا۔ مجھے ذرا بتا دو کہ تم کیا جواب
دو گے "سب نے کہا" ہم اس کی شہادت دیں گے کہ آپ نے امانت پہنچا دی۔ اللہ کے احکام ہم
تک پہنچا دیئے، نیز رسالت و نبوت اور نصیحت کا حق ادا کر دیا" تب نبیؐ نے اپنی انگشت
شہادت کو تین بار آسمان کی طرف اٹھایا اور لوگوں کی طرف جھکایا۔ پھر فرمایا "اے خدا تو گواہ
رہ۔ اے خدا تو گواہ رہ۔ اے خدا تو گواہ رہ۔

کتبِ مطالعہ

اس کتاب میں کتب حوالہ کی فہرست ہر باب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ جن دوسری کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست یہ ہے :۔

۱۔ تفہیم القرآن : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔ ۱۹۷۴ء

۲۔ معالم القرآن : مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی۔ ادارہ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ ۱۹۷۴ء

۳۔ انتخابِ حدیث : مولانا عبدالغفار حسن۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔

۴۔ معارف الحدیث : مولانا محمد منظور نعمانی ؛ مکتبہ رشیدیہ ساہیوال

۵۔ راہِ عمل : مولانا جلیل احسن ندوی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔ ۱۹۷۲ء

۶۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۷۳ء

۷۔ اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۷۳ء

۸۔ اسلام میں عدلِ اجتماعی : سید قطب شہید، مترجم ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۷۱ء

۹۔ اسلام کے معاشی نظریے : ڈاکٹر محمد یوسف الدین۔ مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔ ۱۹۵۰ء

۱۰۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۶۷ء

۱۱۔ جادہ و منزل : سید قطب شہید مترجم خلیل احمد حامدی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ ۱۹۷۲ء

۱۲۔ عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی : ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔ دوسرا ایڈیشن۔

۱۳۔ مسلمانوں کا نظامِ مملکت : ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، وعلی ابراہیم حسن مصری۔ مترجم مولوی
محمد علیم اللہ صدیقی۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ ۱۹۴۷ء
۱۴۔ مسلمانوں کے سیاسی افکار : پروفیسر رشید احمد۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۱ء
۱۵۔ محسنِ انسانیت : نعیم صدیقی۔ اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۲ء

مطبوعات

اِدارہ ترجمان القرآن

- تفہیم القرآن
- سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرہ
- سورۃ النّور
- سورۃ الفرقان
- سورۃ لقمان
- سورۃ الاحزاب
- سورۃ یٰسٓ
- سورۃ الفتح
- سورۃ الحجرات
- سورۃ الرحمٰن
- تیسواں پارہ

- دینیات
- خطبات حصہ اوّل (حقیقتِ اسلام)
- خطبات حصہ دوم (حقیقتِ صوم وصلوٰۃ)
- خطبات حصہ سوم (حقیقتِ زکوٰۃ)
- خطبات حصہ چہارم (حقیقتِ حج)
- خطبات حصہ پنجم (حقیقتِ جہاد)
- الجہاد فی الاسلام
- حقوق الزوجین
- خلافت وملوکیت
- سلاجقہ
- دکن کی سیاسی تاریخ

اِدارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔لاہور